سلسلۂ مطبوعات شاہ نفیس اکیڈمی
پہلی کتابی اشاعت
ناصبیت
تحقیق کے بھیس میں
تالیف
محقق العصر محدثِ جلیل حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نور اللہ مرقدہ
بسعی و اہتمام
میاں رضوان نفیس
مکتبہ سید احمد شہید

فہرست

حرفِ رضوان

الحمد لله وحده و الصلاة و السلام على من لا نبي بعده! أما بعد:

محقق العصر حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ اپنی تحقیقات اور وقیع تحریرات کی وجہ سے اہل حق کے جانے مانے سرخیل ہیں۔ آپ نے علوم و فنون کی تکمیل کے بعد اہل اللہ سے تربیت کروائی اور پھر اپنے آپ کو علم و حدیث اور عقائد کی خدمت میں لگادیا، اپنی زندگی کا ایک بڑا دورانیہ اور اپنی علمی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ محبت صحابہ کرام واہل بیت عظام اور سراج الامت فقیہ الملۃ حضرت امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دفاع میں صرف کردیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو بہترین جزائے عطا فرمائے کہ انہوں نے امت کی طرف سے ایک جماعت کا کام کیا اور جو کچھ کیا اللہ فی اللہ کیا۔

جس وقت محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" منظر عام پہ آئی چونکہ بظاہر وہ کتاب ردّ شیعیت میں لکھی گئی تھی تو لوگوں نے اسے بہت علمی کتاب سمجھ کر اس کے مندرجات کو اپنے عقیدے کا حصہ بنالیا۔ لیکن در حقیقت وہ کتاب ابلیسی دجل و فریب کا ایک خطرناک جال تھا۔ جس میں احادیث و روایات کو قطع و برید کر کے اپنے مطلب کے معانی پہنائے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کو نشانہ بنایا گیا، جو ایک بہت بڑا ظلم اور پرلے درجے کی ناانصافی تھی مگر لوگ اس سے بالکل لاعلم رہے اور اسے اعلیٰ تحقیق کا معیار سمجھتے رہے۔

ہمارے شیخ قطب الاقطاب حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب قدس سرہ جو اپنے دور میں صحابہ کرام اور اہل بیت عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عزت و ناموس

کے تحفظ کے علم بردار تھے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک بہت بڑے خانوادے کے چشم و چراغ جو کہ میرے بہت ہی بے تکلف دوست تھے اور وہ بھی عباسی دام تزویر کا شکار ہو گئے تھے انہوں نے مجھے خود کہا:

”شاہ صاحب! میں نے عباسی صاحب کی کتاب سو(100) مرتبہ پڑھی ہے اور مجھے ہر دفعہ نیا مزہ آیا ہے۔“

اور پھر اس خاندان نے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے عباسی کی تعلیمات کو آگے پھیلانا شروع کر دیا جس سے ایک بہت بڑی گمراہی پھیلنا شروع ہو گئی، پھر ایسے وقت میں علمائے حق میدان میں آئے اور انہوں نے عباسی ودجل وفریب کا تارو پود بکھیرا۔

انہی علمائے حق میں سے ایک روشن نام حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کا ہے۔ حضرت نے ردِّ ناصبیت و یزیدیت میں بہت سی کتابیں لکھیں جن میں ایک رسالہ جس کا نام ”ناصبیت تحقیق کے بھیس میں“ ہے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انہوں نے فتنہ ناصبیت کے بانی محمود احمد عباسی کے استدلالات کا تارو پود بکھیرا ہے۔ رسالے کی اشاعت کے بعد اس میں مزید تحقیقی عنوانات لکھے گئے جس میں انہوں نے عباسی کی ان تحقیقات کا مدلل رَد کیا جسے لوگ سمجھتے تھے کہ بڑی علمی تحقیق ہے۔ نعمانی صاحب رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا کہ یہ سراسر الفاظ کا ہیر پھیر اور ابلیسی مکرو فریب ہے۔

یہ نیا حصہ حضرت کی زندگی میں تو کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکا مگر اب اسے حضرت کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب دامت برکاتہم کی خصوصی عنایت و شفقت سے ان کی نگرانی میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ پاک ان کی زندگی و عمر اور علم میں برکتیں عطا فرمائے اور اسی طرح ہمارے مخدوم مکرم مفتی شعیب صاحب زید مجدہ نہایت تشکر کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب کی کمپوزنگ کی نگرانی و پروف ریڈنگ کی اور نعمانی صاحب کے حالات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی

تحریر فرمایا۔ مفتی ضیاءالرحمٰن صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ کی اور ہم حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی دامت برکاتہم کے بہت ہی زیادہ مشکور ہیں جن کی خصوصی توجہ کتاب کی اشاعت میں حاصل رہی۔

ان شاءاللہ العزیز یہ کتاب ناصبیت سے مسموم زدہ اذہان کے لیے تریاق ثابت ہو گی، اور لوگوں کے قلوب و اذہان میں صحابہ کرام اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت و عظمت کو جلا بخشے گی۔ ارباب ذوق کو کتاب کی طباعت میں غیر معمولی انتظار کرنا پڑا جس پر تہہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ مکتبہ سید احمد شہید کے مالک اشفاق خان صاحب اور ان کے ہونہار فرزند نفیس چاند نے اس کتاب کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اور جن جن بزرگوں کی دعائیں توجہ اور مشاورت اس کتاب کی اشاعت میں شامل رہی اللہ ان سب کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

عالم نشود ویراں کہ تامیکدہ آباد است

خاکپائے شاہ نفیس الحسینی قدس سرہ
احقر میاں رضوان نفیس
جمادیٰ الثانیہ 1441ھ

حالات مؤلف

حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وسعت مطالعہ، دقت نظر، قوت استنباط اور استخراج نتائج میں اپنی مثال آپ، حدیث وعلوم حدیث اور اسماء الرجال سے خصوصی شغف مگر دیگر ضروری علوم پر بھی دسترس، صاف ستھری عربی انشاء اور نپی تلی بلیغ اردو نوکِ قلم، کچی بات اور قیاس آرائی سے دور، پختہ بات اور متین استدلال، ہر بات مدلل اور ہر حرف باحوالہ، ذکاوت و ذہانت کا حسین اجتماع، مولانا حیدر حسن ٹونکی کے علمی ذوق اور محدثانہ اپج کے حقیقی وارث، فکر و قلم کی یکسانیت، فنافی العلم کی تصویر، عمل کی زندگی میں قانع وشاکر اور صابر و محتسب۔

پیدائش اور خاندان

حضرت مولانا عبد الرشید نعمانی بروز جمعرات ۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۳۳ھ بمطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۱۵ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر جے پور (راجھستان) میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا خاندان نجابت و شرافت اور وضعداری کا حامل خاندان تھا۔ خاندان کا معاشی مشغلہ تجارت تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا کے والد میاں عبد الرحیم خاطر جے پوری رحمہ اللہ ایک منجھے ہوئے خطاط صوفی منش شاعر اور فاضل آدمیؒ تھے، ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ''کریما خوشنما'' اور بہت سی وصلیاں (لوحات) موجود ہیں۔ کراچی میوزیم میں ان کے پاکیزہ خط کے چند نمونے محفوظ بھی ہیں۔

مولانا کے چچا حافظ عبد الکریم رحمہ اللہ بھی نیک سیرت باعمل بااخلاق قرآن کے مضبوط حافظ اور اپنے بھائی کی طرح یہ بھی ماہر خطاط تھے۔ اس خاندانی نسبت کا اثر مولانا کی شخصیت پر بھی نمایاں تھا چنانچہ مولانا کا خط بھی نہ صرف پاکیزہ اور عمدہ تھا بلکہ متوسط درجے کے خطاطوں کی ٹکر کا تھا۔[1] مولانا کے ایک بھائی عبد الکریم ندوی رحمہ اللہ "حصن حصین" کے مترجم اور سب سے چھوٹے بھائی مولانا عبد الحلیم چشتی دامت برکاتہم بھی اہل علم کے درمیان ایک جانی پہچانی، محققانہ ذوق، دقیق نظر اور وسیع مطالعہ کی حامل شخصیت ہیں۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے تلمیذ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ جیسے حضرات کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس لیے مولانا نعمانی کے خاندان کی نسبت سے کہہ سکتے ہیں کہ

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

ابتدائی تعلیم:

چار سال کی عمر میں مولانا نے اپنا علمی سفر شروع کر دیا اور اپنے گھر پر ہی قرآن پاک، ابتدائی اردو اور خوشخطی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے محلے کی مسجد میں مولانا یحییٰ

1۔ بقول اربابِ دانش خط کا انسان کی شخصیت کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے۔ پچھلے زمانے میں خط کی عمدگی اور خوبصورتی کے علاوہ بچوں کی شخصیت میں نظافت، نفاست اور ترتیب و تنظیم کا وصف پیدا کرنے کے لیے بھی خطاطی سکھائی جاتی تھی، خطاطی سے انسان کا ذوق جمال ترقی کرتا ہے، نظر میں دقت بھی پیدا ہوتی ہے اور متماثل اشیاء میں امتیاز کی صلاحیت نکھرتی ہے۔ شاید اسی لیے یاقوت المستعصمی نے کہا:

الخط هندسة روحانية ظهرت بآلة جسمانية تقوى بالإِدمان و تضعف بالترك.

یعنی دکھنے میں خط اگرچہ جیومیٹری کی کچھ اشکال کا نام ہے لیکن ان اشکال کی صورت گری کا انسان کی روح اور اس کی شخصیت کے ساتھ بھی گہرا ربط ہے۔

صاحب کے پاس ابتدائی فارسی اور کچھ مسائل کی کتابیں پڑھیں۔ نو سال کی عمر میں جے پور میں ''تعلیم الاسلام'' نامی مدرسے میں داخل ہوئے جہاں درجہ متوسطہ کی کتب پڑھیں اور ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اعلیٰ تعلیم (درس نظامی) کی ابتداء کی، اور پانچ سال کے قلیل عرصے میں درس نظامی اور درجہ تکمیل میں شامل درج ذیل علوم وفنون کی کتب پڑھیں:

۱۔ علم صرف:

میزان ومنشعب سے مراح الاروح تک۔

۲۔ علم نحو:

نحو میر سے لے کر کافیہ اور مفصل زمخشری تک۔

۳۔ بلاغت ومعانی:

مختصر المعانی سے مطول تک۔

۴۔ علم ہیئت (اسٹرانومی)

تصریح

۵۔ منطق:

مرقاۃ سے لے کر بحر العلوم شرح سلم العلوم تک۔

۶۔ فلسفہ:

شمس بازغہ سے شرح اشارات طوسی تک۔

۷۔ اسرار شریعت:

حجۃ اللہ البالغہ

۸۔ تفسیر قرآن:

ترجمہ قرآن سے تفسیر بیضاوی تک۔

۹۔ حدیث شریف:

موطاامام مالک، مشکوۃ شریف، صحیح بخاری کا کچھ حصہ۔

۱۰۔فقہ:

مالابدمنہ سے ہدایہ تک۔

۱۱۔اصول فقہ:

ابتدائی کتب سے لے کر نورالانوار تک اور توضیح و تلویح کا کچھ حصہ

۱۲۔علم مناظرہ:

رشیدیہ۔

۱۳۔علم کلام

شرح عقائد نسفی سے لے کر تمہید ابو شکور سالمی تک۔

۱۴۔ادب عربی:

مقامات حریری، سبع معلقہ، دیوان متنبی، دیوان حماسہ الکامل للمبرد۔

۱۵۔تاریخ:

تاریخ الخلفاء للسیوطی، محاضرات خضری بک، مقدمہ ابن خلدون،
فتوح البلدان بلاذری۔

۱۶۔علم میراث:

سراجی، شریفیہ۔

سند فراغت اور اساتذہ کا مکمل اعتماد:

درس نظامی سے فراغت پر استاد صاحب نے جو سند عطا فرمائی اس کے الفاظ یہ ہیں:

من عباد الله الصالحين و حز به المفلحين المولى المكرم ذواهم
الراسخ و العزم الأقوم و الذهن الثاقب و الفكر الصائب و
الرأي السديد السوي المولوي أبو العلي محمد المدعو
ب((عبد الرشيد)) الجي بوري حصل الله آماله و أصلح

حاله و رزقه شرف علم اليقين و كماله فقد تجرع مشاق الأفكار مشتغلاً فيها طول الليل و النهار تعلم عدة سنين في مدرسة تعليم الإسلام و حصل أكثر الكتب المروجة في النصاب و لما حصل له ملكة راسخة في هذا الشان بفضل الله الملك المنان و آن له أن يعطي له سند مستند و إجازة تدريس العلوم و إشاعتها بفضل الله الصمد .... إلخ.

ترجمہ: مولوی عبد الرشید جے پوری (اللہ ان کی امیدیں برلائے، ان کے کام سنوارے اور انہیں علم الیقین سے نوازے)
اللہ کے نیک بندوں اور فلاح پانے والے طبقے میں شامل ہیں۔ مولوی صاحب مضبوط قوت ارادی، راسخ عزم، تیز ذہن، نپی تلی درست رائے اور صائب فکر کے حامل ہیں۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے تحصیل علم اور صیاغت فکر کی مشقتوں کو جھیلا ہے۔ مدرسہ تعلیم الاسلام میں چند سال تعلیم حاصل کی اور نصاب (درس نظامی) کی رائج اکثر کتابیں پڑھ لیں ہیں۔
علم میں ان کو مضبوط استعداد اور راسخ ملکہ حاصل ہو گیا ہے اس لیے انہیں فراغتِ تحصیل کی سند دی جاتی ہے اور علوم کی اشاعت کی اجازت دی جاتی (اور اعتماد کا اظہار کیا جاتا) ہے۔

مذکورہ بالا الفاظ جہاں استاد کی بلند نظری اور وسعت ظرفی کی دلیل ہیں وہیں شاگرد کے لیے بھی ایک مضبوط سند ہیں۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

دنیائے علم و تحقیق نے اس بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جس کا اظہار استاذ صاحب نے اس وقت کیا تھا جب ان کے شاگرد کا سن و سال ۱۷ سال سے متجاوز نہ تھا۔ فللہ در الاستاذ والتلمیذ

محدث العصر، محقق زمانہ کی خدمت میں

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بہ گو ہر شناس

مقامی مدرسے سے فراغت کے بعد مولانا نعمانی کے فطری ذوق علم نے اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے مزید تحصیل کا منصوبہ بنایا چنانچہ پہلے یہ سوچا کہ مجھے عربی زبان وادب میں مزید اختصاص اور مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ اس زمانے میں ندوۃ العلماء کی عربی ادب وانشاء کے حوالے سے شہرت تھی۔ اتفاق سے ندوہ میں ان دنوں مشہور عرب ادیب شیخ تقی الدین ہلالی آئے ہوئے تھے۔ ان سے طلبہ استفادہ کر رہے تھے۔ مولانا نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور ندوہ کے لیے رخت سفر باندھا، ندوہ میں پہلی ملاقات ہی اس شخصیت سے ہوئی جن کے لیے مولانا کو اور مولانا کے لیے ان کو پیدا کیا گیا تھا، یعنی مولانا حیدر حسن خان صاحب ٹونکی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ خاندانی صدری روایات کے مطابق اس ملاقات کا حال بھی دلچسپ ہے۔ مولانا مغرب کے وقت ندوہ پہنچے، سر پر ٹرنکٹ اٹھار کھا تھا۔ مسجد کے دروازے پر ایک بارعب اور وجیہ شخصیت نے پوچھا: ارے بھائی! کہاں سے آئے ہو؟ مولانا نے جواب دیا جے پور سے، اس شخصیت نے برجستہ کہا: تم تو عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو کیونکہ اس علاقے سے کسی طالب علم کا ندوہ میں آنا ایک ایسا واقعہ تھا جو حقیقت میں کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔ رات بھر مولانا ٹونکی سے بات چیت رہی۔ مولانا ٹونکی نے بتایا کہ جس مقصد کے لیے آپ یہاں آئے ہیں اس کا تو امکان ختم ہو چکا ہے کیونکہ ہلالی صاحب عراق روانہ ہو چکے ہیں اور وہاں سے المانیہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ساتھ ہی مولانا ٹونکی نے اپنی نظر سے بھانپ لیا کہ مولانا نعمانی کی صلاحیتوں کا اصل میدان عربی ادب نہیں بلکہ علمی و تحقیقی میدان ہے اور اس میں بالخصوص علوم حدیث سے مناسبت زیادہ ہے۔ اس لیے انہوں نے مولانا نعمانی کو اختصاص فی علوم الحدیث کا مشورہ دیا جسے مولانا نے قبول کیا۔ اس طرح مولانا کی علمی و تحقیقی صلاحیتوں میں جلاء آنے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

مولانا حیدر حسن خان رحمہ اللہ، مشہور مؤلف مولانا محمود حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ کے چھوٹے بھائی تھے، خود راسخ فی العلوم و الفنون تھے، علم حدیث مولانا کا خصوصی موضوع تھا انداز تدریس بھی انوکھا اور استعداد آور تھا، جس کی صورت یہ تھی کہ حدیث میں مولانا صرف سرد عبارت اور استاد کی زبانی تقریر پر اکتفاء نہ فرماتے بلکہ طالب علم کو اپنی تحقیقات میں انگلی پکڑ کر ساتھ چلاتے اور خود اس سے علمی گرہیں کھلواتے تھے۔ جس سے طالب علم خوب کھلتا اور اس کا ذوق پروان چڑھتا۔ مولانا کی درسگاہ خالی نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی دیواریں کتابوں سے مملوء ہوتی تھیں، اسماء الرجال، شروح الحدیث، لغات الحدیث وغیرہ کا ضروری ذخیرہ ہمراہ ہوتا تھا۔ انداز درس یہ تھا کہ ایک حدیث کی عبارت میں پہلے سند رواۃ کو لیا جاتا، ایک ایک راوی کے حالات طلبہ خود متعلقہ کتب سے نکال کر دیکھتے اور استاد صاحب اپنے مطالعے اور معلومات کو طلبہ کے سامنے رکھتے اور متعلقہ کتابوں کی نشاندہی کرتے۔ طلبہ خود کتاب اٹھاتے اور متعلقہ جگہ کو نکال کر مقارنہ و تقابل کرتے اور مناقشہ بھی ہوتا۔ اس طرح کے علمی ماحول میں مولانا نعمانی نے (۱۹۳۵ء—۱۹۳۷ء) تک پورے دو برس صرف کیے۔

اس کے علاوہ مولانا کو خصوصی اعزاز یہ بھی حاصل تھا کہ ان کا قیام مولانا حیدر حسن صاحب کے کمرے میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت استاد صاحب کی جلوتوں اور خلوتوں دونوں سے مستفید ہوتے رہے۔ مدرسے میں ضابطے کے اسباق کے ساتھ

انفرادی اوقات میں بھی مولانا سے بہت کچھ پڑھا۔ مولانا نعمانی نے مولانا حیدر حسن صاحب سے درج ذیل کتب ضبط واتقان اور بحث ومناقشے کے ساتھ پڑھیں:

۱۔ صحیح بخاری۔

۲۔ صحیح مسلم۔

۳۔ سنن ترمذی۔

۴۔ سنن ابوداؤد۔

۵۔ مسند احمد کا کچھ حصہ۔

۶۔ تفسیر جلالین۔

۷۔ علم ہیئت میں السبع الشداد۔

اس عرصے میں رسمی اسباق کے علاوہ اصل چیز جس نے مولانا کی علمی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں کردار ادا کیا وہ مطالعہ تھا جو اس دوران ہوا۔ اس مطالعے میں مولانا کی نظر ثاقب سے حدیث، شروح حدیث، اصول حدیث، تخریج حدیث، تاریخ، طبقات ورجال اور دیگر علوم وفنون کی درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابیں گذریں۔

غالباً اس زمانے کا ایک واقعہ مولانا نعمانی یوں بیان فرماتے تھے کہ ایک دفعہ کسی بات کی تحقیق مطلوب تھی جس کے لیے استاد صاحب نے "التقریر والتحبیر" (ابن امیر الحاج کا) حوالہ دیا۔ مگر یہ کتاب ندوہ میں نہ تھی، استاد صاحب نے فرمایا کہ یہ کتاب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس دہلی میں موجود ہے۔ چنانچہ میں نے وہاں کا رخت سفر باندھا، دہلی پہنچ کر نگران مکتبہ سے کتاب طلب کی انہوں نے تھما دی، میں اسے لے کر مطالعہ کے لیے بیٹھ گیا۔ اتنے میں مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ بھی تشریف لے آئے، مولانا نے کتاب کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھا کیونکہ اس وقت عمر بمشکل اٹھارہ انیس سال تھی اور داڑھی بھی پوری طرح نہیں آئی تھی، تھوڑی دیر

تعجب سے دیکھتے رہے اور پھر مفتی صاحب نے پوچھ لیا کہ برخوردار کہاں سے ہو؟ میں نے عرض کیا: مولانا حیدر حسن خان صاحب کا شاگرد ہوں، ایک حوالے کی تحقیق میں آیا ہوں۔ مفتی صاحب نے فرمایا: مولانا حیدر حسن صاحب کے شاگرد کا ہی یہ کام ہو سکتا ہے۔

مولانا محمود حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ کی خدمت میں:

طلب صادق ہو اور نیت خالص ہو تو قدرت دستگیری کرتی ہے اور اپنی راہیں خود سمجھاتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا کی علمیت میں مزید نکھار پیدا ہونے کی صورت یوں ہوئی کہ مولانا کو حیدر آباد میں "معجم المؤلفین" کے تالیفی منصوبے میں علمی کام کرنے اور مولانا محمود حسن صاحب ٹونکی کے زیر تربیت و زیر سایہ رہنے کا موقع ملا۔ "معجم المصنفین" مولانا محمود حسن ٹونکی صاحب کا موسوعاتی علمی کارنامہ ہے۔ اس کی طباعت ۶۰ جلدوں میں ہے، جس میں ابتداء اسلام سے لے کر ۱۳۵۰ھ تک کے مصنفین کے حالات کا استقصاء و استیعاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں چالیس ہزار مصنفین کے تراجم اور تذکرے جمع ہوئے ہیں۔ اس علمی و تالیفی منصوبے میں شمولیت کی بدولت مولانا کی تراجم اور مختلف علوم و فنون اور کتب سے شناسائی ہوئی جو ان کے لیے بعد میں علمی زندگی میں بہترین معاون ثابت ہوئی۔

ندوۃ المصنفین دہلی اور لغات القرآن:

۱۹۴۲ء میں جب مولانا کا سن و سال ۲۷ سے متجاوز نہ تھا ان کا تقرر ندوۃ المصنفین دہلی جیسے تحقیقی اور تصنیفی ادارے میں ہوا جہاں ان کے سپرد لغات القرآن کا کام ہوا۔ یہیں پر حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے تلمیذ عزیز، فیض الباری کے جامع و مرتب اور ترجمان السنۃ جیسی کتاب کے مؤلف مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ کی رفاقت حاصل ہوئی۔ "لغات القرآن" اگرچہ علمی کام تھا اور مولانا نے اس کا حق ادا کیا لیکن گذشتہ

طویل عرصے سے جس قسم کے علمی و تحقیقی ماحول اور کام کے عادی تھے اور تحقیق و تدقیق کا جو معیاری ذوق بن گیا تھا اس کے لحاظ سے یہ کام فروتر تھا اس لیے مولانا نے ایک جگہ اسے غیر علمی کام سے بھی موسوم کیا چنانچہ لکھتے ہیں:

> "یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھے لغت سے زیادہ الفاظ قرآن کی فہرست تیار کرنے میں دقت پیش آئی، اور چونکہ یہ بالکل غیر علمی کام تھا اس لیے اس کے انجام دینے سے بار بار طبیعت اکتا جاتی تھی مگر الحمد للہ یہ کام پورا ہو گیا۔" (مقدمہ لغات القرآن)

یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا کا بستی نظام الدین کے تبلیغی کام میں بھی آنا جانا شروع ہوا، دن بھر کی مصروفیت ندوۃ المصنفین کی ہوتی تھی اور رات کا قیام نظام الدین میں مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ہاں ہوتا تھا۔ اسی دوران مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہ (امیر ثانی تبلیغی جماعت) سے بھی دوستانہ مراسم قائم ہوئے جو آخر تک قائم رہے۔ حضرت مولانا یوسف صاحب کی خواہش تھی کہ مولانا ان کی کتاب پر مقدمہ لکھیں مگر یہ خواہش پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ اس زمانے میں مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے تبلیغی ترتیب کے مطابق دعوت کے کام پر پورا سال بھی لگایا۔[2]

2۔ حضرت حاجی عبدالوہاب صاحب رحمہ اللہ اس زمانے کے مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے متعدد واقعات سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف مولانا کے صاحبزادے مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب دامت برکاتہم کے ہمراہ رائے ونڈ مرکز میں حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے متعدد واقعات سنائے۔ حضرت حاجی صاحب کا خاص انداز یہ تھا کہ واقعہ پورے پس منظر اور جزوی تفصیلات کے ساتھ سناتے تھے جس سے سامع کے سامنے واقعے کی گویا تصویر کشی ہو جاتی تھی۔

احیاء المعارف النعمانیہ و دیگر علمی اداروں کی رکنیت:

علامہ ابو الوفاء افغانی رحمہ اللہ کا اہل علم پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے ایک ایسے ادارے کی داغ بیل ڈالی جس نے مذہب حنفی کی قدیم اور بنیادی کتابوں کی طباعت اور احیاء کا بیڑا اٹھایا۔ اس ادارے سے متعدد بنیادی کتب منظر عام پر آئیں، اس ادارے کی مساعی کو اس وقت کے اہل علم نے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ علامہ زاہد الکوثری رحمہ اللہ اور شیخ محمد بخیت جیسے حضرات نے تشجیع و ترحیب کے خطوط لکھے۔ علامہ نعمانی اس ادارے کے رکن بھی رہے۔ اس کے علاوہ دمشق میں قائم علمی اکیڈیمی کی نگران کمیٹی کے رکن بھی رہے۔

اہل اللہ کے قدموں میں:

ہیچ چیز خودبخود چیزے نہ شد
ہیچ آہن خودبخود تیغے نہ شد
مولوی ہرگز نشد مولائے روم
تا غلام شمس تبریز نہ شد

علم انسان کی سوچ کو صحیح رخ دیتا ہے لیکن یہ علم انسان کی صرف ذہنی آسودگی کا سامان ہی نہ رہے بلکہ عمل میں بھی ڈھل جائے۔ دوسرے لفظوں میں علم ایک قال ہے، یہ قال انسان کا حال بھی بن جائے اس کے لیے عقلی طریقے تو دسیوں سوچے اور تجویز کیے جا سکتے ہیں مگر اس کے لیے برسوں بلکہ صدیوں سے آزمودہ اور مجرب طریقہ یہی چلا آرہا ہے کہ علم کی تکمیل کے بعد اہل علم اپنے علم و فضل کی ساری پونجی اور بھاری بھرکم گٹھڑی لے جا کر کسی متبع شریعت اللہ والے کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنے نفس کے مخفی امراض کا اس سے علاج کرواتے ہیں وہ اللہ والا ان کے علم سے خواہشات نفسانی اور انانیت کی کھوٹ کو نکال کر ان کے معلوم کو مشہود میں

بدل کر واپس کر دیتا ہے، اور محض علماء کو راسخ فی العلم بنا دیتا ہے اس کا علم پھر محض قیل اور قال نہیں بلکہ حال ہی حال ہو جاتا ہے اور پھر وہ قال سے قال نہیں بلکہ حال سے حال کو جنم دیتا ہے۔

مولانا نعمانی کا خاندان بھی اہل اللہ سے تعلق و نسبت رکھتا تھا، والد صاحب سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ میں بیعت تھے۔ والد صاحب نے بھی مولانا کی روحانی تربیت کی اور اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ اس کے علاوہ مولانا حیدر حسن خان صاحب (خلیفہ مجاز شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ) بھی ایک صاحب حال عالم و مربی تھے جو اپنے انفرادی اوقات میں اذکار مشاغل بھی رکھتے تھے، مولانا نے ان سے اس سلسلے میں بھی استفادہ کیا تھا چنانچہ انہوں نے مولانا کو اپنے سلسلے میں اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

حضرت رائے پوری رحمہ اللہ کی خدمت میں:

جیسے علمی پیاس نے مولانا کو ایک ایک جگہ اور مقام پر اکتفاء نہ کرنے دیا، کامل رسوخ تک "ھل من مزید" کی صدا لگاتے اور اس کے تقاضے پر عمل پیرا رہے اسی طرح روحانی پیاس نے بھی آگے سے آگے بڑھائے رکھا حتیٰ کہ اس زمانے میں ہندوستان کے ایک بڑے بلکہ بہت بڑے شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمہ اللہ [3] کی خدمت میں پہنچا دیا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں اپنے استاد و مربی

3۔ حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمہ اللہ (متوفی 16 اگست 1962ء و مدفون ڈھڈیاں سرگودھا) پاکستان کے شہر سرگودھا کے رہائشی تھے مگر تحصیل علم کے لیے ہندوستان گئے اور پھر حضرت اقدس مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر نہ صرف بیعت ہوئے بلکہ انہی کے ہو رہے، عمر بھر ان کی خدمت کی اور حضرت کے جانشین ہوئے۔ حتیٰ کہ

مولانا حیدر حسن خان صاحب کے انتقال کے بعد حضرت مولانا بدر عالم میر ٹھی کی مشاورت پر حضرت رائے پوری سے بیعت ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں حضرت رائے پوری رحمہ اللہ نے اپنے سلسلے میں اجازت سے نوازا۔ اس کے علاوہ مولانا نعمانی رحمہ اللہ کو اپنے زمانے کے کبار اہل اللہ کی صحبتیں بھی حاصل رہیں جیسے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا و حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہم اللہ وغیرہ۔ (بقول مولانا نعمانی رحمہ اللہ)

اہل اللہ کی ان صحبتوں کی بدولت دل سے دنیا کی اور مال منال کی محبت ختم ہوگئی اور اپنے آپ کو دینی خدمات کے لیے اخلاص کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت لگانے کا داعیہ پیدا ہو گیا، نہ کسی یونیورسٹی وغیرہ میں جانے کا خیال آیا نہ ہی معاشی مشاغل میں اپنی صلاحیتوں کو جھونکنے کا اور نہ ہی اپنے علم کو اپنے نام و نمود اور شہرت کے لیے استعمال کرنے کے سفلی جذبے نے انگڑائی لی۔

رائے پوری نسبت نام کا حصہ بن گئی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ نے اپنے افکار پریشان سے تائب ہونے کے بعد بیعت کے لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے مشورہ کیا تو حضرت نے ایک پرچی پر اس زمانے کے دس مشائخ طریقت کے نام لکھ کر دیے، ان میں سے سب سے پہلا نام حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری رحمہ اللہ کا تھا۔ حضرت رائے پوری کے حلقہ ارادت میں اس زمانے کے بہت سے ارباب علم و فضل شامل تھے جیسے حضرت مولانا منظور نعمانی، حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی، حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، حضرت امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ وغیرہ۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ مولانا کی مخلصانہ دینی و علمی خدمات کے پیچھے بنیادی ہاتھ تصوف و تزکیہ اور مشائخ کی تربیت کا ہے۔ایک بڑی تلخ حقیقت ہے کہ اس بھٹی سے گذر کر کندن نہ بننے کی وجہ سے کتنے اہل علم اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ادھر ادھر ضائع کر دیتے ہیں۔و هم يحسبون انهم يحسنون صنعاً

تدریس:

اپنے علم کو مستحضر رکھنے یا رجال کار پیدا کرنے کے لیے عالم کے لیے تدریس کا شغل ناگزیر ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ مولانا نعمانی نے تحقیقی و تالیفی کاموں اور دیگر وقت مصروفیات میں گذارا۔ازدواجی زندگی کے مراحل بھی اسی زمانے میں شروع ہوئے، پاکستان بننے کے بعد مولانا کراچی منتقل ہو گئے اور یہاں تقریباً تین چار سال مختلف کاموں میں گذر گئے۔۱۹۴۹ء میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی سرپرستی میں مدرسہ دار العلوم ٹنڈو اللہ یار قائم ہوا، جس میں اس وقت کے اکابر اہل علم تدریس کے لیے جمع ہوئے۔ جیسے حضرت بنوری، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا عبد الرحمن کامل پوری۔ مولانا نعمانی رحمہم اللہ بھی اسی جماعت میں شامل ہوئے۔اور ٹنڈو اللہ یار میں تدریس کے ساتھ ساتھ لائبریری کے ذمہ دار بھی بن گئے۔ مولانا نے یہاں پورے دو سال تدریس کی۔ جس میں فقہ، اصول فقہ، نحو، منطق کے ساتھ ساتھ اصول حدیث بالخصوص مقدمہ ابن صلاح کی تدریس کی۔ کچھ عرصے کے بعد منجانب اللہ کچھ ایسے حالات بنے کہ یہ حضرات اکابر یہاں سے کراچی اٹھ گئے۔ حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن قائم فرمایا، مولانا نعمانی نے بھی یہاں سے علیحدہ ہونے کے بعد بنوری ٹاؤن میں خدمات سرانجام دینا شروع کیں اور یہاں ''بخاری'' کے علاوہ صحاح ستہ ''مشکوۃ

شریف"، "کتاب الآثار"، "موطا امام محمد"، "موطا امام مالک"، "شرح معانی الآثار" اور فقہ میں "الاختیار" اور "کنزالدقائق" کی تدریس فرمائی۔

ادارت مجلہ بینات:

بنوری ٹاؤن میں مولانا کا تقریباً ۹ سال قیام رہا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا نے ماہنامہ "بینات" کی ادارت کے فرائض بھی بحسن وخوبی سرانجام دیے۔ یہاں سے بہاولپور روانہ ہونے کے موقع پر مولانا بنوری رحمہ اللہ نے کے لیے تعارفی کلمات یہ لکھے:

> "مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نے ہمارے اس مدرسے میں ۹ سال تک فقہ، اصول فقہ، اور حدیث شریف کی تدریس فرمائی ہے۔ مولانا مدرسے کے اونچے درجے کے مدرسین اور محققین میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "بینات" کی ادارت کے فرائض بھی کمال حسن وخوبی سرانجام دیے ہیں۔ مولانا نعمانی تدریس وتالیف کے میدان کی نمایاں شخصیت ہیں، اور تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کے کمالات اور مہارت پر ہمیں مکمل اعتماد ہے۔"

جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں:

۱۹۶۳ء کے اواخر میں بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا جس میں سرکاری سرپرستی میں اعلیٰ پیمانے پر دینی علوم کی تدریس کا اہتمام کیا گیا۔ متعدد اہل علم، ارباب انتظام کی دعوت پر یہاں تشریف لائے، جن میں علامہ شمس الحق افغانی، مولانا ادریس کاندھلوی رحمہما اللہ بھی شامل تھے۔ مولانا نعمانی کو بھی یہاں تشریف آوری کی باضابطہ دعوت دی گئی۔ مولانا نے اپنے ندوی دوست مولانا مسعود عالم ندوی کے پرزور اصرار پر دعوت قبول کی اور یہاں منتقل ہوئے۔ یہاں عالمیہ (ایم اے) کی سطح پر حدیث واصول حدیث کی تدریس کے ساتھ ساتھ مقالہ جات کی نگرانی

آپ کے ذمے لگی۔ چند سال کی تدریس کے بعد مولانا نعمانی کو صدر شعبہ اور پھر اسلامیات کا صدر بنا دیا گیا۔۱۹۷۶ء میں ریٹائرمنٹ تک وہاں قیام رہا۔

بنوری ٹاؤن میں دوبارہ آمد:

یہاں سے فراغت کے بعد حضرت بنوری رحمہ اللہ کے اصرار پر مولانا نے دوبارہ بنوری ٹاؤن سے اپنا رشتہ جوڑا، اب مولانا کی ذمہ داریوں میں مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کی صدارت کے ساتھ تخصص فی الحدیث کے استاد اور جامعہ میں فقہ اور حدیث کے مقالہ جات کی نگرانی بھی سپرد ہوئی۔ چنانچہ مولانا کی نگرانی میں درجنوں اہم مفید مقالہ جات معرض تحریر میں آئے۔ یہ زمانہ اگرچہ بڑھاپے کا تھا مگر جب تک ہمت نے ساتھ دیا بنوری ٹاؤن کے اس تعلق کو نبھاتے رہے، تنخواہ کی قلت کی وجہ سے اپنی یا کرایہ پر گاڑی یا تانگہ رکشہ کرانا ممکن نہیں تھا اس لیے بسوں میں ہی سوار ہو کر جامعہ میں حاضر ہوتے رہے۔ جب ہمت بالکل جواب دے گئی (جس کا اندازہ اس سے ہوا کہ ایک دفعہ ازدحام میں بس میں سوار ہونے لگے تو ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے دھکم پیل میں گر پڑے) تو اپنے چھوٹے بھائی حضرت مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کو یہ خدمت سپرد کر کے خود سبکدوش ہو گئے اور اپنے آپ کو مکمل طور سے علمی و تصنیفی کاموں کے لیے یکسو کر لیا۔

بیرونی اسفار:

مولانا نعمانی کے تقسیم برصغر کے بعد ہندوستان کے تین سفر ہوئے۔ پہلا سفر ۱۴۰۳ھ کو ہوا۔ اس سفر میں مولانا نعمانی نے کمال عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پرانے دوست اور مخلص رفیق مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اس سفر میں زیادہ مشغولیت علمی کی بجائے روحانی رہی، اس سفر میں مولانا ندوی نے مولانا نعمانی کو اپنے رائے پوری سلسلے کی اجازت بھی دی اور پاکستان میں اپنے

بعض متوسلین کو مولانا نعمانی کی تربیت میں دیا اگرچہ اس سفر میں زیادہ مشغولیت روحانی رہی مگر پھر بھی بعض طلبہ کو ''مقدمہ ابن صلاح'' پڑھایا اور رائے بریلی کی مسجد میں اصلاحی خطبات بھی دیے۔

دوسرا سفر ہند ۱۴۰۹ھ میں ہوا۔ جس کا باعث یہ ہوا کہ ندوہ کے شیخ الحدیث مولانا ضیاء الرحمن صاحب رحمہ اللہ کا اچانک انتقال ہو گیا، اس خلاء کو فوری پُر کرنے کے لیے نظریں مولانا نعمانی کی طرف اٹھیں۔ مولانا علی میاں رحمہ اللہ نے حضرت نعمانی کو دعوت دی کہ وہ یہاں ندوہ میں تشریف لاکر ''بخاری شریف'' پڑھائیں اور علوم حدیث پر طلبہ اور اساتذہ کو مفید محاضرات سے مستفید فرمائیں۔ چنانچہ تین ماہ کے قریب ندوہ میں اپنے استاد مولانا حیدر حسن خان صاحب رحمہ اللہ کی طرز پر حدیث شریف کی تدریس فرمائی۔

تیسرا سفر ۱۴۱۳ھ کو رابطۃ الادب الاسلامی کی بھوپال کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ہوا۔ کانفرنس سے فراغت کے بعد ندوہ میں ہی قیام ہوا۔ طلبہ نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور مولانا سے ''نخبۃ الفکر'' (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی اصول محدثین پر مشتمل کتاب) پڑھانے کی درخواست کی۔ چنانچہ مولانا نے یہ کتاب پڑھائی اور ایک بڑی تعداد نے اس سبق سے استفادہ کیا۔

سفر حرمین شریفین:

مولانا کا حرمین شریفین کا پہلا سفر ۱۳۸۶ھ کو ہوا۔ یہ سفر حج تھا، قیام دو ماہ کے قریب رہا۔ اور آنے والے اہل علم سے استفادے اور افادے کا سلسلہ جاری رہا۔ مسجد نبوی شریف اور مدینہ منورہ کے دیگر کتب خانوں میں بہت سی نایاب و کمیاب کتب دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ اس کے بعد متعدد بار حج و عمرہ کے اسفار ہوئے اور وقتاً فوقتاً ارباب علم سے مولانا کو اجازات حدیث بھی حاصل ہوئی۔

سفر ترکی:

ترکی تقریباً چھ سو سال تک عالم اسلام کا دار الخلافہ رہا ہے۔ اس لیے وہاں فطری طور پر ارباب علم و فضل کا اجتماع ہو گیا اور علم کے خزانے بھی وہاں منتقل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں ترک ناداں مصطفیٰ کمال اتاترک نے اگرچہ خلافت عثمانیہ کی قباء چاک کر دی اور ترکی کے اسلامی تشخص کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور وہ اپنے ان اقدامات میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا مگر ترکی کی خوش قسمتی اور وہاں موجود علمی اثرات کی وسعت و کثرت کہ اس کے باوجود اب بھی ترکی ان ممالک میں سے ہے جہاں بہت بڑی تعداد میں علمی خزانے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محتاط اندازہ یہ ہے کہ ترکی کے مختلف کتب خانوں میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب عربی مخطوطات موجود ہیں جن میں سے پینسٹھ ہزار مخطوطات صرف استنبول کے کتب خانہ سلیمانیہ میں ہیں۔

ترکی کی اسی اہمیت کی وجہ سے مولانا نعمانی جو کتابوں کے عاشق تھے انہوں نے ۱۴۱۷ھ میں ترکی کے لیے رخت سفر باندھا۔ یہ سفر صرف رسمی اور عجلت بازی کا نہ تھا بلکہ مولانا نے اس سفر کے دوران استنبول میں مکمل ایک مہینہ قیام کیا اور مکتبہ سلیمانیہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ صبح و شام مکتبہ سلیمانیہ میں حاضر ہوتے اور کتابیں دیکھتے۔ اس کے علاوہ دیگر مکتبوں کو بھی دیکھا اور خوب استفادہ کیا۔ مکتبوں سے استفادے کے ساتھ ترکی کے علماء و مشائخ سے بھی ملاقیں رہیں بالخصوص علامہ کوثری کے شاگرد محمد امین سراج اور داعی کبیر شیخ محمود آفندی نقشبندی رحمہا اللہ۔ ترکی کے اس سفر سے مولانا نے کچھ نادر مخطوطات اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اسانید کے متعدد نسخے حاصل کیے۔ سفر سے واپسی پر ترکی کے اہل علم و فضل اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد مولانا کو ہوائی اڈے تک رخصت کرنے کے لیے آئی۔

وفات:

علم و عمل، تدریس و تصنیف اور دعوت و ارشاد کی شاہراہ پر طویل سفر کرنے والے یہ مسافر بالآخر ۲۹ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۲ اگست ۱۹۹۹ء بروز جمعرات بمقام جامعہ کراچی بوقت دس بجے صبح تہلیل و تسبیح کے زمزموں میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ نماز جنازہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم نے پڑھائی اور تدفین جامعہ کراچی کے احاطے میں موجود قبرستان میں ہوئی۔

تصنیفات و تالیفات:

مولانا نعمانی فنافی العلم انسان تھے اور شروع سے لکھنے پڑھنے کے نہ صرف عادی بلکہ اس کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے تھے۔ اپنی اس علمی یکسوئی اور فطری استعداد اور سلیقہ تالیف کی خداداد صلاحیت[4] کی بدولت اوائل عمر سے ہی مضبوط نقوش منظر عام پر لائے۔ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا، ہر بات دلائل سے مزین اور ٹھوس حقائق پر مبنی کرنے کے عادی تھے، اٹکل پچو سے ورق سیاہ کرنے سے بہت دور تھے، ہر بات بلکہ ہر لفظ باحوالہ لکھنے کے روادار تھے۔ اس بات کا اندازہ مولانا کی تالیفات دیکھنے سے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تالیفات اہل علم کے لیے اپنے اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ امام حاکم کی کتاب ''المدخل'' پر علمی تبصرہ مولانا کی تصنیفی زندگی کا پہلا نقش تھا۔ یہ تبصرہ ''البرہان'' کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ مگر یہ تبصرہ اپنی علمی پختگی اور ثقاہت میں اس درجے پر فائز ہوئے کہ اس زمانے کے

4۔ مولانا کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تسوید ہی تبییض ہوتی تھی۔ تحریر لکھنے کے بعد اسے بار بار کاٹنے یا تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ پہلی دفعہ لکھا اور خوب لکھا۔ یہ وصف بہت کم اہل قلم کو نصیب ہوتا ہے ذلك فضل من الله يؤتيه من يشاء.

اکابر اہل علم نے اس کو خوب سراہا۔ حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ مدیر ''الفرقان'' ومصنف ''معارف الحدیث'' نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

''مولانا عبدالرشید نعمانی (اللہ ان کے علم وافادات میں برکت دے) علمی میدان کے شہ شواروں میں سے ہیں ان کی اس جیسی نادر اور مضبوط تحقیقات کو دیکھ کر یہ حوصلہ بندھتا ہے کہ ہمارے اکابر حضرات کے رخصت ہونے کے بعد بھی اللہ رب العزت اپنی مشیت سے مولانا جیسی ہستیوں کی صورت میں ہمارے درمیان علم کو باقی رکھے ہوئے ہیں، اللہ رب العزت علم و تحقیق کے میدان میں مولانا نعمانی کی خدمات کو قبول فرمائیں۔'' (آمین)

تقریباً اسّی سال بعد مولانا نعمانی کے ایک شاگرد مولانا محمد طارق اٹکی نے ان افادات کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، جس پر حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ (شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے:

''امام حاکم کی کتاب ''المدخل'' پر حضرت مولانا علامہ عبدالرشید نعمانی کی تعلیقات اور حواشی کے مطالعے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے یہ تعلیقات بہت عمدہ اور نفیس معلوم ہوئیں، جن میں بیش بہا علمی ابحاث، حدیثی فوائد اور صحیح توجیہات شامل ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مولانا نعمانی ایک عبقری (انتہائی زیرک) وسیع المطالعہ اور مشکل علمی ابحاث کی گہرائی تک پہنچنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔''

''لغات القرآن'':

یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو پاک و ہند میں بارہا طبع ہو چکی ہے اور اپنی اہمیت و ضرورت کی وجہ سے طبع ہوتی رہتی ہے۔ اس میں مولانا نے قرآن پاک کے مفرد الفاظ (خواہ اسم ہوں یا فعل یا مصدر) لے کر اس کی لغوی و صرفی تحقیق کے ساتھ ساتھ ان کا تفسیری مفہوم بھی واضح کیا ہے۔

"ما تمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجة"(عربی):

علمی حلقوں میں مولانا کے ابتدائی تعارف کا باعث "المدخل" پر حواشی و تعلیقات بنے لیکن مولانا کی خاص پہچان اور شاید رہتی دنیا تک تعارف کا ذریعہ یہ کتاب بن گئی ہے۔ اس کتاب کا عنوان اگرچہ خاص اور محدود ہے لیکن دراصل یہ علم حدیث کی ایک وسیع تاریخ ہے جس کے مندرجات محققانہ معیار کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں حضرت رسالت مآب ﷺ کے زمانے سے لے کر امام ابن ماجہ رحمہ اللہ کے زمانے تک حدیث شریف کی کتابت، تدوین و حجیت حدیث، مختلف محدثین کے معیارات انتخاب حدیث جیسی دلچسپ اور مفید علمی ابحاث شاملِ کتاب ہیں۔ یہ کتاب اپنے علمی معیار اور تحقیقی مواد کی وجہ سے اہل علم کے ہاں خوب سراہی گئی۔ مشہور محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ جیسے علوم حدیث کے وسیع المطالعہ محققین نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

الإمام ابن ماجة و كتابه السنن:

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے اس نام سے شائع کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شیخ عبد الفتاح جیسے وسیع المطالعہ محقق نے لکھا کہ مصنف نے کتاب کے مواد کو ایسی جامعیت اور وضاحت و ترتیب سے پیش کیا ہے کہ مجھے اس پر کسی استدراک نوٹ یا توضیحی حاشیے یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سوائے چند ایک جگہ کے جہاں خفیف سی تعلیقات درج کی گئی۔ اہل علم اور ارباب تحقیق شیخ عبد الفتاح کے اس جملے کی قدر و معنویت سے واقف ہیں۔ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کا یہ جملہ مولانا نعمانی کے اس میدان میں بلند علمی مقام پر بہت بڑی شہادت ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نعمانی نے ایسی جلیل القدر تالیف صرف بیس پچیس دن میں تالیف فرمائی تھی۔اس سے بھی وسعتِ علمی، قوت حافظہ اور استحضار معلومات اور قوت استنباط کا پتہ چلتا ہے۔

مكانة الإمام أبي حنيفة في الحديث:

اس کتاب میں مولانا نعمانی نے اس سطحی اور عامیانہ اعتراض کا عالمانہ جواب دیا ہے جو گذشتہ کچھ عرصے میں ایک محدود سے طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبانوں پر بھی آنے لگا تھا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس حدیث کا زیادہ علم نہ تھا۔ کسی نے یہ ہوائی چھوڑی کہ امام صاحب کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں۔ کسی نے کچھ، کسی کچھ۔اس کتاب کی علمی اہمیت کے پیش نظر شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے اسے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

"کتاب الآثار" کی ترتیب جدید:

اس میں مولانا نعمانی نے امام صاحب کی "کتاب الآثار" کو مسند کی ترتیب دی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے اساتذہ حدیث:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں امام صاحب کے اساتذہ و مشائخ حدیث کا تذکرہ ہے۔

امام ابو حنیفہ کے امام ابراہیم نخعی سے فقہی اختلافات:

اس رسالے میں مولانا نعمانی نے یہ واضح کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ حضرت ابراہیم نخعی کے مقلد محض نہ تھے بلکہ مستقل مجتہد تھے اور انہوں نے بہت سے مسائل میں امام نخعی سے اختلاف بھی کیا ہے۔

امام ابن ماجہ اور علم حدیث:

اس کتاب کے بہت سے مباحث تو وہی ہیں جو "ماتمس الیہ الحاجۃ" کے ہیں لیکن بہت سے مباحث اس سے مختلف بھی ہیں، اس لحاظ سے اسے اس کا ترجمہ نہیں کہنا چاہیے بلکہ ایک مستقل تالیف قرار دیا جانا چاہیے۔

اصول حدیث کے بعض اہم مباحث:

یہ مولانا نعمانی کے بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رسائل اور مضامین ہیں جو مولانا کے فاضل صاحبزادے حضرت مولانا عبد الشہید نعمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے جمع فرمائے ہیں اور اس نام سے طبع کیے ہیں۔ مضامین میں سے امام حاکم کے حالات، مدخل کا تنقید جائزہ، حدیث صحیح کی تعریف پر مفصل بحث، ہندوستان میں علم حدیث کا ارتقاء، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے قائم کردہ طبقات کتب الحدیث پر تبصرہ، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے خاندان کی خدمات حدیث، ولی اللہی خانوادے کی خدمات حدیث، صحیح مسلم و صحیح بخاری کی اصحیت کا تقابلی جائزہ وغیرہ نمایاں ہیں۔

تعلیقات دراسات اللبیب:

دراسات اللبیب سندھی عالم مولانا معین ٹھٹھوی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ جس کا موضوع عمل بالحدیث ہے اس ضمن میں اس میں اجتہاد، تقلید کے علاوہ اصول حدیث، حدیث، فقہ اور عقیدے کے بھی بہت سے مسائل آ گئے ہیں۔ مولانا نعمانی نے اس پر انتہائی عالمانہ اور محققانہ حواشی لکھے ہیں۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے "دراسات اللبیب" حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے ذوق فقہ الحدیث کو حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے مذاق و مشرب پر ترجیح دینے کے لیے لکھی گئی تھی۔ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے بھی "دراسات" کی تحسین کی ہے۔ "دراسات اللبیب" کا موضوع چونکہ بہت نازک اور حساس ہے یعنی ظاہر حدیث کو مذہب فقہی پر ترجیح دی جائے۔ اس لیے یہ کتاب اہل علم کے ہاں رد و قبول کی صورت میں مشہور و معروف ہے۔

ذب ذبابات الدراسات:

خود سندھ کے عالم شیخ عبد اللطیف سندھی رحمہ اللہ نے دراسات کے مندرجات کا ''ذب ذبابات الدراسات عن المذاہب الاربعۃ المتناسبات'' کے نام سے ایک تفصیلی تنقیدی جائزہ لکھا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر بھی مولانا نعمانی کی مفید تحقیقات و تعلیقات مطبوع ہیں۔

مقدمہ و تعلیقات کتاب التعلیم:

ساتویں صدی ہجری کے سندھ کے ایک عالم امام ابو مسعود ابن شیبہ رحمہ اللہ نے ایک کتاب ''کتاب التعلیم'' کے نام سے تالیف فرمائی۔ جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے تعارف اور امام صاحب کے فقہی مذہب کے اصول و فروع پر مشتمل تھی۔ امام صاحب کے تعارف میں مصنف کے پیش نظر کچھ حضرات کی جانب سے امام اعظم رحمہ اللہ کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا عالمانہ نقد ورد تھا۔

کتاب چونکہ اہم تھی اس لیے مولانا نعمانی نے اس کا مقدمہ اور تعلیقات لکھیں۔ تعلیقات اہل علم کی نظر میں نہایت وقعت کی حامل ہیں۔ مشہور محقق عالم حضرت علامہ ابو الوفاء افغانی رحمہ اللہ نے بھی ان کی تحسین فرمائی ہے۔

اصل کتاب بمشکل بیس پچیس صفحات کی تھی مگر مولانا نعمانی کی بے نفسی ہے کہ بجائے اپنی الگ سے کتاب لکھنے اور اپنی تصنیفات کی تعداد میں اضافہ کرنے کے اپنا پورا زور اس کی خدمت میں لگا دیا اور اصل کتاب سے تقریباً اٹھارہ گنا زیادہ تعلیقات اور مقدمہ لکھا۔ ''کتاب التعلیم'' کی یہ تعلیقات ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

تحقیق الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار:

''کتاب الآثار'' امام محمد رحمہ اللہ کے واسطے سے امام صاحب کی منقول روایات کا مجموعہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کے رواۃ کے احوال ''الایثار'' کے

نام سے جمع فرمائے تھے۔ مولانا نعمانی نے حیدرآباد دکن سے ملنے والے اس کے ایک مخطوطے انتہائی عرق ریزی سے اس کی تحقیق و تعلیق کی اور اس پر عالمانہ مقدمہ لکھا۔

فتح الاعزالاکرم بتخریج الحزب الاعظم:

ملا علی قاری رحمہ اللہ کا قرآن و حدیث کی دعاؤں پر مشتمل ""الحزب الاعظم"" مجموعہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مصنف نے احادیث کی تخریج یعنی حوالہ جات ذکر نہیں فرمائے تھے۔ مولانا نعمانی نے بعض حضرات کی استدعاء پر، یہ خدمت سرانجام دی۔ اور سوائے چار پانچ روایات کے باقی تمام روایات کی تخریج کی۔

دیگر متفرق مضامین:

ان وقیع اور ضخیم تحریرات و تعلیقات کے علاوہ مولانا نعمانی کے قلم سے مختلف نکلے، کتابوں کے مقدموں، تعارفی مضامین اور تحریروں پر نقد و تبصرہ پر مشتمل مضامین کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ جو مختلف کتب اور رسالوں کی زینت ہے۔

فتنہ ناصبیت کی سرکوبی:

ماضی قریب میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ بکھرا تو یوں تو بہت سے فتنوں نے جنم لیا مگر دو فتنے ان میں سے نمایاں تھے جنہوں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کیا۔ ایک فتنہ طعن اسلاف کا تھا جس نے خاص طور سے سراج الائمہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کی فقہی ترجیحات سے بڑھ کر ان کی ذات اور علمی حیثیت کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اور یہ تاثر دیا کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث سے مس نہ تھا اس لیے ان کا مذہب حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا۔

مولانا نعمانی نے اپنی علمی تحقیقات اور تصنیفی کاوشوں کا ایک بہت بڑا حصہ اس فتنے اور گمراہ کن پراپیگنڈے کی تردید کے لیے وقف کیا۔

دوسرا فتنہ ناصبیت کا تھا جو ردّ رافضیت کے زور میں حدود سے تجاوز کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ روافض نے اگر حب اہل بیت رضی اللہ عنہم کو عنوان بنا کر حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مورد طعن ٹھہرایا تو اس فتنے کے علمبرداروں نے جواب ترکی بہ ترکی دیتے ہوئے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم کی تنقیص شروع کر دی۔

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کا تجزیہ یہ ہے اور بالکل بجا تجزیہ ہے کہ رافضیت اور ناصبیت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اور دونوں ایک ہی ایجنڈے (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کی شخصیات مجروح کرنے کے مشن) کی تکمیل کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے جس کی بات معتبر مانی جائے نتیجہ حضور ﷺ کے صحابہ کی عظمت پر کیچڑ ہے۔

روافض کا فتنہ تو ناسور کی طرح امت کے ساتھ ساتھ چلتا آرہا ہے اس لیے اہل علم ہر زمانے کے حالات و تقاضوں اور اسلوب کے مطابق اس کی سرکوبی کا فریضہ سرانجام دیتے چلے آئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ردّ رافضیت پر وسیع لٹریچر منظر عام پر موجود اور دستیاب ہے۔ البتہ ناصبیت کا فتنہ ایسا نہیں جو ہر زمانے میں طاقت و توانا صورت میں

چلتا آرہا ہو۔ بلکہ یہ فتنہ گاہے گاہے امت میں سر اٹھاتا آیا ہے لیکن اہل علم ہر زمانے میں اس کی سرکوبی کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں جہاں بھی ناصبیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے اہل علم فوراً احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے متحرک ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں عبد المغیث حنبلی نے یزید کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا تو" شهد شاهد من أهلها" کی صورت میں خود حنابلہ کے سرخیل زمانہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کی خوب خبر لی۔ اور "الرد علی المتعصب العنید المانع من ذم یزید" کے نام سے گراں قدر رسالہ سپرد قلم کیا۔ جس میں اصل زیر بحث مسئلے (مذمت یزید) کے ساتھ عبد المغیث کی علمی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی۔[5]

ناصبیت تحقیق کے بھیس میں:

ماضی قریب میں ہندوستان کے شہر امروہہ کے ایک باسی محمود احمد عباسی نے "خلافت معاویہ ویزید" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جس کا روئے سخن اگرچہ روافض کی جانب تھا مگر اسے ناداں دوستی کہیے یا دانستہ دشمنی کہ اس کتاب میں ناصبیت کا مقدمہ بڑے مرتب انداز میں پیش ہو گیا چنانچہ رافضیت کے تبراؤں سے ستائے لوگوں نے کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کتاب میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ مصنف نے بے لاگ تحقیق کی ہے اور بالکل غیر جانبدارانہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ کتاب کا اندازِ تحقیق یورپ کے محققین کی چھاپ لیے ہوئے تھا۔ جو بظاہر بڑا سائنٹفک ہوتا ہے مگر اندر سے قیاسات و ناقص

5۔ یہ رسالہ احقر کے ترجمے اور حضرت الاستاذ محقق العصر حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبد الواحد صاحب رحمہ اللہ کے گراں قدر مقدمے کے ساتھ شاہ نفیس اکیڈمی لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔ پہلا نسخہ ختم ہونے کے بعد طبع دوم کا انتظار ہے۔

استقراءات اور بودے دلائل ومزعومات پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے بعض بڑے انوکھے دعوے کیے مثلاً:

۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت خلافت صحیحہ نہیں تھی۔

۲۔ واقعہ کربلا کے بارے میں جیسے دعویٰ کیا جاتا ہے ویسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ محض افسانہ عجم ہے۔

اول الذکر دعوے کو تو چند عبارات میں قطع و برید کر کے ثابت کیا مگر دوسرے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے عباسی صاحب نے بہت عرق ریزی سے کام لیا۔ چنانچہ واقعہ کربلا کی تردید کے لیے انہوں نے تقویم/کیلنڈر، اور جغرافیہ کی معلومات سے سہارا لیا اور استشراقی طریقہ تحقیق (Research method) سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اگر واقعہ کربلا ہوتا تو بنو ہاشم و بنو امیہ کے تعلقات کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی جبکہ اس واقعے کے بعد طرفین میں رشتہ داریاں ثابت ہیں وغیر ذلک۔

اس قسم کا دعویٰ اور اس طریقے سے اثبات چونکہ اچھوتا تھا اور اس پر زور انشاء مستزاد اس لیے بہت سے آزاد خیال ادیب، صحافی، دانشور اور کچھ نیم پختہ اہل علم بھی اس کتاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے اس کتاب کو بہت بڑا انکشاف اور تحقیق کا شاہکار قرار دیا۔ پھر یہ کتاب خواص کے ہاتھوں سے نکل کر عوام میں بھی آنے لگی اور نتیجتاً ناصبی افکار کے لیے اچھی خاصی زمین ہموار ہو گئی۔ جس کے آج تک برگ و بار سامنے آ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اسی کتاب کو اپنے ناصبی افکار کی تبلیغ اور پرچار کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر محمود احمد عباسی کو ہندوستان میں فتنہ ناصبیت میں نئی روح پھونکنے والا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

عباسی کی مذکورہ کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن بقول مولانا نعمانی نقد و گرفت کرنے والوں نے ثانوی اور ضمنی باتوں کو چھیڑا ہے اصل محل استدلال اور وہ نکات جو ایک عام قاری کو متاثر کرنے والے تھے ان کو باضابطہ

موضوع بنا کر کسی نے جواب نہیں دیا۔ زیر نظر کتاب ''ناصبیت تحقیق کے بھیس میں'' کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں عباسی کی اٹھائی ہوئی اصل بنیادوں اور بزعم خویش مضبوط استدلالات کے تار و پود پوری دیانتداری اور عالمانہ تحقیق سے بکھیرے گئے ہیں۔

عباسی کی تحریر سے متاثر ہونے والے انصاف پسند قاری کے لیے اس کتاب میں ہدایت کا پورا سامان موجود ہے۔ ابتدائی طور سے اس کتاب کے مندرجات ماہنامہ ''بینات'' کے صفحات کی زینت بنے اور اہل فکر و نظر سے داد تحقیق پائی۔ اب احباب کے تقاضے پر اور اس خیال سے کہ ابھی اس فتنے کی جڑیں معاشرے میں باقی ہیں اور گاہے گاہے پنپتی رہتی ہیں، اس کتاب کے مندرجات شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ مولانا نعمانی کے صاحبزادے مولانا عبدالشہید نعمانی دامت برکاتہم نے نہ صرف اس کتاب کے مندرجات کی مرتب صورت گری کی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نعمانی کے اس موضوع پر بکھرے مضامین اور رسالوں کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ خیرا واحسن الجزاء

نوٹ: حالاتِ مؤلف کا تقریباً سارا مواد حضرت مولانا عبدالشہید نعمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی عربی سوانحی کتاب سے ماخوص ہے۔ اس لیے اس تحریر کو اس کا ترجمہ یا اردو ورژن کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

فقط

شعیب احمد

- دارالافتاء، جامعہ دارالتقویٰ لاہور
- خطیب جامع مسجد چوبرجی کوارٹرز لاہور

۲۹ محرم الحرام ۱۴۴۱ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ
اَمَّا بَعْدُ!

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" میں فرماتے ہیں:

وقد صنف الطحاوي كتابًا في عقائد أبي حنيفة وصاحبيه، و البيهقي كتابًا في عقيدة الشافعي.[٦]

امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے عقائد پر کتاب لکھی ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے عقیدہ پر۔

الحمدللہ یہ دونوں کتابیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں، یہ دونوں امام حنفی اور شافعی مذہب کے بڑے معتمد علیہ اور ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ "عقائد طحاویہ" بر صغیر ہندو پاک اور سعودی مملکت میں زیر درس ہے۔ امام طحاوی نے اپنی کتاب کی ابتدا ان الفاظ میں کی ہے:

هذا ذكر بيان عقيدة أهل السنة والجماعة على مذهب فقهاء الملّة أبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي وأبي يوسف يعقوب بن إبراهيم الأنصاري وأبي عبدالله محمد بن الحسن الشيباني رضوان الله عليهم أجمعين، وما يعتقدون من أصول الدين، ويدينون به لرب العالمين.

یہ اہل سنت و جماعت کے اس عقیدہ کا بیان ہے جو فقہاء ملت امام ابو حنیفہ نعمانؒ بن ثابت کوفی، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری اور امام ابو عبداللہ محمد بن حسن

6۔ ازالۃ الخفاء، ج۱، ص ۳۲۲، طبع بریلی ۱۲۸۶ھ

شیبانی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مذہب ہے اور اصولِ دین کے بارے میں جو عقیدہ رکھتے تھے اور اللہ رب العالمین کے جس دین سے وابستہ تھے، اس کا ذکر ہے۔

اس کتاب میں وہ فرماتے ہیں:

ونثبت الخلافة بعد رسول الله ﷺ أولًا لأبي بكر الصديق رضي الله عنه تفضيلًا له وتقديمًا على جميع الأمة، ثم لعمر بن الخطاب رضي الله عنه، ثم لعثمان رضي الله عنه، ثم لعلي بن أبي طالب رضي الله عنه وهم الخلفآء الراشدون والأئمة المهتدون.

رسول اللہ ﷺ کے بعد ہم سب سے پہلے آپ کی خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت کرتے ہیں کیونکہ وہ تمام امت میں افضل اور سب سے مقدم ہیں پھر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانتے ہیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور یہی حضرات خلفاء راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ ہیں۔

غرض اہل سنت وجماعت کے نزدیک یہ وہ حضرات ہیں جن کی امامت وخلافت کتاب وسنت کے بے شمار نصوص سے ثابت ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دونوں کتابیں (۱) "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" (۲) "قرّة العينين فى تفضيل الشيخين" اسی عقیدہ کے اثبات کے لئے تصنیف کی گئی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر بے نظیر ہیں۔ فارسی تو فارسی حقیقت یہ ہے کہ عربی لٹریچر میں بھی ان کتابوں کی نظیر نہیں ملتی، جو شخص بھی اس موضوع پر اطمینان خاطر چاہتا ہے اس کے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

اور امام ابو بکر احمد بن علی جصّاص رازی رحمہ اللہ المتوفی ۳۷۰ھ جو ائمہ احناف میں بڑے نامی گرامی، جلیل القدر امام گزرے ہیں، اپنی مشہور عام بے بہا تصنیف "احکام القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا.

حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا۔

اور پھر ان کا تعارف ان لفظوں میں فرمایا کہ

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ.

جن کو ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا۔

اور اس کے بعد ان حضرات کے اس وصف کو خصوصی طور پر نمایاں کیا کہ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوْا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكر.

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز کو قائم رکھیں اور زکوۃ ادا کریں اور بھلے کام کا حکم کریں اور برائی سے منع کریں۔

ان تینوں فقروں کو ذکر کر کے امامِ ممدوح رحمہ اللہ ان کے ذیل میں یہ افادہ فرماتے ہیں:

وهذه صفة المهاجرين لأنهم الذين أخرجوا من ديارهم بغير حقّ فأخبر تعالى أنهم إن مَكَّنّٰهُمْ في الأرض أقاموا الصلاة وآتوا الزكاة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر وهو صفة الخلفاء الراشدين الذين مَكَّنَهُمُ الله في الأرض وهم أبو بكر وعمر وعثمان وعلي رضى الله عنهم. وفيه الدلالة الواضحة على صحة إمامتهم لإخبار الله تعالٰى بأنهم إذا مُكِّنوا في الأرض قاموا بفروض الله عليهم، وقد مُكِّنوا في الأرض فوجب أن يكونوا أئمة القائمين بأوامر الله منتهين عن زواجره ونواهيه ولايدخل معاوية في هٰؤلآء لأنّ الله إنما

وصف بذلک المهاجرین الذین أُخرجوا من دیارهم ولیس معاویة من المهاجرین بل هو من الطلقاء.[7]

اور یہ مہاجرین کی صفت ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جن کو ناحق اپنی بستیوں سے نکالا گیا اب حق تعالیٰ نے ان حضرات کے بارے میں بتایا کہ ''یہ تو ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز برپا کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں''۔ یہی خلفائے راشدین کی صفت رہی جن کو اللہ تعالیٰ نے ملک میں اقتدار عطا فرمایا۔ یہ خلفائے راشدین حضرات ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور اس آیت میں ان حضرات کی خلافت و امامت کے صحیح ہونے کی واضح دلیل موجود ہے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ خبر دی ہے کہ ''یہی تو وہ لوگ ہیں کہ جب بھی ان کو زمین میں اقتدار دیا جائے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کی بجا آوری میں منہمک رہیں گے، اور ان کو اقتدار دیا گیا۔ جس سے قطعاً ثابت ہو گیا کہ یہی وہ ائمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کو برپا کرنے والے اور اس کی ممنوعات و نواہی سے باز رکھنے والے ہیں اور ان لوگوں میں معاویہ رضی اللہ عنہ داخل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وصف تو ان مہاجر حضرات کا بیان کیا ہے جو اپنے وطنوں سے نکالے گئے اور معاویہ رضی اللہ عنہ تو مہاجرین میں نہیں بلکہ طلقاء میں ہیں۔

اب ذرا قرآن کریم کے ان الفاظ پر غور کیجئے کہ ان میں حضرات مہاجرین کی منقبت ہے اور ان کے ائمہ خلفاء راشدین کی مقبولیت و حقانیت کی کیسی واضح دلیل ہے۔

''طلقاء''طلیق کی جمع ہے، ''طلیق''اس قیدی کو کہتے ہیں جس کو رہا کر دیا جائے، یہاں فعیل بمعنی مفعول ہے۔ غزوہ حنین کی حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ:

7۔ احکام القرآن جصاص، ج 3، ص 303 و 304، طبع مصر جدید 1347ھ

خرج و معه الطلقاء.

آنحضرت ﷺ جب اس غزوہ میں تشریف لے گئے تو طلقاء آپ کے ہمرکاب تھے۔

اس میں "طلقاء" کا تعارف لغت کے مشہور امام علامہ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم رحمہ اللہ نے جو ابن منظور کے نام سے مشہور ہیں، ان الفاظ میں کیا ہے:

هم الذين خلّى عنهم يوم الفتح.

یہ وہی لوگ ہیں جن کو فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے چھوڑ دیا تھا (اور ان سے کوئی بازپرس نہیں کی تھی)

اور ثعلب رحمہ اللہ جو لغت و عربیت کے مشہور اکابر ائمہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں:

والطلقاء الذين أُدخلوا في الإسلام كرهًا.[8]

اور "طلقاء" وہ لوگ ہیں جو ناچاری کو اسلام میں داخل کر لئے گئے۔

یعنی ابھی اسلام ان کے دل میں رچا بسا نہ تھا۔

فتح مکہ کے وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بے شک طلقاء اور مولفۃ القلوب ہی میں تھے لیکن بعد کو سچے پکے مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ اگرچہ خلفائے راشدین میں داخل نہیں اور نہ اہل سنت اس کے قائل ہیں، اس لئے کہ یہ سعادت ان مہاجرین کے لئے مخصوص تھی جو اپنے وطن سے نکالے گئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس شرف سے محروم تھے، مگر ان آیاتِ کریمہ کو سامنے رکھ کر ذرا وہ لوگ بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں جو خلفاء ثلاثہ حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کو اپنے مطاعن کا نشانہ بناتے ہیں اور تاریخ میں "روافض" کے نام سے مشہور ہیں یا حضرات ختنین عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر طعن کرتے ہیں اور "خوارج" کہلاتے ہیں، یا صرف حضرت مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے بغض رکھتے ہیں اور نواصب کے نام سے

8۔ ملاحظہ ہو لسان العرب اور تاج العروس شرح قاموس، مادہ "طلق"۔

پہچانے جاتے ہیں۔ نیز موجودہ دور کے وہ لوگ بھی جو امیر المؤمنین عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ کس مقام پر ہیں حالانکہ حق تعالیٰ شانہ نے ان چاروں بزرگوں کا کردار یہ بتایا کہ:

"یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم جب ان کو اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے منع کریں۔"

اور پھر اس پیشین گوئی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا پورا ہو کر رہا اور ان ہی مہاجرین میں سے چار حضرات کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اقتدار بخشا تو ان چاروں بزرگوں نے اللہ تعالیٰ کی ان پر ہزاروں رحمتیں نازل ہوں، ویسا ہی کر کے بتایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمادیا تھا۔ ان حضرات کی خلافت قرآن و اسلام کی حقّانیت کی کھلی دلیل ہے۔ اب جو بدبخت ان حضرات کی خلافت میں کیڑے نکالتے ہیں وہ کیا اللہ تعالیٰ اور قرآن کی تکذیب نہیں کرتے؟ یاد رہے ان ہی چاروں بزرگوں کی خلافت "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" تھی، جس کی مدت حدیثِ صحیح میں تیس سال بیان کی گئی ہے اور احادیث صحیحہ میں ان کے عہدِ خلافت کو خلافت و رحمت کا عہد بتایا ہے، لہٰذا ان حضرات کے عہدِ خلافت پر طعن کرنا اپنا نامہ اعمال سیاہ کرنا ہے۔

چنانچہ آگے چل کر یہی امام ابو بکر جصّاص رحمہ اللہ سورۂ نور کی آیت کریمہ...

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِيْ الْأَرْضِ.

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ بعد کو حاکم کردے گا ان کو ملک میں۔

............کے تحت فرماتے ہیں:

فيه الدلالة على صحة نبوّة النبي صلى الله عليه وسلم لأنه قصر ذلک على قوم بأعيانهم بقوله (الذين آمنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم في الأرض)فوجد مخبره ما

أخبر به فيهم. وفيه الدلالة على صحة إمامة الخلفاء الأربعة أيضًا لأن الله استخلفهم في الأرض ومكّن لهم كما جاء الوعد ولا يدخل فيهم معاوية لأنه لم يكن مؤمنًا في ذلك الوقت. [9]

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کیونکہ حق سبحانہ نے یہ وعدہ ان متعین بزرگوں میں منحصر کر دیا جن کے بارے میں ارشاد ہے کہ (تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کیے ان کو ضرور زمین میں حاکم بنادے گا) پھر یہ خبر اسی طرح پوری ہو کر رہی جس طرح ان کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔

نیز اس آیت میں چاروں خلفاء کی امامت کے صحیح ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے ان کو ملک میں حاکم بنایا اور اپنے وعدہ کے مطابق ان کو اقتدار نصیب کیا، البتہ معاویہ ان میں داخل نہیں کیونکہ وہ اس وقت (جب یہ آیت اُتری) مشرف با یمان ہی نہیں ہوئے تھے۔

امام جصّاص رحمہ اللہ کے بعد بعینہ یہی بات امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی رحمہ اللہ المتوفی 557ھ نے اپنی کتاب "الاعتقاد على مذهب السلف أهل السنة والجماعة" میں کہی ہے، فرماتے ہیں:

وقد دلّ كتاب الله عزوجل على إمامة أبي بكر ومن بعده من الخلفاء، قال الله عزوجلّ: وعد الله الذين اٰمنوا منكم وعملوا الصّٰلحٰت ليستخلفنّهم في الأرض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضٰى لهم. وقال: الذين إن

9۔ احکام القرآن ج3، ص405، 406

مكّنّٰهم في الارض أقاموا الصلاة وآتوا الزكٰوة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر. فلمّا وجدت هٰذه الصفة من الاستخلاف والتمكين في أمر أبي بكر وعمر وعثمان وعلي دلّ على أنّ خلافتهم حقّ.[10]

کتاب اللہ حضرت ابو بکر اور ان کے بعد کے خلفاء کی خلافت پر دلالت کر رہی ہے، چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے (اللہ نے وعدہ کر لیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کو ضرور حاکم کر دے گا ملک میں جیسے کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم کر چکا ہے۔ اور اس دین کو ضرور اقتدار عطا کر دے گا جس کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے۔)

نیز ارشاد ہے: (یہی لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز کو قائم کریں اور زکٰوۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے منع کریں) اب جب خلافت و اقتدار کی یہ صفت حضرات ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی امارت میں پائی گئی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کی خلافت حق ہے۔

بہر حال یہ چاروں حضرات وہ ہیں جن کی خلافت، خلافتِ نبوت ہے اور اس بارے میں اہل سنت میں کوئی اختلاف نہیں اور ان میں باہم فضیلت میں بھی وہی ترتیب ہے جس ترتیب سے یہ حضرات خلافت پر فائز ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد امامت میں سب سے افضل ہیں اور وہ ان حضرات کے بعد سب سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ”منہاج السنۃ“ میں لکھتے ہیں:

10۔ ص 173 طبع مصر 1379ھ

وعليّ أحق الناس بالخلافة في زمنه بلا ريب عند أحد من العلماء. [١١]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے عہدِ خلافت میں سب لوگوں سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے تسلیم کرنے میں کسی ایک عالم کو بھی شک نہیں ہے۔

اسی لئے امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے اکابر علماء کا قول ہے کہ:

من لم يُرَبِّع بعلي في الخلافة فهو أضل من حمار أهله. [١٢]

جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چوتھا خلیفہ نہ مانے وہ اپنے گھر کے گدھے سے زیادہ گم کردہ راہ ہے۔

اور امام ممدوح رحمہ اللہ ہی کا ارشاد ہے:

إن الخلافة لم تزيّن علياً بل عليّ زينها. [١٣]

خلافت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو زینت نہیں دی بلکہ حضرت علی رضی اللہ نے خلافت کو زینت بخشی ہے۔ کرّم اللہ وجہہ۔

اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ "تاريخ الخلفاء" میں ناقل ہیں:

وأخرج البيهقي وابن عساكرعن إبراهيم بن سويد الأرمني قال: قلتُ لأحمد بن حنبل: مَنِ الخلفاء؟ قال: ابوبكر وعمر

11۔ ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" ج4، ص208، طبع امیریہ بولاق مصر 1322ھ

12۔ ایضاً

13۔ تاریخ بغداد از حافظ ابو بکر بن علی خطیب بغدادی، ج1، ص145، طبع بیروت

وعثمان و علي. قلت: ومعاوية؟ قال: لم يكن أحق بالخلافة في زمان عليّ من عليّ. [14]

امام بیہقی اور حافظ ابن عساکر رحمہا اللہ ابراہیم بن سوید ارمنی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ خلفاء کون سے حضرات ہیں؟ فرمایا ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ میں نے عرض کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ؟ فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی اس کا مستحق نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی جو رائے آپ نے معلوم کی اس کی مزید تفصیل آپ کو اس روایت میں ملے گی جس کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ:

أخرج ابن الجوزي من طريق عبدالله بن أحمد بن حنبل: سالت أبي ما تقول في علي و معاوية؟ فأطرق، ثم قال: أعلم أن علياً كان كثير الأعداء ففتش أعداؤه له عيبًا، فلم يجدوا فعمدوا إلى رجل قد حاربه فأطروه كيادًا منهم لعليّ. [15]

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ نے بسند عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے والدِ محترم امام احمد رحمہ اللہ سے علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا کہ ان دونوں کے

14۔ تاریخ الخلفاء، ص199، شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی

15۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج7، ص81، طبع امیریہ بولاق 1301ھ۔ اسی روایت کو حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے "تاریخ الخلفاء" میں حافظ سلفی کی "طیوریات" کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (ص199)

بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو آپ نے سر جھکا لیا پھر فرمایا: یاد رکھو
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دشمن بہت تھے ان دشمنوں نے
حضرت کے بہت عیب تلاش کیے، ہار جھک مار کر جب کچھ نہ مل سکا تو
پھر یہ چال چلی کہ جس شخص نے آپ سے جنگ کی اس کو حد
سے چڑھانے لگے۔

امام ممدوح رحمہ اللہ نے دشمنانِ علی رضی اللہ عنہ کے جس کید کی نشاندہی کی ہے یہی "فتنۂ ناصبیت" ہے جس کے ذکر سے رجال کی کتابیں بھری پڑی ہیں، نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ فتنہ خوابیدہ اس دور میں پھر بیدار ہو چلا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

الفتنة نائمة لعن الله من أيقظها. [١٦]

فتنہ خوابیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہو جو اس کو بیدار کرے۔

جس طرح حضرات شیخین حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقابل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لانا اور ان حضرات پر ان کو فضیلت دینا اہل سنت کے نزدیک بدعتِ مذمومہ ہے جس کو تشیع کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابل حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھڑا کرنا، ان کے تعریفوں کے گن گانا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کو فضیلت دینا تشیّع سے زیادہ بُری بدعت ہے [١٧]، جس کو ناصبیت کہا جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ اب سنیوں کی نئی نسل میں عربی مدارس کے نوخیز لڑکے اس فتنہ کا شکار ہو رہے ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ ان کی علمی استعداد کی ناپختگی ہے، نہ فقہ

16۔ رواہ الرافعی فی امالیہ۔ ملاحظہ ہو "کشف الخفاء و مزیل الالباس" ج2، ص108، طبع بیروت 1402ھ
17۔ "رفض" سے نہیں کہ وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل ہے جو کفار کا شیوہ ہے۔

سے ان کو کما حقہ واقفیت حاصل ہوتی ہے، نہ حدیث سے، نہ علم کلام سے، نہ تاریخ سے۔ اردو میں جو کوئی دین بیزار، اس فتنہ کو ذرا بنا سنوار کر پیش کر دیتا ہے بس یہ اس کے ہو جاتے ہیں۔ اب ان لوگوں کی جرات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ یہ ناصبی اہل علم کے منہ آتے ہیں۔

چند سال پہلے ایک صاحب نے یزید علیہ ماعلیہ کے متعلق بارہ سوال نقل کر کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے دارالافتاء میں بھیجے تھے جن کے جوابات ہم نے نہایت تفصیل سے اپنی کتاب ''یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں'' قلمبند کر دیئے ہیں، یہ کتاب بارہا چھپ چکی ہے۔ اب حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے بارے میں چند شبہات پیش کیے گئے ہیں جن کے جواب میں پیش نظر رسالہ تحریر کیا گیا ہے۔ ناظرین اس تحریر کو ذرا غور اور توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔ مجھے فرصت کم ملتی ہے، بوڑھا ہو چکا، عمر اسّی سے متجاوز ہے، درس کی ذمہ داری الگ ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بدعت کا قلع قمع کرنے کے لئے اپنے کسی اور بندہ کو کھڑا کرے اور عام مسلمانوں کو اس فتنہ کی آفت سے محفوظ رکھے۔ آمین[18]

سب سے اول یہ امر غور طلب ہے کہ اسلام میں فرقِ مراتب کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے، کسی نے سچ کہا ہے کہ

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

امام مسلم رحمہ اللہ اپنی '' صحیح '' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

عن عائشة رضي الله تعالى عنها أنها قالت: أمرنا رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم أن ننزل الناس منازلهم.

18۔ فاضل مؤلف رحمہ اللہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے اپنے مرتبہ پر رکھیں۔

یعنی ہر ایک کے مرتبے کا اس کی حیثیت کے مطابق لحاظ رکھا جائے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے "الجامع الصحیح" کی کتاب التفسیر میں سورۃ الاعراف میں حسب ذیل روایت کی ہے:

أبو إدريس الخولاني قال: سمعت أبا الدرداءِ يقول: كانت بين أبي بكر وعمر محاورة فأغضب أبو بكر عمرَ فانصرف عنه عمر مُغْضَباً فأتبعه أبو بكر يسئله أن يستغفر له، فلم يفعل حتى أغلق بابه في وجهه، فأقبل أبوبكر إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال أبو الدرداء: ونحن عنده فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «أما صاحبكم هذا فقد غامر.» قال: وندم عمر على ما كان منه، فأقبل حتى سلم وجلس إلى النبي صلى الله عليه وسلم، وقصّ على رسول الله صلى الله عليه وسلم الخبر. قال أبو الدرداء: وغضب رسول صلى الله عليه وسلم وجعل أبوبكر يقول: والله يارسول الله! لانا كنت أظلم، فقال رسول صلى الله عليه وسلم: «هل أنتم تاركوا لي صاحبي؟ هل أنتم تاركوا لي صاحبي؟ إنّي قلت: يأيها الناس إني رسول الله اليكم جميعاً، فقلتم كذبت، وقال أبو بكر صدقت.

ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں میں نے حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سُنا، فرماتے تھے: حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مابین کچھ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی بات پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غصہ دلایا اور

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے غصہ ہو کر چل پڑے اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور درخواست کرنے لگے کہ وہ ان کے حق میں استغفار کریں لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا نہ کیا حتی کہ ان کے سامنے آنے پر اپنا دروازہ بھی بند کر دیا۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت ﷺ کا رُخ کیا۔ ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ہم اس وقت خدمتِ نبوی میں حاضر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے (ان کو آتے دیکھا تو) فرمایا: تمہارے ان صاحب کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے، ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (ادھر) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اپنے اس طرز عمل پر ندامت ہوئی تو فوراً دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور سلام کر کے آنحضرت ﷺ کی ایک جانب بیٹھ گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صورتِ واقعہ عرض کی۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: (یہ سن کر) جناب رسول اللہ ﷺ سخت غصہ ہو گئے حالانکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ برابر عرض کرتے جاتے تھے یا رسول اللہ قسم بخدا! میں نے ہی زیادہ بیجا کہا۔ تاہم حضور ﷺ یہی فرماتے رہے کہ تم میرے لئے میرے دوست کو چھوڑ سکتے ہو؟ (یاد کرو اس وقت کو جب) میں نے کہا تھا اے لوگو! یقیناً میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور تم نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے اور ابو بکر نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں۔

اور یہی روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ”صحیح“ میں دوسری جگہ ”کتاب المناقب“ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل کو بیان کرتے ہوئے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

أبي إدريس عن أبي الدرداء رضي الله عنه قال: كنت جالساً عند النبي صلى الله عليه وسلم إذ أقبل أبو بكر آخذاً بطرف

ثوبه حتى أبدى عن ركبته فقال النبي صلى الله عليه وسلم: «أما صاحبكم فقد غامر». فسلم وقال: إني كان بيني وبين ابن الخطاب شيء فأسرعت إليه ثم ندمت فسألته أن يغفر لي فأبى علي فأقبلت إليك، فقال: «يغفر الله لك يا أبا بكر» ثلاثاً، ثم إن عمر ندم فأتى منزل أبي بكر فسأل أثم أبو بكر، فقالوا لا فأتى إلى النبي صلى الله عليه وسلم فسلم فجعل وجه النبي صلى الله عليه وسلم يتمعر حتى أشفق أبو بكر فجثا على ركبتيه فقال: يا رسول الله والله! أنا كنت أظلَمَ مرتين، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: «إن الله بعثني إليكم فقلتم كَذَبْتَ وقال أبو بكر صَدَقَ وواساني بنفسه وماله فهل أنتم تاركوا لي صاحبي» مرتين فما أوذي بعدها.

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں سامنے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نمودار ہوئے، وہ اپنے کپڑے کا ایک کنارہ اس طرح اُٹھائے ہوئے تھے جس سے ان کا ایک گھٹنہ بھی ظاہر ہو رہا تھا (یہ دیکھ کر) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تمہارے ان صاحب کا تو کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے، اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر سلام کیا اور عرض کیا کہ میرے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ بات ہو گئی اور میں نے ان سے کچھ تیز گفتگو کی، پھر مجھے اس پر ندامت ہوئی تو میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے معاف کر دیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے آنحضرت ﷺ نے یہی الفاظ تین مرتبہ فرمائے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی (اس پر) ندامت ہوئی تو انہوں

نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر جا کر دریافت کیا کہ یہاں ابو بکر ہیں؟ اہل خانہ نے بتایا نہیں۔ پھر وہ بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے، (ان کو دیکھ کر) حضور انور ﷺ کا رُخِ انور متغیر ہونے لگا تا آنکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اندیشہ ہوا اور اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کرنے لگے یارسول اللہ! قسم بخدا زیادتی میری ہی تھی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے مجھے تمہاری طرف مبعوث فرمایا تو تم سب کہنے لگے تُو جھوٹا ہے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ سچے ہیں اور اپنی جان اور مال سے میری خبر گیری کی تو کیا اب تم میرے دوست کو میری وجہ سے (ستانے سے) چھوڑ سکتے ہو؟ یہ آپ نے دوبارہ ارشاد فرمایا اس واقعہ کے بعد پھر کبھی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذیت نہیں دی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اُمت میں جو مقام ہے وہ ذہن میں رکھیئے اور پھر غور کیجئے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلالتِ شان کے پیش نظر اس میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے ذرا سا فرق آیا تو (حالانکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قسم کھا کر کہتے جاتے ہیں کہ زیادتی مجھ سے ہوئی ہے مگر) بارگاہِ رسالت علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے کیسی سخت سرزنش حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی ہستی کو ہوتی ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اس وصفِ خاص میں ممتاز ہیں کہ ان کا شمار ان معدودے چند افراد میں ہے جنہوں نے امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور مشرف بایمان ہوئے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ "تاریخ الخلفاء" میں رقمطراز ہیں:

وجمع بين الأقوال بأن أبا بكر أول من أسلم من الرجال، وعلي أول من أسلم من الصبيان، وخديجة أول من أسلمت من النساء، وأول من ذكر هذا الجمع الإمام أبو حنيفة – رحمه الله– أخرجه عنه. (ص: ١٤)

ان تمام اقوال میں (جو اس بارے میں منقول ہیں کہ سب سے پہلے کون مشرّف باسلام ہوا) اس طرح تطبیق دی گئی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے اور بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور عورتوں میں سب سے پہلے حضرت ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا، اور سب سے پہلے یہ تطبیق جس نے بیان کی وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

اب سوچئے جو لوگ فتح مکہ میں ایمان لائے وہ جناب مرتضیٰ کے مقابل کس طرح لائے جاسکتے ہیں؟ اسی طرح حضرت خالد سیف اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلالت شان سے کون مسلمان ناواقف ہے، مگر ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں ان سے کچھ گستاخی ہوگئی تو آنحضرت ﷺ نے اس سلسلہ میں جو ارشاد فرمایا، وہ "صحیح مسلم" میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی بایں الفاظ مروی ہے:

كان بين خالد بن الوليد، وبين عبد الرحمن بن عوف شيء، فسبه خالد، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا تسبوا أحداً من أصحابي، فإن أحدكم لو أنفق مثل أحد ذهباً، ما أدرك مدَّ أحدهم، ولا نصيفه». [١٩]

19۔ صحیح مسلم، ج2، ص310، طبع مجتبائی دہلی، کتاب الفضائل

حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی آپس میں کوئی بات ہو گئی اور خالد نے آپ کو برا بھلا کہا اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ میرے کسی صحابی کو برا نہ کہو کیونکہ تم میں سے اگر کوئی شخص کوہِ اُحد کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی صحابی کے ایک مُدّ بلکہ آدھے مُدّ (غلّہ) کو بھی نہیں پا سکتا۔

یاد رہے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین اولین میں ہیں اور ان کا شمار عشرہ مبشرہ یعنی ان دس حضرات میں ہے جن کو جیتے جی آنحضرت ﷺ نے جنت کی خوشخبری دیدی تھی۔ کسی فارسی شاعر نے دس حضرات کے اسماء گرامی کو حسب ذیل قطعہ میں درج کر دیا ہے:

دہ یار بہشتی اند قطعی بوبکر و عمر، عثمان و علی طلحہ
است و زبیر و عبدالرحمن سعد است و سعید و بوعبیدہ

یعنی دس اصحاب قطعی بہشتی ہیں: (۱) ابوبکر (۲) عمر (۳) عثمان (۴) علی (۵) طلحہؓ (۶) زبیر (۷) عبدالرحمن بن عوف (۸) سعد بن ابی وقاص (۹) سعید بن زید اور (۱۰) ابوعبیدہ بن الجرّاح رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

"مُدّ" (میم پر پیش اور دال پر تشدید کے ساتھ) ایک پیمانہ کا نام ہے جس میں غلّہ بھر کر دیا کرتے تھے اور اسی سے صدقہ فطر وغیرہ ادا کیا کرتے تھے۔ اس کا وزن دو رطل ہے، اور امام احمد رحمہ اللہ کی کتاب "فضائل الصحابہ" میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں:

عن عامر قال شكا عبد الرحمن بن عوف خالد بن الوليد إلى رسول الله صلى الله عليه و سلم فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم: «يا خالد مالك وما لرجل من المهاجرين لو أنفقت مثل أحد ذهباً لم تدرك عمله».

عامر شعبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خالد بن ولید رضی عنہ کی شکایت کی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تمھیں ایک مہاجر شخص سے اڑنے کی کیا پڑی تھی، یاد رکھو اگر تم کوہِ اُحد کے برابر بھی سونا راہِ خدا میں خرچ کرو تو ان کے عمل کو نہیں پہنچ سکتے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور امام احمد رحمہ اللہ کی ان روایات کو سامنے رکھ کر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کہاں حضرت مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور کہاں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ، ان دونوں کے مرتبوں میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''تقریب التہذیب'' میں تصریح کی ہے:

علي بن أبي طالب بن عبد المطلب بن هاشم الهاشمي بن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم وزوج ابنته من السابقين الأولين، ورجح جمع أنه أول من أسلم وهو أحد العشرة، مات في رمضان سنة أربعين وهو يومئذ أفضل الأحياء من بني آدم بالأرض بإجماع أهل السنة، وله ثلاث وستون على الأرجح، ع.

علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم ہاشمی، رسول اللہ ﷺ کے برادر عمزاد، آپ کی صاحبزادی محترمہ کے شوہر، حضرات سابقین اولین میں ہیں۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ امت میں سب سے پہلے آپ ہی اسلام لائے، جن دس محترم افراد کو ایک ساتھ جیتے جی جنت کی بشارت ملی ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ ماہ رمضان ۴۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی، تمام اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ اپنے عہدِ خلافت میں روئے زمین پر جتنے بھی انسان موجود تھے آپ ان سب سے افضل تھے۔ راجح قول کے مطابق آپ کی عمر شریف تریسٹھ سال کی ہوئی۔

صحاح ستّہ کی تمام کتابوں میں آپ کی حدیثیں موجود ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ باتفاقِ امت فضیلت میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھے ہوئے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درجہ و منزلت میں کہیں پیچھے ہیں، بایں ہمہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایہ والنہایہ" میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے (جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے تلامذہ میں بڑے امام، محدث، فقیہ، زاہد اور مجتہد گذرے ہیں) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جلالتِ شان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جناب ممدوح رحمہ اللہ سے جب ایک بار یہ سوال کیا گیا کہ

أيهما أفضل؟ هو أو عمر بن عبد العزيز ؟ فقال: لتراب في منخري معاوية مع رسول الله صلى الله عليه وسلم خير وأفضل من عمر بن عبد العزيز.[٢٠]

ان دونوں حضرات میں کون صاحب افضل ہیں حضرت معاویہ یا حضرت عمر بن عبدالعزیز (رضی اللہ عنہما) تو آپ نے فرمایا یقیناً جو خاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دونوں نتھنوں میں پڑی وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ بزرگ ہیں جن کو قرنِ اول کا مجدّد مانا جاتا ہے اور جن کے بارے میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ:

20۔ ج8، ص142، طبع بیروت

وعدل عمر بن عبد العزيز أظهر من عدل معاوية وهو أزهد من معاوية.[21]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا عدل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل سے زیادہ آشکار ہے اور وہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے زہد میں کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

یہ بھی واضح رہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا شمار اہل سنت کے نزدیک خلفائے راشدین میں ہے۔ مؤرخ اسلام حافظ ذہبی رحمہ اللہ ''سیر اعلام النبلاء'' میں ان کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

وكان من أئمة الاجتهاد، ومن الخلفاء الراشدين.

اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ:

والسنة أن يقال لمعاوية ملك، ولا يقال له خليفة لحديث سفينة:
«الخلافة بعدي ثلاثون سنة ثم تكون ملكاً عضوضاً.»[22]

اور سنت یہ ہے کہ معاویہ کو بادشاہ ہی کہا جائے ان کو خلیفہ نہ کہا جائے کیونکہ حضرت سفینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا میرے بعد تیس سال تک تو خلافت رہے گی اور پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہو جائے گی۔

اور یہی بات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ کی مشہور شرح ''اشعۃ اللمعات'' میں حدیث دوازدہ خلفاء کی شرح کرتے ہوئے لکھی ہے، فرماتے ہیں:

21۔ منہاج السنۃ، ج3، ص183، طبع بولاق مصر 1322ھ
22۔ ج8، ص137، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت

ونیز در حدیثِ صحیح آمدہ کہ «الخلافة بعدي ثلاثون سنة ثم تكون ملكاً عضوضاً.» **واتفاق کردہ اند علماء برآنکہ بعد از سی سال خلفاء نیستند بلکہ ملوک وامراء اند۔**[۲۳]

اور حدیثِ صحیح میں بھی آیا ہے کہ "میرے بعد خلافت تیس برس تک رہے گی پھر کاٹ کھانے والی باشاہی ہو جائے گی۔"

اور علماء نے اتفاق کیا ہے کہ تیس سال کے بعد خلفاء نہیں بلکہ بادشاہ اور امراء تھے۔

یاد رہے اس حدیث میں جس خلافت کا ذکر آیا ہے وہ "خلافتِ کبریٰ" ہے جو "خلافتِ نبوت" کہلاتی ہے، ورنہ مجازاً تو عام فرمانروائوں کو بھی خلفاء کہہ دیا کرتے ہیں، جیسے خلفائے عباسیہ بلکہ ہندوستان کے بادشاہوں کو بھی خلیفہ لکھ دیا کرتے تھے۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور جناب معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باہمی موازنہ میں یہ جسارت تو نہیں کر سکتے کہ جس طرح عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے متعلق اظہار خیال کیا ہے اسی طرح ہم بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کہہ دیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ابنِ مبارک رحمہ اللہ کی اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر بلا مبالغہ یزید بن معاویہ اور اس کے ان اعوان وانصار کے متعلق جو اس کے مظالم و جرائم میں شریک رہے ہیں بغیر کسی شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وہ پیشاب جو آنحضرت ﷺ کے جسم اطہر سے مس ہوا ان کے وجود سے کہیں بہتر اور افضل ہے، کہ وہ جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور یہ خبیث لعنت کا مستحق۔

23۔ج4، ص1620، طبع لکھنؤ مطبع تیج کمار 1963ء

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی عرض کیا جاسکتا ہے جو خود آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عتاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "خالد! اگر تم کوہِ احد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کرو تو عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ایک مُد غلہ بلکہ آدھے مُد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔" اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا۔

یاد رکھیے! حضرت علی کرم اللہ وجہہ باتفاقِ امت خلیفہ راشد ہیں۔ چنانچہ امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رحمہ اللہ "احکام القرآن" باب قتال أهل البغي میں فرماتے ہیں:

قاتل علي بن أبي طالب الفئة الباغية بالسيف ومعه من كبراء الصحابة وأهل بدر من قد علم مكانهم، وكان محقاً في قتاله لهم، لم يخالف فيه أحد إلا الفئة الباغية التي قابلته وأتباعها وقال النبي صلى الله عليه وسلم لعمار: «تقتلك الفئة الباغية» وهذا خبر مقبول من طريق التواتر. حتى إن معاوية لم يقدر على جحده لما قال له عبد الله بن عمرو، فقال: إنما قتله من جاء به فطرحه بين أسنتنا. رواه أهل الكوفة وأهل البصرة وأهل الحجاز وأهل الشام، وهو علم من أعلام النبوة، لأنه خبر عن غيب لا يعلم إلا من جهة علام الغيوب.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باغی جماعت سے بزورِ شمشیر قتال فرمایا، آپ کے ساتھ ایسے ایسے اکابر صحابہ اور اہلِ بدر تھے کہ جن کی منزلت معلوم ہے اور آپ ان باغیوں سے قتال کرنے میں حق پر تھے، اور اس مسئلہ میں سوائے اس باغی جماعت اور ان کے پیرو کے کہ جو آپ سے لڑ رہی تھی کوئی ایک شخص بھی آپ کے خلاف نہ تھا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمادیا تھا

کہ تم کو باغی جماعت قتل کرے گی یہ اتنی مقبول حدیث ہے کہ جو بطریق تواتر وارد ہے حتیٰ کہ خود معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی جب ان کو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تو اس کا انکار نہ کر سکے بلکہ یوں بات بنائی کہ (ہم نے ان کو تھوڑی قتل کیا ہے بلکہ) ان کو تو اس نے قتل کیا ہے جس نے عمار رضی اللہ عنہ کو لا کر ہماری سنانوں کے درمیان ڈال دیا۔

یہ وہ حدیث ہے جس کو اہل کوفہ، اہل بصرہ، اہل حجاز اور اہل شام نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث نبوت کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، کیونکہ یہ غیب کی خبر ہے جس کا علم، علام الغیوب کے بتائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

امام جصّاص رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا وہی امام بیہقی فرماتے ہیں کہ:

وأما خروج من خرج على أمير المؤمنين رضي الله عنه مع أهل الشام في طلب دم عثمان ثم منازعته إياه في الأمارة فأنه غير مصيب فيما فعل، واستدلنا بيرائة عليّ من قتل عثمان بما جرى له من البيعة ولما كانت له من السابقة في الإسلام والهجرة والجهاد في سبيل الله والفضائل الكثيرة والمناقب الجمّة التي هي معلومة عند أهل المعرفة. إن الذي خرج عليه ونازعه كان باغياً عليه، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد أخبر عمار بن ياسر بأن الفئة الباغية تقتله فقتله هٰؤلآء الذين خرجوا على أمير المؤمنين عليّ رضي الله عنه في حرب صفّين. [٢٤]

24۔ ملاحظہ ہو ''الاعتقاد علی مذہب السلف اہل السنۃ والجماعۃ'' از امام بیہقی رحمہ اللہ

اور جس نے بھی اہل شام کے ساتھ مل کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصاص طلب کرنے کے لئے حضرت امیر المؤمنین (علی رضی اللہ عنہ) پر خروج کیا اور پھر آپ سے امارت کے باب میں نزاع کی تو وہ اپنے اس فعل میں بر سرِ خطا تھا۔ اور قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برات کے باب میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی تھی اور اسلام اور جہاد فی سبیل اللہ کے باب میں آپ سوابق کے حامل ہیں آپ کے فضائل اور مناقب بہت ہیں جو اہل علم کو معلوم ہیں۔

جس شخص نے بھی آپ کے خلاف خروج کیا اور آپ سے نزاع کی وہ باغی ہے۔ بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلے ہی خبر دیدی تھی کہ باغی جماعت ان کو قتل کرے گی۔ چنانچہ جنگِ صفّین میں جن لوگوں نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا، انہوں نے حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا۔

اور اس کے بعد حدیثِ صحیح کے مشہور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ سے بسند ناقل ہیں:

خير الناس بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأولاهم بالخلافة أبوبكر الصديق ثم عمر الفاروق ثم عثمان ذي النورين ثم عليّ بن أبى طالب رحمة الله ورضوانه عليهم أجمعين.

قال: وكل من نازع أمير المؤمنين علياً بن أبي طالب في أمارته فهو باغ. على هذا عهدت مشايخنا، وبه قال ابن إدريس الشافعي رحمه الله، قال الشيخ ثم لم يخرج من خرج عليه من الإسلام. [٢٥]

25۔ ''الاعتقاد علی مذہب السلف اہل السنۃ والجماعۃ'' از امام بیہقی رحمہ اللہ ص196، 197

رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے زیادہ بزرگ اور خلافت کے لئے سب سے زیادہ اولیٰ حضرت ابو بکر صدیق تھے پھر حضرت عمر فاروق پھر حضرت عثمان ذی النورین پھر حضرت علی بن ابی طالب۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات سے راضی ہو اور اپنی رحمت ان پر نازل فرمائے۔

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس نے بھی حضرت امیر

المؤمنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے ان کی امارت کے بارے میں جھگڑا کیا وہ باغی ہے، اسی عقیدہ پر ہم نے اپنے مشائخ کو پایا ہے اور یہی ابن ادریس یعنی امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ شیخ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلاف خروج کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔

امام حاکم نیشاپوری نے اپنی مشہور کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں علم حدیث کی تیئیسویں نوع میں جس میں احادیثِ مشہورہ کا بیان ہے۔ حدیث "تقتل عمارًا الفئة الباغية" کو ان مشہور احادیث میں شمار کیا ہے جن کی "صحیحین" میں تخریج کی گئی ہے۔

یہ عقیدہ صرف امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ تمام اہل السنۃ والجماعۃ کا ہے۔ جس کا ذکر کتاب میں ہو چکا ہے۔

اب ہم اس سلسلہ میں فقہ حنفی کے چند مشہور جلیل القدر علماء کرام کی تصریحات پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

علامہ صدر الشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ المتوفی ۵۳۶ھ (جو صاحب "ہدایہ" کے استاد ہیں اور جن کے بارے میں علامہ محمود بن سلیمان کفوی رحمہ اللہ نے "طبقات حنفیہ" میں تصریح کی ہے کہ "كان من كبار الأئمة وأعيان الفقهاء") (وہ بڑے ائمہ اور زبردست فقہاء میں تھے) اپنی کتاب شرح "أدب

القاضي للخصاف" **میں زیر عنوان** "بیان من یجوز تقلد القضاء منه" **یعنی کس فرمانروا سے عہدہ قضاء قبول کرنا جائز ہے، فرماتے ہیں:**

وأما بيان من يجوز تقلد القضاء منه، فيجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر جميعاً. أما العادل فإن النبي صلى الله عليه وسلم بعث معاذاً إلى اليمن قاضياً، وولّى عتاب بن أسيد أميراً على مكّة. وأما الجائر فإن الصحابة تقلدوا الأعمال عن معاوية بعد ما أظهر الخلاف مع علي في نوبته. لكن إنما يجوز تقلّد القضاء من السلطان الجائر إذا كان يمكنه من القضاء بحق. وأما إذا كان لا يمكنه فلا. لما روي عن الحكم بن عمرو الغفارى أنه أتاه كتاب معاوية وكان فيه: أن أمير المؤمنين يأمرک أن تصطفي له الصفراء والبيضاء. فقال سبق كتاب الله كتاب أمير المؤمنين معاوية، وتلا قوله تعالىٰ: «واعلموا أنما غنمتم من شيء فإن لله خمسه» الآية ثم صعد المنبر وقال: يا أيها الناس! لقد أتاني أن أصطفي له الصفراء والبيضاء، وقد سبق كتاب الله تعالىٰ كتاب معاوية، وإني قاسم لكم ما آفاء الله عليكم، ألا فليقم كل واحد منكم فليأخذ حقّه، ثم قال: اللهم اقبضني إليک، فما عاش بعد ذلک إلا قليلاً.[26]

اور اس بات کا بیان کہ کس فرمانروا سے عہد قضا قبول کرنا جائز ہے: یہ ہے کہ سلطان عادل ہو یا غیر عادل (جور کرنے والا) دونوں سے عہدہ قضا قبول کرنا جائز ہے۔ سلطان عادل سے تو اس بنا پر آنحضرت ﷺ

26۔ شرح ادب القاضی للخصاف، ج1، ص129، لغایت132، طبع اول مطبع الارشاد مصر 1397ھ

نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ معظمہ کا امیر بنایا تھا۔اور سلطانِ جائر سے اس لئے کہ صحابہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عہدوں کو قبول کیا حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہو چکی تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں حق پر تھے اور انہوں نے ان کی مخالفت کی۔

لیکن سلطان غیر عادل کا قاضی بننا صرف اسی صورت میں جائز ہے جبکہ قاضی کو حق کے مطابق فیصلہ کرنا ممکن ہوا گر وہ حق کے مطابق فیصلہ نہ کر سکے تو اس صورت میں اس کا قاضی بننا ناجائز ہے،اس لئے حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط ان کے پاس آیا جس میں یہ لکھا تھا کہ امیر المؤمنین آپ کو حکم دیتے ہیں اس بات کا کہ آپ سونا اور چاندی میرے لئے علیحدہ کر لیں، تو آپ (حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ: اللہ تعالٰی کی کتاب کا حکم امیر المؤمنین کی حکم سے پہلے ہے اور آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: "واعلموا أنما غنمتم من شيء فإن لله خمسه" الآیہ ترجمہ: اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ۔ پھر آپ منبر پر چڑھ کر فرمانے لگے: اے لوگو! امیر المؤمنین کا خط میرے پاس آیا ہے اور انہوں نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ سونا اور چاندی میرے لئے علیحدہ کر لے مگر اللہ تعالٰی کے حکم کی تعمیل معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل سے پہلے ہے، اور اب میں تمہارے لئے اللہ نے جو مالِ غنیمت عطا کیا ہے تقسیم کرتا ہوں لہٰذا ہر شخص تم میں سے کھڑا ہو کر اپنا حق وصول کر لے۔ پھر اس کے بعد دعا کی: "یا اللہ مجھے اپنی طرف اٹھا

لے“۔ چنانچہ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی وفات ہوگئی۔

ملاحظہ فرمایئے امام ابن مازہ رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عہد مرتضوی میں ”امام جائر“ قرار دیا ہے کیونکہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اپنے عہدِ خلافت میں خلیفۂ راشد تھے اور ان سے بغاوت کرنا جرم تھا اور امام جائر سے عہدہ قضا کا قبول کرنا اگرچہ جائز ہے تاکہ احکام شرع کا رعیت میں نفاذ ہوتا رہے لیکن یہ جواز بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ فرمانروا اگر کسی غلط کام کا حکم دے تو اس کی تعمیل نہ کی جائے جیسا کہ حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا اور اگر حاکم کا یہی وتیرہ رہے تو پھر اس کا قاضی بننا جائز نہیں۔

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”ہدایہ“ میں ہے:

يجوز التقلد من السلطان الجائر كما يجوز من العادل لأن الصحابة رضي الله عنهم تقلدوا من معاوية والحق كان بيد علي رضي الله عنه في نوبته.

جائز ہے عہدہ قضا قبول کرنا سلطان غیر عادل سے جیسا کہ بادشاہ عادل سے قبول کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منصبِ قضا کو قبول کیا تھا حالانکہ ان کے زمانہ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ برسرِ حق تھے۔

”ہدایہ“ کی اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے علامہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ نے صاف لکھ دیا ہے کہ ”هذا تصريح بجور معاوية“ یہ معاویہ کے سلطانِ جائر ہونے کی صراحت ہے۔

اور صاحبِ ”ہدایہ“ نے جو ”في نوبته“ کہا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے محقق ممدوح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإنما كان الحق معه في تلك النوبة لصحة بيعته وانعقادها فكان على الحق في قتال أهل الجمل وقتال معاوية بصفين وقوله عليه الصلاة والسلام لعمار سَتَقْتُلُكَ الفئة الباغية وقد قتله أصحاب معاوية يصرح بأنهم بغاة. [27]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی برسر حق تھے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت صحیح تھی اور منعقد ہو گئی تھی لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل جمل اور اہل صفین سے جنگ میں برسر حق تھے۔

اور حضور علیہ السلام نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا کہ تمہیں عنقریب باغی جماعت قتل کرے گی چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے انہیں قتل کیا، یہ حدیث بتاتی ہے کہ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر جنگ تھے وہ باغی تھے۔

اور شیخ الاسلام بدر الدین محمود عینی "البناية في شرح الهداية" میں فرماتے ہیں:

وعند أهل السّنة معاوية كان باغياً في نوبة علي رضي الله عنه وبعده إلى زمان ترك أمير المؤمنين حسن الخلافة إليه. [28]

اہل سنت کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی ہی تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد جب تک امیر المؤمنین حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت اس کے سپرد نہ کی وہ باغی ہی رہے۔

27۔ ملاحظہ ہو ہدایہ اور اس کی شرح فتح القدیر "کتاب ادب القضاء"

28۔ البنایہ شرح الہدایہ بحث مذکور

اور امام صدر الاسلام سیف الدین ابو الیسر بزدوی رحمہ اللہ (جو امام فخر الاسلام بزدوی رحمہ اللہ کے بھائی ہیں) اپنی کتاب "اصول الدین" میں فرماتے ہیں:

قال أهل السنة والجماعة أن معاوية حال حيَاة علي رضي الله عنهما لم يكن إماماً، بل كان الإمام والخليفة علي، وكان علي الحق ومعاوية على الباطل.[29]

اہل سنت و جماعت اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ امام نہیں تھے بلکہ امام اور خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے جو برسرِ حق تھے اور حضرت معاویہ حق پر نہ تھے۔

اور سر آمد علماء متاخرین شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" میں رقمطراز ہیں:

"ہر جاہل فارسی خوان بلکہ طفلِ دبستان کہ "عقائد نامہ" فارسی اہل سنت را کہ نظم مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامی است خواندہ یا دیدہ باشد یقین می داند کہ اہل سنت قاطبہ اجماع دارند بر آنکہ معاویہ بن ابی سفیان از ابتدائے امامت حضرت امیر رضی اللہ عنہ بغایت تفویض حضرت امام حسن باواز بغاۃ بود کہ اطاعت امام وقت نداشت، وبعد از تفویض حضرت امام بدواز ملوک شد۔"[30]

ترجمہ: ہر فارسی خواں نادان بلکہ طفلِ مکتب بھی جس نے عقائد نامہ مولانا نور الدین جامی رحمہ اللہ کا پڑھا یا دیکھا ہے (جس میں اہل سنت کے عقائد کا بیان ہے) وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ سب اہل سنّت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ حضرت

29۔ اصول الدین، ص 197 طبع قاہر 1383ھ

30۔ تحفہ اثنا عشریہ، ص 485، طبع نول کشور لکھنؤ 1302ھ

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی ابتائے خلافت سے لے کر جب تک
امام حسن رضی اللہ عنہ نے ان کو امامت تفویض نہیں کی کہ وہ باغی تھے،
کہ امامِ وقت کی اطاعت سے محروم رہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ
کی تفویض کے بعد ان کا شمار بادشاہوں میں ہے۔

یہ ہیں وہ تصریحات اکابر علماء اہل سنت کی کہ حضرت مرتضیٰ کرّم اللہ تعالیٰ وجہہ اپنے زمانہ خلافت میں ازروئے کتاب وسنت خلیفۂ راشد تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی اور خطا پر تھے۔

یاد رکھئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تین جماعتوں نے جنگ کی ہے، سب سے پہلے اہل جمل نے اس جماعت کے قائدین کو بروقت اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور انہوں نے فوراً ہی اپنے مؤقف سے رجوع کر لیا، یہی صدّیقین کی شان ہے۔ ان حضرات کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شرع کا فیصلہ ہے کہ ”التائب من الذنب کمن لا ذنب له“ جس نے گناہ سے توبہ کی وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے گناہ ہی نہ کیا۔

دوسری جماعت بغاۃ شام کی ہے جن کے بارے میں حدیثِ صحیح و متواتر میں ”فئة باغية“ (باغی گروہ) کے الفاظ وارد ہیں۔

تیسری جماعت ”خوارج“ کی ہے جن کے گمراہ ہونے میں اہل سنت کو کوئی شبہ نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے قتال کرنے والوں میں بعض صحابہ بھی تھے تو واضح رہے کہ خوارج کے جس گروہ نے آپ سے جنگ کی اس میں کوئی صحابی تو در کنار کوئی بزرگ تابعی بھی نہیں نظر آتا، اسی طرح بغاۃ شام میں سابقین اولین میں سے کوئی صحابی نہ تھے۔ اہل جمل میں بیشک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہم طبقہ بعض اکابر تھے لیکن ان حضرات نے جیسے ہی غلط فہمی دور ہوئی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے موقف سے رجوع کرنے میں دیر نہ کی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ صحابہ کے باہمی نزاع کا مسئلہ بڑا نازک ہے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، حق کو حق کہنا اور صحیح

بات کو صحیح سمجھنا تو ضروری ہے مگر کسی ادنیٰ صحابی کی بھی توہین کرنا اور اس پر طعن و تشنیع کرنا سرے سے ناجائز اور حرام ہے۔ اگر اس دور میں ناصبیت کا فتنۂ خوابیدہ جو کم و بیش ہزار سال سے دبا ہوا تھا نئے سرے سے سر نہ اٹھاتا تو ہمیں بھی اس بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

یاد رکھئے حضرات اہل سنت و جماعت جہاں اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں جتنی بھی جنگیں لڑیں ان میں وہ حق پر تھے اور ان سے لڑنے والے خطا پر، وہاں ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا جب ذکر آئے خیر کے ساتھ ان کو یاد کریں گو وہ معصوم نہیں اور ان سے گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے اور غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں مگر ساری اولاد آدم میں (انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر کہ وہ سب برگزیدہ اور معصوم تھے) وہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ہیں۔

رفض وناصبیت کی بنیاد
کذب ودروغ گوئی

بندۂ مؤمن کی طبیعت ساری ہی برائیوں کی طرف مائل ہو سکتی ہے، مگر کذب اور خیانت کی طرف اس کا میلان نہیں ہوا کرتا۔ تصدیق اور ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ صدق وامانت اس کی فطرت میں داخل ہو اور کذب اور خیانت سے اس کو طبعی نفرت ہو۔ جھوٹ بولنا، دغابازی یہ منافق کا شیوہ ہے مسلمان کا نہیں۔

''رفض''اور''ناصبیت'' یہ دو ایسی بدعتیں ہیں جن کی بنیاد ہی کذب اور دروغ گوئی پر قائم ہے۔ غضب خدا کا تصور تو کیجئے ''رافضی''اور''ناصبی'' یہ دونوں فرقے خیرِ اُمت کے افضل ترین افراد کے بارے میں جن کے جنتی ہونے کی زبان رسالت نے شہادت دی ہے اور جن کی ثنا وصفت خود قرآن پاک میں جا بجا مذکور ہے، کس بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اور کیسی کیسی افترا پردازی اور بہتان طرازی کرتے ہیں۔

رافضی، حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم اور عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''العیاذ باللہ ان سے بیعت کرنے والے مسلمان نہیں منافقین تھے، انہوں نے ہی ان کو خلیفہ اور امام بنایا تھا اور ان تینوں حضرات نے تخت خلافت پر زبردستی قبضہ جما لیا تھا ورنہ خلافت تو دراصل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا اور وہی آنحضرت ﷺ کے خلیفہ بلا فصل تھے۔'' یہ لوگ ان حضرات ثلاثہ اور ان سے بخوشی بیعت کرنے والے تمام اصحاب کرام رضی اللہ عنہ کو سرے سے

مومن ہی نہیں سمجھتے، بلکہ ان سب کو منافق کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس جھوٹ کو سچ باور کرنے سے بچائے۔ آمین

برصغیر پاک وہند میں روافض کا وجود زمانۂ قدیم سے ہے، ایک زمانہ میں "ملاحدہ باطنیہ" نے "ملتان" میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ملت کے بطل جلیل سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کو کہ انہوں نے "ملتان" سے ان کی سلطنت کا خاتمہ کر کے باطنی شیعوں کا قلع قمع کیا، تاہم ان "قرامطہ ملاحدہ" کی یادگار "آغا خانی" اور "برہان الدین" کی جماعت سے وابستہ "باطنی شیعہ" اب بھی ہندو پاک کے مختلف شہروں میں جابجا کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ "ملاحدہ باطنیہ" بالاتفاق غیر مسلم ہیں۔ یہ اپنے ائمہ کو نعوذ باللہ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے افضل سمجھتے ہیں، صحابہ اور دین کے دشمن ہیں، قرآن و شریعت کو معطل کر دینے کا اپنے ائمہ کو حقدار سمجھتے ہیں، چنانچہ آغا خانیوں نے تو آج کل دین و شریعت کو بالکل معطل کر ہی رکھا ہے۔ یہ لوگ اپنے ائمہ میں خدا کے حلول کرنے کے بھی قائل ہیں۔ "شیعہ اثنا عشری" جو بارہ اماموں کے قائل ہیں اپنے ان ائمہ کو معصوم جانتے ہیں اور ان کی اطاعت کو فرض قرار دیتے ہیں، انہوں نے بھی "دکن" میں اقتدار حاصل کر کے اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں، مجاہد کبیر محی الدین اورنگزیب عالمگیر غازی رحمہ اللہ نے اپنے عہد میں "دکن" کی ان ریاستوں کو ختم کر کے قلمرو سلطنت میں داخل کر لیا تھا، تاہم جب سے ہمایوں ایران سے لوٹا مغل دور حکومت میں "شیعہ اثنا عشریہ" کی تعداد بڑھتی ہی رہی۔ "اودھ" میں ان کی ریاست مستقل قائم ہو گئی تھی، جو انگریزوں کے زمانہ میں ختم ہوئی۔ اب عام طور پر رافضی کے نام سے یہ لوگ الگ جانے پہچانے جاتے ہیں اور کم و بیش ہر بڑے شہر اور قصبے میں موجود ہیں۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام سے تبری و بیزاری ان کے بھی دین کا جز ہے۔ قرآن کریم نے

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے غیظ اور ان پر غصہ اور خفا ہونے کو کفار کا خاصہ بتایا ہے، ارشاد ہے: ”لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارُ“۔

نواصب کون ہیں؟

”نواصب“”ناصبیہ“ اور ”اہلِ نصب“ تاریخ میں ان لوگوں کا لقب ہے جنہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی آل واصحاب کے خلاف بغض وعداوت کا علم بلند کرر کھا تھا، چنانچہ علامہ زمخشری رحمہ اللہ ”اساس البلاغۃ“ میں لکھتے ہیں:

وناصبت لفلان: عاديته نصباً. ومنه: الناصبيّة والنواصب.

وأهل النّصب: الذين ينصبون لعليّ كرم الله تعالى وجهه.

”ناصبت لفلان“ کے معنی آتے ہیں میں نے اس سے عداوت کھڑی کی، چنانچہ جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت رکھتے ہیں ان کو اسی بناپر ”ناصبیہ، نواصب اور اہل نصب“ کہتے ہیں۔

جس طرح روافض کا مذہب حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے تبری و بیزاری اور ان کو طرح طرح کے مطاعن سے مطعون کرنا ہے۔ بعینہ یہی طریقہ نواصب کا خلفیہ رابع حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ہے۔

”ناصبی“ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں ان کو سبائیوں نے امام بنایا تھا، انہوں نے ہی ان سے بیعت کر کے ان کو خلیفہ کیا اور دوسروں سے بھی زبردستی ان کی خلافت کی بیعت لی۔ یاد رہے سبائیوں کا سربراہ عبداللہ بن سبا، ایک یہودی منافق تھا جو مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے بظاہر اسلام کا دم بھرتا تھا۔ ناصبیوں کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت منعقد نہیں ہوئی، بلکہ ان کا دور حکمرانی ہنگامہ پروری اور فتنہ وفساد کا دور تھا جس میں ہر طرف مسلمانوں کے خون کی ارزانی تھی، خلافت راشدہ کا زمانہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

قتل کے بعد دوبارہ اس وقت شروع ہوا جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت کی اور مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا، ان کا بیٹا یزید بھی خلیفۂ راشد تھا مگر حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبائیوں کے ورغلانے میں آکر خلیفۂ برحق یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ آخر اپنے کیے کی سزا کو پہنچے، حرّہ میں جن صحابہ وتابعین کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قتل عام ہوا وہ بھی سب باغی تھے جو یزیدی فوج کے ہاتھوں اپنے کیفر کردار کو پہنچے، اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی بقول ان ناصبیوں کے خلیفۂ راشد یزید علیہ ماعلیہ کے ''ملحد فی الحرم'' یعنی حرم الٰہی میں الحاد کے داعی تھے اس لئے مجبوراً یزید کو فوج بھیج کر حرم کعبہ کا محاصرہ کرنا پڑا، غرض ان ناصبیوں کے نزدیک یزید کے سب اقدام برحق تھے اور اس کے خلاف جس نے بھی صدائے حق بلند کی وہ حق پر نہ تھا۔

حافظ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۴۵۶ھ نے شہادتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حادثہ کربلا، واقعہ حرّہ، حصار کعبہ و قتل ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان چاروں جان گسل واقعات کو اسلام کے چار رخنوں سے تعبیر کیا ہے کیونکہ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرکز کا احترام ختم ہوا اور خلافت کا رعب داب اُٹھ گیا۔ حادثہ کربلا سے آلِ رسول ﷺ کی عزت خاک میں ملی، واقعہ حرّہ سے ''مدینۃ الرسول ﷺ'' کی بے حرمتی ہوئی، قتل ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے کعبہ کی عزت کو داغ لگا۔ غرض ان چاروں ہنگاموں میں ناحق کوشوں نے وہ قیامت برپا کی کہ خدا کی پناہ۔ خلیفۃ الرسول، عترت پیغمبر اور اصحاب نبی سب کا بے دریغ خون بہایا اور حرم نبی، خانہ کعبہ، جملہ شعائرِ اسلام کی عظمت کا ذرہ برابر پاس ولحاظ نہیں کیا۔

ان چاروں حادثات کے بارے میں ناصبیوں کا موقف یہ ہے کہ وہ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذمہ دار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے ہیں اور حادثہ کربلا کا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اور واقعہ حرّہ کا ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنہوں نے یزید کی اطاعت سے انحراف کیا تھا اور حصارِ کعبہ کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ادعاء خلافت کو، شیعہ مروانیہ کا ایمان و عقیدہ یہی ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد نہیں بلکہ خلافت کے غاصب تھے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم جو حادثہ حرّہ اور حصار کعبہ کے خونی ہنگاموں میں یزید اور عبدالملک بن مروان کی تیغ ستم کا نشانہ بنے شہید نہیں۔ بلکہ خلافت کے باغی تھے جو اپنی بغاوت کی پاداش میں کیفر کردار کو پہنچے۔

نواصب کا خاتمہ

مشرق میں جب بنی عباس کے ہاتھوں بنی امیّہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور ان کا آخری حکمران مروان الحمار قتل ہو گیا تو اس کے قتل کے ساتھ ہی اس فرقہ نواصب کا بھی جس کو ''شیعہ مروانیہ'' و ''شیعہ امویہ'' اور ''شیعہ عثمانیہ'' بھی کہا جاتا ہے خاتمہ ہو گیا اور پھر دنیا ان کے ناپاک وجود سے جلد ہی پاک ہو گئی۔ چنانچہ علامہ تقی الدین احمد بن علی المعروف بالمقریزی رحمہ اللہ اپنی مشہور و معروف کتاب ''الخطط والآثار في مصر والقاهرة والنيل وما يتعلق بها من الأنهار'' میں لکھتے ہیں:

فلما قتل مروان وانقضت أيام بني أمية ببني العباس في سنة ثلاث وثلاثين ومائة، خمدت جمرة أصحاب المذهب المرواني وهم الذين كانوا يسبون علي بن أبي طالب ويتبرّون منه، وصاروا منذ ظهر بنو العباس يخافون القتل ويخشون أن يطلع عليهم أحد إلا طائفة كانت بناحية الواحات وغيرها، فإنهم أقاموا على مذهب المروانية دهراً حتى فنوا ولم يبق لهم الآن بديار مصر وجود البتة.(2/٣٣٨، طبع بولاق مصر 1271ھ)

جب مروان (الحمار بنی امیّہ کا آخری تاجدار) قتل ہو گیا اور بنی امیّہ کے ایام حکمرانی بنی عباس کے ہاتھوں ۱۳۳ ہجری میں ختم ہو گئے تو اصحابِ مذہب مروانی کی چنگاری بھی بجھ گئی، یہ وہ لوگ تھے جو حضرت علیؓ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ پر تبرا اور سبّ شتم کیا کرتے تھے اور جب سے بنی عباس کا ظہور ہوا ان کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے قتل سے خائف رہنے لگے اور ڈرتے رہتے کہ کہیں کسی کو ان کی اطلاع نہ ہو جائے، ہاں ایک چھوٹی سی جماعت جو "واحات" (مصر کے بالائی مغربی علاقہ) وغیرہ کے اطراف میں تھی وہ ایک مدت تک مروانی مذہب پر جمی رہی۔ بالآخر وہ بھی فنا ہو گئی اور اب دیارِ مصر میں ان کا سرے سے کوئی وجود ہی باقی نہیں۔

مغرب کی پالیسی

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

مغرب جو مشرق میں اپنا سب سے بڑا حریف اسلام اور اہل اسلام کو سمجھتا ہے اور جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" اس نے دو سو سال سے بہت سی علمی تحریکیں مسلمانوں کے خلاف چلا رکھی ہیں اور مستشرقین یورپ کی تمام تر مساعی اسی سلسلہ کے لئے وقف ہیں وہ آئے دن مسلمان قوم کے لئے ایک نیا شاخسانہ کھڑا کرتے رہتے ہیں کبھی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت و کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی حجیت حدیث اور تدوین روایات پر اعتراضات کا طومار باندھتے ہیں، کبھی یہ کوشش کرتے ہیں کہ جو مختلف مکاتب فکر مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ میں پیدا ہوئے ہیں ان کو پھر نئے سرے سے زندہ کر دیا جائے۔ غرض ان مفسدین کا اصل مقصد یہ ہے کہ جس طرح بھی بنے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی جائے، چنانچہ جس طرح مسلمان قوم کے لیے قومیت اور وطنیت کے تحفے

یورپ سے درآمد ہوئے اور دنیائے اسلام کی یکجہتی اور ہم آہنگی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی، اسی طرح یہ ''ناصبیت'' کا تحفہ بھی وہیں سے درآمد ہوا ہے۔ تمام عالمِ اسلام میں یہ ''فتنۂ ناصبیت'' محوِ خواب تھا۔ یورپ کے مستشرقین ہی نے اس فتنہ کو سوتے سے جگایا ہے۔ یہ ڈوزی، دے خوے، حتی، رچرڈ برٹن، گب، ہرتھ، نکلسن، لانس، ڈبلیو منٹگمری وغیرہ ہی تو ہیں جن کی خرافات پر (مجدّدِ ناصبیت) عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں ریسرچ کی بنیاد رکھی ہے۔

برصغیر میں ناصبیت کی تحریک

اور محمود عباسی کی مقبولیت

اور برصغیر ہند و پاک تو ان کے وجود نامسعود سے شروع ہی سے پاک چلا آتا تھا، تاآنکہ حال میں محمود احمد عباسی امروہوی نے ''خلافتِ معاویہ و یزید'' لکھ کر اس فتنہ کو نئے سرے سے ہوا دی اور اس کے مر جانے کے بعد کمیونسٹوں اور منکرینِ حدیث نے موقع سے فائدہ اٹھا کر عباسی کے متبعین کی پیٹھ ٹھونکی اور ان کو ''ناصبیت'' کے مشن کو فروغ دینے پر لگا دیا، چنانچہ اب مختلف ناموں سے انجمنیں قائم ہو گئی ہیں جن کا کام ہی اہل سنت کو راہِ اعتدال سے ہٹانا ہے۔ محمود احمد عباسی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اہلِ سنت میں ناصبیت کا تازہ فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب بہت سے لوگ ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اور یزید کے مقابلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خاطی و غلط کار سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب سے سوائے ضرر کے فائدہ کوئی مرتب نہ ہوا۔ روافض تو اپنی جگہ اور سخت ہو گئے لیکن اہلِ سنت کے اعتدال میں فرق آگیا، بہت سے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں شک کرنے لگے۔ آج تک کسی ایک رافضی کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ وہ عباسی صاحب کی کتاب

پڑھ کر تائب ہو گیا ہو، لیکن اس کے بر خلاف اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی نکلے گی جو اس جھوٹ کے پلندہ کو صحیح سمجھ کر حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے اپنے دلوں کو صاف نہ رکھ سکے۔ اس کتاب نے سادہ لوح عوام نہیں اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کیا ہے جن میں عربی مدارس کے بھی بہت سے فارغ التحصیل شامل ہیں، جن لوگوں کی دسترس موضوع کتاب کے اصل ماخذ تک نہیں وہ اس کو تحقیق اور ریسرچ کا ایک نادر شاہکار سمجھتے ہیں اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اب مسلمان من حیث القوم علوم اسلامیہ سے نابلد ہو گئے ہیں، لہٰذا جو کوئی شخص بھی اپنے کسی غلط نظریے کو ذرا نئے انداز سے بنا کر پیش کر دیتا ہے یہ اس کے ہو جاتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے جو شخص عربی، فارسی کی معمولی عبارتوں کے صحیح ترجمے نہ کر سکے، کتابوں کے غلط حوالے دے، مصنفین کی عبارتوں کو اپنے مفید مطلب بنانے کے لئے غلط معنی پہنائے اور ان میں قطع و برید سے کام لے، ایسے شخص کا پیش کردہ کوئی نظریہ کس درجہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ روافض کے سب و شتم سے لوگ تنگ آئے ہوئے تھے، ایسے میں یہ کتاب شائع ہوئی جس میں حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے موقف پر اس سے کہیں سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انداز میں جرح کی گئی تھی جو روافض کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے موقف کو مجروح کرنے میں عام روش ہے۔ اس لئے رد عمل کے طور پر بہت سے لوگ عباسی صاحب کے اس طرز عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، حالانکہ تمام اہلِ سنت اس پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور جو لوگ ان سے برسر جنگ رہے وہ خطا پر تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کر کے غلطی کی اور وہ خلیفۂ راشد نہ تھے، ان کا بیٹا یزید ظالم و جابر حکمران تھا اور حضرت حسین،

حضرت عبداللہ بن زبیر اور وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جو جنگ حرّہ میں شہید ہوئے اور جنہوں نے یزید کے تسلط واقتدار کو برہم کرنے کی کوشش کی وہ سب حق کے داعی اور خیر کے علمبردار تھے، مگر اس کتاب کی تصنیف صرف ان ہی امور کی تردید کے لئے عمل میں آئی ہے اور اس کے مطالعہ سے اہل سنت کا یہ نقطۂ نظر صریح طور پر غلط معلوم ہوتا ہے اور یہی ناصبیت کا عین منشا ہے۔

ان بحثوں کے چھیڑنے کی ضرورت کیا ہے؟

''یزید'' بھلا آدمی تھا یا بُرا، وہ خلیفہ عادل تھا یا ظالم و جابر فرمانروا، اس کا ایمان پر خاتمہ ہوا یا کفر پر، اس پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا اس نے حکم دیا یا نہیں؟ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے خلاف خروج کر کے بغاوت کی تھی یا ان کا یہ اقدام سراسر شرع کے حکم کے مطابق تھا، یزید نے مدینہ نبوی اور حرم الٰہی کی حرمت کو پامال کیا یا نہیں، صحابہ وتابعین کی ایک خلقت کا اس کے ہاتھوں قتل عام ہوا یا نہیں، یہ اور اس قسم کے دیگر مباحث ظاہر ہے کہ ان کو عملی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں، یہ خالص نظریاتی مسائل ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ بعض لوگ ہماری اس کوشش کو تحسین کی نظر سے نہ دیکھیں اور اس کو مفت کا ضیاع وقت خیال کریں۔

لیکن ایک دوسری حیثیت سے اگر اس کو دیکھا جائے تو ہمارے اس کام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے وہ یہ کہ اگر بالفرض یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''یزید ایک صالح مسلمان اور خلیفۂ عادل بھی تھا'' تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی تاریخ کو محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ الٹا اُس کو مسخ کر دیا، یزید جیسے صالح مسلمان اور خلیفۂ عادل کے کردار کو ایسا گھناؤنا کر کے پیش کیا کہ وہ شیطان مجسم نظر آنے لگا۔

یاد رہے یزید کا دور صحابہ و تابعین کا دور ہے، اس لئے اس دور کی تاریخ کا ایک ایک واقعہ قلمبند کیا گیا ہے، وہ عام تاریخ کی طرح نہیں کہ جس میں سند کا التزام نہیں ہوتا بلکہ وہ محض وقائع نگاروں کی مرہون منّت ہوتی ہے۔

طبقاتِ صحابہ و تابعین پر بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں سارے علم اسماء رجال کا دارو مدار انہی کتبِ طبقات پر ہے اگر یہی کتابیں بے اعتبار ٹھہریں تو پھر حدیث کی ساری کتابوں کو دریا برد کرنا پڑے گا، کیونکہ ان کی صحت و ضعف کا دارومدار ان ہی کتب طبقات پر ہے کہ ان ہی کتب میں راویوں کے احوال مذکور ہیں، اگر یہی بے اعتبار قرار پائیں تو پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص صحابی ہے اور فلاں نہیں، اور فلاں تابعی ہے اور فلاں نہیں، اور فلاں سچا اور لائق اعتبار تھا اور فلاں کذاب اور دجال، جب یزید جیسے خلیفہء عادل کا ان کتابوں میں حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا اور فیصلہ کر دیا گیا کہ ''وہ اس کا اہل نہیں کہ اس کی کوئی روایت قبول کی جائے۔'' چنانچہ حدیث کی تمام کتابیں اس کی روایت سے یکسر خالی ہیں اور اگر کہیں ایک آدھ روایت کسی نے درج بھی کی تو علم اسماء الرجال نے یزید کی نااہلی کا فیصلہ کر کے اس کی روایت کو مردود کر دیا۔

غرض سارے محدثین نے اس غریب سے بالکلیہ قطع تعلق کر لیا اور نہ صرف محدثین بلکہ حاملین ملت کے تمام طبقوں میں خواہ وہ مفسرین ہوں یا متکلمین، فقہاء ہوں یا صوفیاء اس خلیفہ عادل اور صالح مسلمان کو بار نہیں، اور یہ صرف ایک بیچارے یزید کے ساتھ ہوا معلوم نہیں اور اس جیسے کتنے صالحین ہوں گے جو اس ظلم کی چکی میں پس گئے ہوں گے اور ہم ان کو صالحین کی فہرست سے خارج کر کے زمرہ شیاطین میں شمار کرتے ہوں گے اور جس طرح یزید کا تاریخ اسلام نے حلیہ بگاڑا ہے اور اسے ایک ظالم و سفاک، فاسق و فاجر کے روپ میں پیش کیا ہے اسی طرح عین ممکن ہے کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال ان کی تاریخ اور کتب حدیث و طبقات نے کسی شیطان مجسم کو اس کا نقش و نگار ٹھیک کر کے ہمارے سامنے اس کو ولی اللہ کے روپ میں پیش کر دیا

ہو یا اسے صحابی، تابعی اور خلیفہ راشد بنادیا ہو، کیونکہ جب یزید کے ساتھ ایسا ظلم و ستم تاریخ کے ہاتھوں ہوا تو پھر دوسروں پر کیوں نہیں ہو سکتا، اور یہ مان لینے کے بعد پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی تاریخ سے ہاتھ دھو کر خود اسلام کے اثر پر کلام کیا جائے اور اس کی ساری تعلیم کو غیر محفوظ قرار دیا جائے۔ یہی منکرین حدیث کی اصل غرض و غایت اور ملحدین کا اصل منشا ہے اور بے دین فتنہ پرور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں افتراق اور اشتعال پیدا ہو کر قتل و قتال کا بازار گرم ہو۔ افسوس ہے کہ بعض نادان مولوی جن کو تاریخ کا سرے سے ذوق نہیں ان بے دینوں کی اس سازش کا شکار ہو کر یزید کی حمایت میں سر گرمی دکھا رہے ہیں اور اس طرح گویا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔

یزید کی شخصیت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ علماء اہل سنت میں اس پر تو اتفاق ہے کہ وہ فاسق و ظالم تھا البتہ اختلاف ہے تو اس بارے میں کہ اس کو کافر قرار دیا جائے یا نہیں اور اس پر لعنت کرنا روا ہے یا اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔ اب ایسے شخص کو جنتی بتانا اور اس کی تعریف کے گن گانا ضلالت نہیں تو اور کیا ہے؟

محمود احمد عباسی اس فتنہ کا سربراہ ایک ناخدا ترس اور دین بیزار آدمی تھا، جس زمانہ میں وہ چینی سفارت خانہ میں ملازم تھا اس نے اس فتنہ کی داغ بیل ڈالی اور اب رفتہ رفتہ یہ فتنہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

محمود احمد عباسی نے کتاب "خلافت معاویہ و یزید" لکھ کر اس فتنہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے ملک میں ایک تازہ فتنہ "ناصبیت" کا پیدا ہو گیا ہے جس سے اب تک ہندو پاک کی سرزمین یکسر پاک تھی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا

ہے کہ ملک کا اچھا خاصہ سنجیدہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس فتنہ کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا اور اب تو بہت سے حلقوں میں اس کو ایک تاریخی ریسرچ کا درجہ حاصل ہے۔

عباسی کی کتاب کے مآخذ

یہ کتاب سر تا سر فریب، خداع، تلبیس اور کذب و افتراء کا مرقع ہے، اس نام نہاد تاریخی ریسرچ کے چار مآخذ ہیں:

(۱) مستشرقین کی تصریحات۔ جن کو مؤلف جا بجا آزاد اور بے لاگ محققین کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور ہر باب میں ان کے اقوال کو قول فیصل سمجھتے ہیں۔

(۲) شیعہ مؤرخین جن کے کذب و افتراء کا جا بجا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود مولف ہر جگہ ان سے اپنے مطلب کی بات کہیں ان کی عبارت میں قطع و برید کر کے اور کہیں بغیر اس کے ہی لے لیتے ہیں۔

(۳) بعض وہ مصنفین جن پر ناصبیت کا الزام ہے اور وہ اہلِ بیت سے انحراف رکھتے ہیں۔

(۴) خود اپنی دماغی اُپج جس میں مولف بڑی دور دور کی کوڑی لاتے ہیں، اور ایسی ایسی بات اپنے دل سے گھڑتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران اور ششدر رہ جائے۔

غلط بیانی اور بدترین تحریف

ہمارا دعویٰ ہے کہ اہل سنت میں سے کسی محقق عالم کے قول کو کہیں بھی اثبات مدعا کے لئے مؤلف نے اپنے اصلی رنگ میں پیش نہیں کیا بلکہ ہر جگہ ابلہ فریبی سے کام لے کر ''ناصبیت'' کی داغ بیل ڈالی ہے، پھر تاریخی دیانت کا یہ عالم ہے کہ مؤلف کو کسی کتاب کا صریح غلط حوالہ دینے میں بھی ذرا باک نہیں۔ مثال کے طور پر کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' (ص ۴۹، طبع اول و دوم، و ص ۶۳ طبع سوم ۲، و ص ۱۰۰ طبع چہارم) میں یزید کے بیان مناقب کے سلسلے میں اس عربی کو نقل کرنے کے بعد ''وقد کان یزید

فيه خصال محمودة من الكرم والحلم والفصاحة والشعر والشجاعة إلخ "جو "تاریخ الاسلام ذہبی" ص ۹۳، ج ۳ کا حوالہ دیا گیا ہے محض غلط ہے۔

اسی طرح ان کے خداع و تلبیس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ وہ کسی عبارت کو اپنے مفید مطلب بنانے کے لئے کس ڈھب سے کام لیا کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی بے نظیر کتاب "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" میں حضرات خلفاء ثلاثہ ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی صحتِ خلافت پر بڑی عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور اس موضوع کے ہر گوشہ کو اتنا واضح اور روشن کیا ہے کہ اس کتاب کو بغور پڑھ لینے کے بعد منصف مزاج کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ ان حضرات کو بلا کسی ادنیٰ تردد کے دل سے خلیفہ راشد تسلیم کر لے۔ "ازالۃ الخفاء" کی فصل ہفتم کے مقصد ثانی میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے خلفاء ثلاثہ کی خلافت پر دلائل عقلی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آنحضرت ﷺ نے کسی خلیفہ کے متعلق تصریح کی ہے تو وہ خلیفہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی ہو سکتے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، اور پھر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر اور حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔ اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ یہ بات تو بہ تواتر معلوم ہے کہ صدیق و فاروق و ذوالنورین رضی اللہ عنہم سب کے سب ملک کے حاکم اور فرمانروا تھے، اور سب لوگوں کا ان حضرات کے ساتھ وہی معاملہ تھا جو رعیت کا ایک خلیفہ کے ساتھ ہوتا ہے، ہر شخص ان حضرات کو "یا خلیفۃ رسول اللہ" اور "یا امیر المؤمنین" ہی کہہ کر مخاطب ہوتا ہے۔ اتنی بات موافق مخالف سب کو معلوم ہے۔

لہٰذا خلافت کا ایک جزو یعنی فرمانروائی تو صرف ان ہی کی ثابت ہوئی غیر کی نہیں، اس لئے ان کے عہد میں ان حضرات کے علاوہ کسی اور کو خلافت سے موسوم کرنا غلط ہے۔ اب سُنّی اور شیعہ کی بحث صرف اس میں رہی کہ یہ حضرات اپنی فرمانروائی میں مطیع

تھے یا عاصی، اور شارع (آنحضرت ﷺ) نے ان ہی حضرات کے حق میں خلافت کی تصریح کی تھی یا کسی دوسرے کے حق میں، یا پھر سرے سے کسی شخص کے بارے میں آپ ﷺ نے خلافت کی کوئی تصریح ہی نہیں فرمائی تھی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر ان ہی حضرات کے بارے میں شارع کا نص تھا اور یہ حضرات اس نص کے موافق خلیفہ ہوئے تو فبہا، ورنہ اگر شارع کا نص تو کسی دوسرے شخص کے حق میں تھا اور یہ لوگ محض اپنی سینہ زوری سے خلیفہ بن بیٹھے اور عاصی ٹھہرے تو اس طرح سے ان حضرات کے درپے خلافت ہونے میں بہت سی خرابیاں لازم آتی ہیں۔ جس کی تفصیل خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

> "(۱) تدلیس در کلام رب العزت جلّ وعلاء وکلام افضل انبیاء علیہ افضل الصلوات والتسلیمات، (۲) وکذب متواترات مرویۃ از صادق و مصدوق، (۳) واجماعِ امت مرحومہ بر ضلالت، (۴) وارتفاعِ امن از احکام شرع، (۵) وعدمِ قیامِ حجتِ تکلیف بچیزی از احکام بر ہیچ یک از امت (۶) ومخالفتِ حکم عقل (۷) صراع، تناقض در مقصود شارع۔"

پھر بالترتیب ان ساتوں خرابیوں کے لازم ہونے پر شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو اہل علم کے دیکھنے کے لائق ہے۔ سب سے پہلے "تدلیس در کلام رب العزت" کو لیا ہے یعنی جس صورت میں ہم یہ فرض کرلیں کہ یہ حضرات خلافت کے باب میں عاصی تھے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کلام الٰہی بھی "تدلیس"[31] سے مبرا نہیں کہ اس قسم کے معصیت شعاروں کے عیب کو بھی قرآن نے سرے سے چھپایا اور ذرا ظاہر نہ ہونے دیا۔

31۔ تاجر جب کپڑا بیچتے وقت کپڑے کا عیب چھپائے اور اسے ظاہر نہ کرے تو اس کو عربی میں "تدلیس" کہتے ہیں۔

پھر اسی سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قرآن مجید کی مختلف آیات کو جو ان حضرات کی فضیلت پر دال ہیں پیش کرتے ہوئے حسب ذیل آیت بھی درج کی ہے:

قل للمخلفين من الأعراب ستدعون إلى قوم أولي بأس شديد تقاتلونهم أو يسلمون. فإن تطيعوا يؤتكم الله أجر حسناً وإن تتولوا كما توليتم من قبل يعذبكم عذاباً أليماً.

آپ پیچھے رہ جانے والے اعراب (بادیہ نشینانِ عرب) سے کہہ دیجئے کہ آئندہ تم کو ایک ایسی قوم کی طرف بلائیں گے جو بڑے سخت لڑنے والے ہوں گے تم ان سے لڑتے رہو یا وہ مسلمان ہو جائیں گے، پھر اگر حکم مانو گے تو اللہ تم کو اچھا بدلہ دیگا، اور اگر پلٹ جائو گے جیسے پہلی بار پلٹ گئے تھے تو تم کو ایک دردناک عذاب دے گا۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"وعدہ فرمود کہ در زمان مستقبل البتہ داعی خواہد بود اعراب را بسوی جہاد کفار، و دعوت ابن داعی سببِ وجوب قبول دعوت خواہد بود پس اگر قبول نکنند معاقب شوند، وایں لازم بین استخلاف حق استِ و دعوت جہاد اشہر و اعظم صفات خلیفہ است۔

وخالی نیست از آنکہ داعی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است یا خلفائے ثلاثہ یا مرتضی یا بنی امیہ یا بنی عباس۔ و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم البتہ داعی نبودند زیرا کہ خدای تعالی می فرماید لَنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ أَبَدًا وَّلَنْ تَقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا واین آیت در قصہ حدیبیہ نازل شدہ است، وغزوات آنحضرت بعد حدیبیہ محصور و معلوم است بعد ازاں بغزوہ خیبر برآمدند و کسی از اعراب را دعوت نمودند، و بغزوہ فتح مکہ و حنین این قتال بقوم اولی باس نبود زیرا کہ این کلمہ دلالت می کند بر مغائرت این قوم با قوم اول کہ قریش و حوالی ایشاں باشند و ظاہر از اولی باس شدید آنست کہ بہ نسبت قریش شدت باس داشتہ باشند و این معنی در غیر روم

وعجم یافتہ نشد، ونہ مرتضی زیرا کہ مقاتلات وے رضی اللہ عنہ برائے طلب خلافت بود ﷺ بجہتِ اسلام، تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ دلالت می کند بر آنکہ آن دعوت کفار است بجہتِ اسلام، وبنو امیہ وبنو عباس دعوت نکردند اعراب حجاز بقتال کفار کماھو معلوم من التاریخ قطعاً۔
ودعوت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسوی قتال اہل شام و عراق بود، ودعوت فاروق نیز بقتال عراق وشام ومصر بود ودعوت ذی النورین بقتال اہل خراساں وافریقہ ومغرب واقع شد کما ھو مبسوط فی التاریخ پس دعوت ایشان واجب الامتثال بود، این صفت خلیفہ حق است، وچوں حقیقت ایشاں در دعوت بجہاد روم وعجم ظاہر شد جمیع احکام ایشان واجب الامثال باشند زیرا کہ متکلمان بکلمہ ﷺ اسلام مجمع اند بر دو قول جمعے اثبات وجوب انقیاد ایشان کردہ اند در جمیع احکام وجماعۃ نفی وجوب انقیاد ایشاں میکنند در جمیع احکام فلما بطل الثانی تعین الاول۔“

(ازالۃ الخفاء ۱/277-278، طبع بریلی)

اللہ نے وعدہ فرمایا کہ بالیقین آئندہ زمانے میں اعراب (بادیہ نشینانِ عرب) کو جہاد کفار کی طرف ایک دعوت دینے والا اٹھے گا اور اسی داعی کی دعوت پر اس کی دعوت کا قبول کرنا واجب ہوگا۔ پھر اگر اس کی دعوت کو قبول کرلیں گے تو ثواب پائیں گے ورنہ عقاب میں گرفتار ہوں گے اور یہ چیز خلافت حقہ کا لازم بین ہے (یعنی اس کی دعوت پر لبیک کہنا) کہ دعوتِ جہاد تو خلیفہ کی مشہور ترین اور عظیم ترین صفات میں سے ہے۔

اب یہ بات چند صورتوں سے خالی نہیں یا تو یہ داعی خود آنحضرت ﷺ ہو سکتے تھے یا خلفاء ثلاثہ یا حضرت مرتضیٰ، یا بنی امیہ، یا بنی عباس اور آنحضرت ﷺ تو بالیقین یہ داعی نہ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ (آنحضرت ﷺ) کی زبانی ان لوگوں کو فرماتا ہے (تم کبھی میرے ساتھ نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ کسی دشمن سے قتال کرو گے) یہ

آیت صلح حدیبیہ میں نازل ہوئی اور حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ کی جتنی جنگیں ہیں وہ معلوم و متعین ہیں چنانچہ حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت ﷺ غزوۂ خیبر تشریف لے گئے تو آپ نے اعراب میں سے کسی کو اس غزوہ میں شرکت کی دعوت نہ دی اور غزوۂ فتح مکہ اور حنین میں یہ قتال ایسی قوم سے نہ تھا جو ''اولی باس'' (سخت جنگجو) ہو کیونکہ یہ لفظ تو اس بات کو بتاتا ہے کہ اس قوم میں اور پہلی قوم میں جو قریش اور ان کے آس پاس کے لوگ تھے، مغائرت ہو، اور ''اولی باس شدید'' کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ ایک ایسی قوم ہونی چاہئے جو قریش کی بہ نسبت شدت باس (سخت جنگجوئی) رکھتی ہو اور یہ بات سوائے روم و عجم کے اور کسی کو حاصل نہ تھی اور مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی اس قتال کے داعی نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی جنگیں اللہ ان سے راضی ہو، طلب خلافت کے لئے تھیں نہ کہ مسلمان بنانے کے لئے اور ''تقاتلونهم أو يسلمون'' (ان سے جنگ کرتے رہو گے یا وہ مطیع اسلام ہو جائیں گے) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ دعوت جنگ دراصل کفار کے اسلام لانے کے لئے تھی اور بنی امیہ اور بنی عباس نے بھی ''اعراب حجاز'' کو قتال کفار کی دعوت نہیں دی جب کہ تاریخ سے قطعی طور پر معلوم ہے۔

البتہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت اہل شام و اہل عراق سے قتال کی تھی اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعوت عراق، شام اور مصر سے قتال کی اور حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کی دعوت اہل خراساں، اہل افریقہ اور اہل مغرب سے قتال جیسا کہ تاریخ میں مفصل مذکور ہے، لہٰذا ان حضرات کی یہ دعوت واجب التعمیل تھی اور تعمیل حکم کا واجب ہونا یہ خلیفہ حق کی صفت ہے اور جب روم و عجم کی طرف دعوت جہاد میں ان حضرات کا برسرِ حق ہونا معلوم ہو گیا تو ان کے تمام احکام واجب

التعمیل ٹھہرے، کیونکہ تمام کلمہ گو صرف دو باتوں کے قائل ہیں ایک جماعت نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ تمام احکام میں ان حضرات کی فرمانبرداری واجب ہے اور دوسری جماعت نے ان کے سب حکموں میں ان کی فرمانبرداری کی نفی کی ہے۔

عباسی صاحب نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس مذکورۃ الصدر عبارت میں سے خط کشید الفاظ کا صرف ایک ذرا سا جملہ لیکر اور اس کے بعد کی عبارت کو یکسر حذف کر کے جس کارستانی سے اس عبارت کو بُرے معنی پہنائے ہیں وہ تحریف معنوی کی بدترین مثال ہے۔ اسی طرح کے قطع و برید کی بے شمار مثالیں آگے چل کر آپ کتاب میں جابجا ملاحظہ فرمائیں گے۔

مؤلف کو حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے لختِ جگر حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) سے کس قدر کد ہے اور اپنے ممدوح یزید بن معاویہ سے کس قدر عقیدت۔ جناب مؤلف کی تمام تر کوشش صرف اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ جس طرح بھی بن سکے حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو تو مورد طعن والزام بنایا جائے اور یزید اور اس کے کارندوں کی خوبیوں کو اُجاگر کیا جائے تاکہ ان کی برائیوں پر پردہ پڑ جائے۔

اس مقصد مذموم کے حصول میں مؤلف کے شغف کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ بات مستشرقین یہود و نصاریٰ کی ہرزہ سرائی کے نقل کرنے سے حاصل ہوتی ہے تو وہ اسے اس آب و تاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ لوگ جھوٹ کو سچ باور کرنے لگیں اور جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کی غلط تعبیر سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو وہ بڑے اطمینان سے یہ بھی کر گزرتے ہیں۔ اس سلسلہ مں انہیں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی ''تاریخ الاسلام'' کا غلط حوالہ دینے میں کوئی باک ہے نہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی عبارت کے اندر قطع و برید کرنے میں ذرا تامل۔ تاہم حق بات کہیں چھپائے چھپتی

ہے۔ اس ساری کوشش وکاوش کے باوجود مؤلف اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے، بلاشبہ جب وہ انکار کرنے پر آتے ہیں تو مسلمان مورخین کو کذابین کی صف میں داخل کئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ ایک مقام پر اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امیر یزید کے ہم جلیس زہاد و عباد امت تھے، علماء و فضلاء تھے، طلاب و شیدائیانِ علم تھے جہاں....... اکثر قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں آتیں نہ بقول کذابین غنا و موسیقی کی۔"

(خلافت معاویہ ویزید ص، طبع اول ودوم، وص طبع سوم، طبع چہارم)

لیکن اس کا کیا علاج کہ اسی کتاب میں وہ دوسرے مقام پر اپنے حافظہ کو کھو بیٹھے اور خود ہی اپنے ممدوح کی تعریف میں اس طرح داد صداقت دینے لگے کہ:

"وہ خود شاعر تھا، موسیقی کا ذوق رکھتا تھا، اہل ہنر اور شعراء کا قدردان تھا اور ادب و آرٹ کا مربی و سرپرست تھا۔"

عجب تماشا ہے کہ جناب مؤلف ایک طرف تو یہ فرماتے جاتے ہیں کہ: "یزید کے ہم جلیس زہاد و عباد امت تھے، علماء و فضلاء تھے، طلاب و شیدائیان علم تھے۔" مگر دوسری طرف خود ہی سلامہ کا قصہ بھی نقل کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یزید کے جلیس و ندیم دراصل داستان سرا تھے اور ان میں بھی صنفِ نازک کو خاص مقام حاصل تھا، اسی طرح وہ اپنے ممدوح کے اوصاف حمیدہ، حلم و کرم اور تواضع و متانت کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے جاتے ہیں اور خود ہی اس کے متعلق ان واقعات کا بھی انبار لگا دیتے ہیں جن سے ان کے ڈھول کا پول فوراً کھل جاتا ہے۔

یہاں یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ جناب مؤلف کی منقولہ عبارات میں اہل علم کو املا اور ترجمہ کی جابجا غلطیاں نظر آئیں گی اس سے غلط فہمی نہ ہو کیونکہ ہم نے اس تنقید میں مؤلف کی ہر غلطی پر تنبیہ نہیں کی ہے۔ ہمارا مقصد تو مؤلف کی صرف ان اغلاط کو واضح کرنا ہے جن کی بنا پر انہوں نے تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی ناکام

کوشش کی ہے۔ باقی وہ عام غلطیاں جو ان کی علمی بے بضاعتی پر دال ہیں ان کو ہم نے قصداً نظرانداز کر دیا ہے۔

عباسی کی کتاب کی شہرت کا سبب

عباسی کی کتاب کے ساتھ شروع ہی سے کچھ ایسا معاملہ ہوا کہ اسے قدرتی طور پر غیر معمولی شہرت حاصل ہوگئی اول تو سکندر مرزا کے منحوس دور میں جو شیعہ گردی ہوئی اس نے کتاب کے لئے قبولیت کی فضا پیدا کی کیونکہ اس کتاب کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ لوگ دنیا طلب نہیں جن کو شیعان علی دنیا طلب سمجھتے ہیں بلکہ اقتدار کے خواہاں تو اصل میں وہ تھے جنہیں شیعہ دنیا آج بھی امام معصوم سمجھتی ہے، اس نئے انکشاف کو جس سلیقہ کے ساتھ مصنف نے پیش کیا لوگوں نے بمقتضائے کل جدید لذیذ خواہ مخواہ اسے پڑھنے کی کوشش کی۔

ادھر بعض جذباتی لوگوں نے فوراً جوش میں آکر اس کی ضبطی کی تحریک کی اور کراچی کے ایڈمنسٹریٹر نے جیسے ہی اس کا ضبطی کا حکم صادر کیا کتاب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، پھر کیا تھا مقدمہ چلا کتاب بحال ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ یہ دیکھ کر ایک طرف تو کچھ تاجر حضرات میدان میں نکلے اور دوسری طرف محض نرے جذباتی جن کا کام ہی گالیاں دینا اور لعنت کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب مذکور کے رد پر رد لکھے جانے لگے لیکن سچ پوچھو تو ایک بھی ان کی کتاب کا جواب نہیں تھا۔

اسی ہنگامۂ دار و گیر میں کچھ ایسے لوگ بھی اٹھے جو واقعی اس کا بے ضرر تدارک کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے کام کی اہمیت کا پورے طور جائزہ نہیں لیا اور اپنی کوشش کو اس سلسلہ میں کافی سمجھا۔ اس لئے ابھی تک ایک کتاب بھی منظر عام پر نہیں آئی جس میں واقعی طور پر عباسی صاحب کی اس نام نہاد تحقیقات کا بالکلیہ تار و پود بکھیر کر

رکھ دیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کتاب میں بھی نہ تو(۱)ازروئے تقویم وکلیۂ حساب واقعہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے دن اور تاریخوں کی صحت وعدم صحت سے اعتنا کیا گیا ہے،(۲)نہ منزل کربلا کی بابت کوئی بحث ہے،(۳)نہ بنی امیہ وبنی ہاشم کی قرابت اور رشتہ داریوں پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، حالانکہ یہ تینوں ہی بحثیں اس کتاب میں سب سے زیادہ اہم ہیں، پھر قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص کا مسئلہ محاربین علی رضی اللہ عنہ کی صحیح پوزیشن، انعقاد خلافت اور خروج کے حدود وشرائط پر بھی کسی کتاب میں اس طرح تفصیل سے بحث نہیں کی گئی جس سے مسئلہ کی اصل حقیقت سامنے آتی۔

اس طرز عمل سے کتاب کی اہمیت اور بڑھ گئی اور بعض نادانوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اب اس کتاب کا جواب ہی ناممکن ہے۔ ایسے میں پھر اس کتاب کو ضبط کرلینا اس کی اہمیت کو اور بڑھا دینا ہے اور پھر اس کی ضبطی کی یہ وجہ تو نہایت ہی عجیب ہے کہ "اس کتاب کا مواد پاکستان کے شیعہ و سنی فرقوں میں منافرت اور دشمنی پیدا کرسکتا ہے" کیونکہ سب جانتے ہیں اس کتاب کی جتنی مخالفت شیعہ فرقہ کی طرف سے ہوئی ہے اس سے زیادہ سنیوں نے کی، اس کے رد میں بھی سنیوں نے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔

عباسی صاحب کی اس کتاب میں تین بحثیں خاصی اہم سمجھی جاتی ہیں اور انہی مباحث نے اس کتاب کو عام لوگوں کی نظروں میں ریسرچ کی حیثیت دیدی ہے، حالانکہ حقیقت میں اس کی حیثیت ایک مغالطہ اور دھوکے سے زیادہ نہیں۔ یہ تینوں بحثیں علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

(۱)حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مدینہ منورہ سے چل کر مکہ معظمہ آنے اور وہاں سے روانہ ہو کر کربلا میں پہنچنے اور شہادت پانے کی جو تاریخیں اور دن مؤرخین نے بیان کئے ہیں وہ ازروئے تقویم وکلیۂ حساب صحیح نہیں ہیں۔

(۲) مکہ معظمہ سے لیکر کربلا تک منازل سفر کا نقشہ اور ان کی مسافت کی جو تفصیل کتب جغرافیہ اور سفر ناموں میں مذکور ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۱۰/ محرم سے پہلے کسی طرح کربلا میں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے، لہٰذا ان کے بارے میں منع آب و دیگر مظالم کے بیان کی حیثیت ایک خود ساختہ داستان سے زیادہ نہیں۔

(۳) کتب انساب میں بنی ہاشم اور بنی امیہ کے ان باہمی مناکحات اور ازدواجی تعلقات کی تفصیل موجود ہے جو واقعات شہادت کے بعد قائم ہوئے یہ تعلقات جس کثرت سے کتب انساب میں مذکور ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کسی طرح ان واقعات کو باور نہیں کیا جاسکتا ہے جو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں مورخین عام طور پر بیان کرتے چلے آئے ہیں۔

ان تینوں مباحث کے سلسلہ میں ہم ابھی تقویم کی بحث پر پہنچے ہی تھے کہ کتاب ضبط ہو گئی۔ منازل کے بعد مسافت اور طے مراحل کے سلسلہ میں ضمناً ہم نے اتنا کافی لکھ دیا ہے کہ جس سے اس بارے میں مؤلف کی ساری تحقیقات کا بھرم کھل جاتا ہے۔ قرابت اور مناکحات کی بحث میں مؤلف نے اگرچہ کتاب کے بہت سے صفحات سیاہ کئے ہیں تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کی صلبی اولاد میں باہمی رشتہ مناکحت کو ثابت کرنے میں وہ پھر بھی ناکام ہی رہے۔

عباسی صاحب کا دعویٰ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعات شہادت کے سلسلہ میں مؤرخین نے جو دن اور تاریخیں بیان کی ہیں وہ محض غلط ہیں کیونکہ وہ ازروئے تقویم و کلیۂ حساب صحیح نہیں۔

فرنگیوں کے دورِ اقتدار سے پہلے ہمارے یہاں سنہ ہجری نبوی کا عام رواج تھا اور روزمرہ کی زندگی میں تمام چھوٹے بڑے واقعات کے سلسلہ میں ہم اسی سنہ کے ماہ و تاریخ کو استعمال کیا کرتے تھے، چنانچہ اسی دستور کے مطابق تمام مسلمان مؤرخین

واقعہ نگاری کے سلسلہ میں ہر دن کی وہی تاریخ قلمبند کرتے تھے جو اس روز اُن کے یہاں رویت ہلال کے شرعی ثبوت کی بنا پر ہوتی تھی، لیکن فرنگیوں کے عہد اقتدار میں ہمارے ملک میں سنہ عیسوی میلادی کا اتنا رواج ہوا کہ اس نے روزمرہ کی زندگی میں وہی جگہ لے لی جو اس سے پہلے ہمارے سنہ ہجری نبوی کی تھی اور اسی انقلاب کا یہ اثر ہے کہ ہمارے مصنفین جب گذشتہ واقعات کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو پہلے دن اور تاریخ کا تعین سنہ مسیحی سے کرتے ہیں پھر اگر ضرورت ہوتی ہے تو کسی تقویم کی مدد سے جو اسی کلیہ حساب پر مبنی ہوتی ہے جو سنہ مسیحی میلادی کے اعتبار سے دن اور تاریخ کے استخراج کے لئے وضع کیا گیا ہے، سنہ ہجری نبوی کے دن اور تاریخ کو مطابق کر دیتے ہیں۔ اسی طرز عمل سے عباسی صاحب کو یہاں تک غلط فہمی ہو گئی کہ مسلمان مؤرخین نے بیان واقعات کے سلسلہ میں جس دن اور تاریخ کا ذکر کیا ہے اگر وہ اس تقویم اور کلیۂ حساب کے مطابق نہ ہوں تو قطعاً غلط ہیں، اسی غلط فہمی میں انہوں نے بہت سے مسلمہ تاریخی حقائق کا نہایت شد و مد سے انکار کیا ہے جو سراسر ان کی نادانی اور علم تقویم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

سوائے اسماعیلی شیعوں کے ساری دنیا کے مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اسلام میں ماہ و سال کا آغاز رؤیتِ ہلال سے ہوتا ہے اور رؤیتِ ہلال میں اختلافِ مطالع اور دیگر اسباب سماویہ کی وجہ سے مختلف ممالک میں اختلاف کا واقع ہونا ایک قدرتی امر ہے، اس لئے رویتِ ہلال کی کوئی ایسی تقویم تیار کرنا ممکن نہیں جو تمام دنیا کے لوگوں کے لئے یکساں کام دے سکے اور اس کی بنا پر تاریخوں کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ اول تو اربابِ فن کے لئے رویتِ ہلال کا قطعی فیصلہ مشکل اور پھر ظن و تخمین سے کام لے کر رویت کا حساب لگایا بھی جائے تو قاعدہ کے لحاظ سے ہر عرض البلد اور ہر طول البلد کی علیحدہ علیحدہ تقویمیں تیار کرنی پڑیں گی، تب جا کر کہیں اندازہ درست ہو سکتا ہے۔ اگرچہ قطع و یقین سے رویت کے بارے میں کچھ کہنا اب بھی مشکل ہے، لیکن کتاب

"خلافت معاویہ و یزید" کے مؤلف جناب محمود احمد عباسی نے تقویم کا حساب سمجھے بغیر انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ "تقویم ہجری و عیسوی" کو سامنے رکھ کر جو جرمن مستشرق ایڈورڈ ماہیلے کی تقویم کی مدد سے تیار کی گئی ہے، واقعاتِ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں مؤرخینِ اسلام کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کی تکذیب شروع کر دی، حالانکہ پہلے انہیں یہ ثابت کرنا چاہئے تھا کہ یہ تقویم رویت ہلال پر مبنی ہے اور پھر یہ کہ اس میں حجاز و عراق کو مطلع کا اعتبار کیا گیا ہے تب جا کر پھر اس کے اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کرتے، لیکن ان کی بے لاگ ریسرچ انہیں اس امر پر کس طرح آمادہ کر سکتی تھی، وہ ٹھہرے مستشرقین کے دلدادہ و شیفتہ، جب کسی مستشرق نے کوئی بات کہہ دی پھر وہ ان کے نزدیک پتھر کی لکیر ہے کیونکہ مستشرقین سے عقیدت ختم ہو تو یہ بات ان کی سمجھ میں آئے کہ ایڈورڈ ماہیلے کی جس تقویم پر انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے وہ خیر سے رؤیت ہلال کے حساب پر مبنی ہی نہیں ہے حجاز و عراق کے مطلع کا اعتبار تو اس میں کیا ہوتا، ویسے یہ بات اتنی واضح ہے کہ اگر وہ ذرا بھی غور کریں گے تو خود پکار اٹھیں گے کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اس وقت "ناصبیت" کے پرچار کے لئے پاکستان میں ہر جگہ مسلسل کام ہو رہا ہے اور افسوس یہ ہے کہ اس فتنہ کی لپیٹ میں عربی مدارس بھی آ رہے ہیں، یونیورسٹی اور کالج کے شعبۂ تاریخ کے اساتذہ بھی اور بعض عوامی واعظ بھی اس فتنہ کی زد میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو عربی نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اصل عربی ماخذوں سے رجوع نہیں کرتے تاکہ جھوٹ سچ معلوم ہو کر اصل حقیقت سامنے آ جائے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ناصبیت کے پرچار کو شیعہ مروانیہ نے تو اپنی بدعت کی اشاعت کے لئے مستقل ادارے بنا رکھے ہیں اور سارے ذخیرہ احادیث اور

تاریخ اسلام کے اثرات کو ملیامیٹ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، مگر اہل سنت و جماعت کہ صحابہ اور خاندانِ رسالت دونوں کی تعظیم و توقیر ان کا جزو ایمان ہے وہ اس فتنہ کے سدّباب کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ غرض محمود احمد عباسی صاحب نے اپنی اس کتاب میں تحقیق و ریسرچ کے نام پر جس طرح خداع و تلبیس سے کام لے کر ناصبیت کی داغ بیل ڈالی ہے، اس نے بہت سے لوگوں کو اس فتنے میں مبتلا کر دیا ہے، لہٰذا ہمارا ارادہ ہے کہ ہر ماہ ''بینات'' میں سولہ صفحات اس کتاب کا علمی جائزہ لینے کے لئے وقف کر دیئے جائیں اور جب یہ تنقید مکمل ہو جائے تو اس کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے اور اس کا نام رکھا جائے ''ناصبیت تحقیق کے بھیس'' میں۔

محمد عبدالرشید نعمانی

جمادی الثانیہ ۱۳۸۲ھ

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمين، والعاقبة للمتقين، ولا عدوان إِلَّا على الظالمين، والصَّلاةُ والسَّلام على رسوله محمدٍ سيدٍ الأنبياء والمرسلين، وعلى آله الطيّبين الطاهرين، وأصحابه الهداة المهتدين، وسائر أتباعه أجمعين-

أما بعد!

ضبط کروں میں کب تک آہ
چل رے خامہ بسم اللہ

زمانے کا انقلاب بھی عجب شے ہے، ہزار برس کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں مسلمانوں کو کیسا عروج نصیب فرمایا تھا، انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ تھا جس میں امّتِ مسلمہ کو امامتِ اقوام کا منصب حاصل نہ تھا۔ دنیوی علوم و فنون کا تو ذکر ہی کیا اغیار کو اپنے دینی اور مذہبی علوم کے لئے بھی ہمارے ہی آستانہ کی جبہ سائی کرنا پڑتی تھی۔

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری
اول بشگوں کرد طواف قفسِ ما

مشہور مورخ علامہ قاضی ابن خلکان رحمہ اللہ اپنی کتاب ''وفیات الاعیان'' میں شیخ ابوالفتح موسیٰ بن یونس المتوفی ۶۳۹ھ کے ترجمہ میں جن کو دربارِ علم سے کمال الدین کا لقب عطا ہوا ہے، یوں رقمطراز ہیں:

وكان أهل الذمة يقرؤون عليه التوراة والإنجيل و شرح لهما هذين الكتابين شرحاً يعترفون أنهم لا يجدون من يوضحهما لهم مثله.

اور ذمی لوگ (یہود و نصاریٰ) ان سے تورات وانجیل پڑھا کرتے تھے
موصوف نے ان دونوں فرقوں کی خاطر ان دونوں کتابوں کی ایسی
شرح کی ہے جس کے بارے میں یہ لوگ معترف ہیں کہ ان کی طرح
سے ان دونوں کتابوں کی شرح کرنے والا اپنے لئے ان کو نہیں ملتا۔

یہ فسانہ نہیں تاریخی حقائق ہیں، علامہ کمال الدین مذکور سے قاضی ابن خلکان کی بارہا ملاقات ہوئی ہے۔ قاضی صاحب کے والد سے ان کے بڑے گہرے مراسم اور دوستانہ تعلقات تھے اس لئے قاضی صاحب موصوف نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے چشم دید لکھا ہے مگر

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

زمانے کو بدلتے دیر نہیں لگتی، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ.

اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔

آخر تاریخ نے اپنا ورق اُلٹا، دنیا بدلی اور حالات دگرگوں ہوگئے، فاتح مفتوح ہوئے، مخدوم خادم بنے اور امام نے ماموم کی جگہ سنبھالی۔ اللہ اکبر! کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس قوم کے آسمانی علوم نے دوسروں کے آسمانی علوم کو منسوخ کر دیا تھا اب وہ اس درجہ گرچکی ہے کہ نہ صرف دنیوی علوم میں غیروں کی محتاج ہے بلکہ خالص اپنے علوم ملّیہ کی ریسرچ اور تحقیقات میں بھی دوسروں ہی کی دستِ نگر اور ان ہی کے خوانِ علم کی زلہ ربا ہے۔

آج بیشتر جامعات (یونیورسٹیوں) میں اسلامی علوم کا وہ کونسا شعبہ ہے کہ جس کے صدر نے یورپ یا امریکہ کے کسی یہودی یا نصرانی مستشرقین کے آگے زانوے شاگردی طے نہ کیا ہو یا وہ اپنی کسی علمی ریسرچ و تحقیقات میں ان مستشرقین کا مرہونِ

منت نہ ہو۔ دوسروں کے علم و تحقیق سے فائدہ اٹھانا کوئی بری بات نہیں لیکن اپنے فکر و نظر کو مغضوبین (مستشرقین یہود و نصاریٰ) کے بالکلیہ تابع بنا دینا ایسا قبیح جرم ہے جو کسی طرح قابل معافی نہیں۔ مستشرقین کے یہ تلامذہ دینی اور علمی نقطۂ نظر سے اس قدر پس ماندہ ہیں کہ ان میں آزاد مطالعہ اور تحقیقات کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں ان کی اکثریت اوّلاً تو اصل اسلامی ماخذوں سے بے بہرہ ہے اس لئے اس کی رسائی مستشرقین کی تصانیف سے آگے نہیں کہ ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (یہی ان کا مبلغ علمی ہے) اور جو معدودے چند افراد ان میں عربی جانتے بھی ہیں تو انہیں علومِ اسلامیہ میں اتنی دستگاہ نہیں کہ کسی مسئلہ پر اصولی حیثیت سے نگاہ ڈال سکیں، پھر ان کی علمی تربیت چونکہ تمام تر ان ہی مستشرقین کے زیر نگرانی ہوتی ہے، اس لئے ان کا اندازِ فکر بحث کے ہر مرحلہ میں وہی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے اساتذہ سے سیکھا ہے یہ بیچارے لکیر کے فقیر جن کے دل و دماغ طالب علمی کے زمانے ہی میں قدم قدم پر اپنے اساتذہ کی تحقیق و ریسرچ سے مرعوب ہو چکے ہوتے ہیں ان میں اتنی سکت کہاں کہ اسلام کے کسی مسئلہ پر ایک اصولی اور متکلم کی حیثیت سے رائے دے سکیں۔

مستشرقین کا اثر ہماری نئی نسل پر

ان مستشرقین کے تلامذہ میں سب سے زیادہ نامی گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ہیں جن کی ریسرچ و تحقیق کا لوہا نہ صرف ہمارے ملک کے دکاترہ (پی، ایچ، ڈی صاحبان) بلکہ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے مستشرق بھی مانتے ہیں۔[۳۲]

32۔ عباسی صاحب نے بھی ”خلافت معاویہ و یزید“ میں موصوف کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: (1) ”زمانہ حال کے ہندی عالم اور محقق ”ڈاکٹر حمید اللہ صاحب“ ص 127، طبع، و == ص 149، طبع سوم) (2) یہ واضح رہے کہ اس کتاب کی آنے والی عبارتوں کو ہم نے اپنے

ڈاکٹر صاحب کی ریسرچ کا ایک خاص موضوع آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیّبہ بھی ہے مگر وہ جس انداز پر سوچتے اور لکھتے ہیں اس کو معلوم کرنے کے لئے ان کی مشہور کتاب "رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی" کا مطالعہ کافی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو عنوان "شادی خانہ آبادی" جس کے تحت وہ اس طرح خامہ فرسا ہیں:

"یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آنحضرت ﷺ اور بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا میں تعارف ہوا اور کس طرح "الامین" کی امانت "تاجرۂ مکہ" کے ہاں رسوخ و اعتماد کے بڑھانے اور روابط میں تقرب اور ملاقاتوں میں کثرت و موانست کے پیدا کرنے کا باعث بنی۔

ایک طرف اگرچہ چالیس سالہ عمر ہے لیکن مال و نعمت کی فراوانی نے صحت و حسن کو غیر معمولی طور پر برقرار رکھا ہے، اگرچہ اس سے پہلے دو مرتبہ شادی و بیوگی کا گرم و سرد بھی چکھا جا چکا ہے اور پہلے شوہر "ابوہالہ تیمی" سے "ہند" نامی لڑکا اور دوسرے شوہر "عتیق بن عائذ مخزومی" سے "ہند" نامی ہی لڑکی ہو چکی ہے، لڑکے کی عمر ممکن ہے اس وقت بارہ پندرہ سال کی اور لڑکی کی آٹھ دس سال کی ہو لیکن تمول و تنعم کے باوجود اعتدال و عفاف کی زندگی نے وہ رعنائی باقی رکھی تھی جس کے باعث چراغِ حسن کے پروانوں کی کمی نہ تھی۔ "ابن حبیب" نے تو ایک روایت میں بی بی کی عمر سالہ ہی بیان کی ہے جو اگر صحیح ہے تو دل کے جذباتِ لطیف کی حساس کیفیت اور تاثّر پذیری میں کمی نہیں ہوتی اضافہ ہی ہو سکتا ہے۔ (دیکھو کتاب المحبر بر موقع)

دوسری طرف پچیس سالہ جوان ہے، مستِ شباب مگر شرمیلا، عفاف

دل پر سخت جبر کر کے حوالہ قلم کیا ہے ورنہ اگر یہ کتاب چھپ کر شائع نہ ہو جاتی تو ہم کبھی اپنے قلم کو اس خرافات و واہیات کی نقل سے آلودہ بھی نہ ہونے دیتے۔"

ونکوکاری میں لاجواب، سیاہ پتلیاں، سرخ ڈوریوں سے بھرا ہوا حدقہ، بڑی بڑی آنکھیں، چاند سا مکھڑا، گورا رنگ، گٹھا ہوا بدن، معتدل قد و لب و دندان تھے کہ (ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں) "یاقوت کی ڈبیہ" میں براق و آبدار موتی، کشادہ پیشانی، بڑا سر، کماندار بھوں جو ناک کے قریب ملے ہوئے، اس نگاہ کی تیزی سے خرمن ہائے دل کا کیا حال ہو جو ثریا کے جھرمٹ میں گیارہ ستارے گن سکتی، صراحی دار گردن، سینہ و شکم ہموار اور بالوں سے خالی، سر کے بال نہ سیدھے نہ گھنگرو والے مگر کندھوں تک لٹیں چھوتی ہوئی، بھری ہوئی ہتھیلیاں اور تلوے ایسے کہ ننگے پاؤں قدم رکھیں تو نشان پورا پڑتا، چوڑا سینہ، مضبوط ہاڑ، پتلی پنڈلیاں، باریک ہموار لیکن درمیان سے ابھری ہوئی کمان کی طرح کی ناک، مسکراہٹ غضب کی، آواز چاندی کی گھنٹی کی طرح لوچدار اور لہجہ اتنا صاف کہ الفاظ میں ایک ایک حرف پوری طرح ادا ہونے والا، پیاری پیاری گھنی داڑھی اور پھر صفائی سنگھار کا خیال، اس سراپا کے ساتھ پھُرتی بھی ہے، استغنا بھی، عقل و ذہانت بھی ہے ملنساری بھی، غریب نوازی بھی ہے دلچسپی کی جگہ دائمی سنجیدگی بھی اور اگر اس پر خدیجہ طاہرہ کے بجھے ہوئے چراغ آرزو میں پھر سے تیل آگیا اور دل ہاتھ سے چھوٹ گیا تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ ہونے والی "ام المؤمنین" نے جب تک ضبط ہو سکتا تھا ضبط کیا مگر دل کی آگ دماغ کی خنکی کو کتنے دن باقی رکھ سکتی، شروع میں کاروبار کے متعلق گفتگو اور مشورہ کے نام سے بلاوے بڑھتے گئے اور ساتھ ہی تحفے بھی اضافے پانے لگے، جن میں یقیناً[33] موسمی اور فصلی تازہ میوے اور دیگر سامان بھی ہوتا ہوگا، آخر بی بی سے نہ رہا گیا تو ایک

33۔اپنے قیاس کو ڈاکٹر صاحب یقین سے کم نہیں سمجھتے۔

دن اپنی ایک پرانی منہ چڑھی اور رازداں سہیلی نفیسہ سے شرماتے ہچکچاتے کہہ دیا کہ کیا لگن اور تڑپ پیدا ہو گئی ہے،[34] نفیسہ کے متعلق طبری نے مولاۃ اور مولدہ لکھا ہے یعنی کسی غیر قوم کی لونڈی کے بطن سے مکّے میں پیدا ہوئی تھی اور سُہیلی نے کاہنہ ہونا لکھا ہے جس سے ممکن ہے یہودی خون مراد ہو۔ ظاہر ہے اس سے بہتر پیام رسانی کا کونسا ذریعہ ہو سکتا تھا، کسی شریف زادی کے مقابلہ میں ایک لونڈی زادی ہی آسانی سے ایک نوجوان سے مل سکتی اور بے تکلف گفتگو کر سکتی[35] اور ممکن ہے بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے میل جول کے باعث ہی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ صرف متعارف ہو بلکہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے معمولی پیام سلام پہنچاتی رہی ہو۔

بہر حال نفیسہ ایک دن موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتی اور یہ ذکر چھیڑتی ہے کہ تمہاری عمر کافی ہو چلی ہے، تم اچھے خاندان کے ہو، تمہارے اخلاق و کردار کی دھوم ہے، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے اچھی سے اچھی لڑکیاں تمہیں آسانی سے مل سکتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشی عذر کیا کہ گھر چلانا مشکل ہے، نفیسہ نے کہا کہ اگر کوئی لڑکی تمہیں ملے جو حسین بھی ہو، خوب مالدار بھی ہو، اعلیٰ گھرانے کی بھی ہو۔ استفسار پر بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نشاندہی کی گئی اور کہنے پر کہ "بھلا جس کا شہر میں ہر کوئی خواہاں ہے مجھ مفلس کو کیوں چاہنے لگی۔"[36] نفیسہ نے کہا کہ تم آمادہ ہو تو اسے آمادہ کر لینا میرا ذمہ۔

34۔ یہ کسی عربی عبارت کا ترجمہ نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے اپنے خیالات ہیں۔

35۔ مگر جب کاروبار کے متعلق گفتگو اور مشورے کے نام سے بلاوے پہلے سے موجود تھے تو پھر اس کنیز کے ذریعہ پیام رسائی کی کیا حاجت تھی؟ کیا اس امر کا اظہار روبرو نہیں ہو سکتا تھا؟

36۔ یہ بھی کسی عربی عبارت کا ترجمہ نہیں بلکہ اپنے خیالات کی ترجمانی ہے۔

آنحضرت ﷺ سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسی ذمہ دار نہ اطمینان دہانی کوئی فرستادہ ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال آپ ﷺ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پھر ملے اور شرمائے ہوئے انداز میں کسی نہ کسی طرح اپنا عندیہ ظاہر کر دیا، وہاں کسے انکار تھا۔ بہر حال با قاعدہ پیام اور عقد کا انتظام ہو گیا۔

مکّے کا قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی چاہے کنواری ہو یا دو بچوں کی ماں اپنے بزرگانِ خاندان کی منظوری کی محتاج تھی۔ آنحضرت ﷺ تو اپنے چچاؤں کو لے کر لڑکی کے گھر پہنچے لیکن لڑکی کو ابھی جرات نہیں ہوئی تھی کہ اپنے بزرگوں کو کہتی، غالباً وہ ڈرتی تھی کہ افلاس سے تعصب برتا جائے گا۔ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے باپ خویلد کا "حربِ فجار" کے زمانے سے بھی کچھ پہلے انتقال ہو گیا تھا، اب چچا عمرو بن اسد سے اجازت لینی تھی، بی بی نے راز کو آخر تک راز رکھا صرف نکاح کے دن ایک ضیافت کر کے جس میں گائے کٹی تھی، چچا کو بلوایا اور کھلانے کے بعد خوب پلایا بھی اور جب وہ نشے میں چور ہو گیا تو بی بی نے چچا پر عبا و قبا بھی ڈال دی اور "خلوق" یعنی زعفران ملا ہوا عطر بھی مل دیا اور پھر آنحضرت ﷺ کو بلا بھیجا[37] اور کہا کہ اب اپنے چچا ابو طالب سے کہہ کر ابھی یہاں آکر منگنی کریں۔ ابو طالب نے حسب رواج لڑکے کی تعریف کی اور کہا کہ "شرافت و نجابت اور فضل و عقل میں قریش کا کوئی نوجوان اس کی برابری نہیں کرتا، دولت بیشک کم ہے لیکن وہ ہے بھی تو ایک پرچھائیں، آج ہے تو کل زائل اور ایک عاریت ہے، کبھی آئی، آئی تو واپس بھی چلی گئی اور پھر یہاں دونوں کو لگی ہوئی

37۔ ابھی ڈاکٹر صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ تو اپنے چچاؤں کو لے کر لڑکی کے گھر پہنچے" پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ کو بلا بھیجا کیا معنیٰ؟

ہے، یہ اسے وہ اسے چاہتے ہیں اور اس سے بہتر کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔" عمرو بن اسد نے نشہ میں (اور ایک روایت میں بی بی کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے) اس کی تائید کی کہ "بیشک محمد ﷺ ایک نر اونٹ ہے اور اتنا شریف کہ اسے بٹھانے کے لئے اس کی ناک پر ضرب مارنے کی ضرورت نہیں[۳۸]۔ پھر ہر طرف مبارک سلامت کا

38۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ کیا کیا مکھی پر مکھی مار دی جس سے مطلب خبط ہو کر رہ گیا۔ خطبہ کے اصل الفاظ جو ایک نہایت ہی ضعیف روایت میں منقول ہیں یہ ہیں:

هدا الفحل لا يقرع أنفه.

یہ وہ جوان مرد ہیں جن کی ناک پر ضرب نہیں لگائی جاسکتی (یعنی ان کی ناک نیچی نہیں کی جاسکتی۔)
علامہ طاہر پٹنی رحمہ اللہ "مجمع البحار" میں جو لغتِ حدیث کی مشہور ترین کتاب ہے اس کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

أي كريم كفوء لا يرد.

یعنی یہ شریف اور کفو ہیں ان کی بات رد نہیں کی جاسکتی۔

"فحل" لغت عرب میں ہر نر حیوان کو کہتے ہیں اور جب انسان کے لئے اس لفظ کا استعمال ہو اس کے معنی جوان مرد کے آئیں گے۔ "كريم كفوء" اسی جوانمردی کا بیان ہے۔ "قرع أنف" یا "قدع أنف" کے معنی بیشک ناک پر مارنے کے آتے ہیں اور سرکش اونٹ کو بٹھانے کے لئے اس کی ناک پر ڈنڈا رسید کیا کرتے ہیں، لیکن یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ "قرع أنف" ٹھیک اسی معنٰی میں استعمال ہوا ہے جس کے لئے ہم اردو میں "ناک نیچی کر دینا" بولتے ہیں اسی لئے علامہ طاہر پٹنی رحمہ اللہ نے اس کی شرح "لا يرد" سے کی ہے، یعنی ان کی بات رد کر کے ان کی ناک نیچی نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر صاحب نے اول تو "فحل" سے نر اونٹ مراد لیا اور پھر اس کے سارے لوازم ترجمہ میں ثابت کر دیئے، جس طرح خود اس واقعہ کی تفصیلات میں انہوں نے کیا ہے پہلے ذہن میں ایک نقشہ تیار کیا کہ عام حالات میں ایک چالیس سالہ عورت اور پچیس سالہ مرد کا نکاح کیونکر ہونا چاہئے اور پھر اسی نقشہ کے مطابق بلاامتیاز صحیح وغلط جو روایت جہاں سے ملی=

غل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ دعوتیں کھا پی کر اور پی کھا کر رخصت ہو گئے۔
لیکن باقاعدہ لڑکی کی رخصتی باقی تھی۔

غالباً شام کے قریب جب عمرو بن اسد ہوش میں آیا تو کہا یہ عطر اور یہ بخور اور یہ کپڑے جوڑے اور یہ گانا بجانا کیسا ہے؟ بھتیجی نے کہا "تم ہی نے تو معززین قریش کے سامنے میرا نکاح محمد ﷺ سے کیا، چچا سے مختصر سی تکرار ہوئی جس نے دھوکہ دہی کا الزام لگایا مگر جب اس نے دیکھا کہ نکاح کفو سے ہوا ہے اور لڑکی تُلی ہوئی ہے تو اس نے بھی زیادہ انکار مناسب نہ سمجھا اور ہنسی خوشی محبت کی یہ تقریب تکمیل کو پہنچی۔"

(ص لغایت ص، شائع کردہ "ادارہ اسلامیات" انارکلی لاہور۔)

قطع نظر اس امر کے کہ اس میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط اور کتنا اصل واقعہ ہے اور کتنا زیبِ داستان کے لئے بڑھایا گیا ہے، ہمیں تو سردست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کیا ایک اُمّتی اپنے پیغمبر کی تقریب نکاح کا واقعہ اسی شان سے بیان کیا کرتا ہے، جس طرح ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے، بڑے سادہ اور نیک دل مسلمان سہی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے سوچنے اور لکھنے کا انداز قطعاً مسلمانوں کا انداز نہیں ہے۔ یہ تو خیر! نکاح کا ایک معمولی واقعہ ہے ورنہ ان کی نظر میں تو نبی سے (العیاذ باللہ نقل کفر کفر نباشد) کفر اور بُت پرستی کا صدور بھی عیب نہیں، چنانچہ اس بارے میں ان کی تحقیق حسبِ ذیل ہے، فرماتے ہیں:

"سیرتِ حلبیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ "ابو طالب" نے مکے والوں کی ایک بت پرستانہ عید میں حصہ لینے کے لئے آپ ﷺ کو بہت برا بھلا کہہ کر مجبور کیا لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ "ابو طالب" نے پھر کبھی آپ ﷺ کو اس پر مجبور نہیں کیا۔ "کلبی"

=ٹانک دی اور پھر اس پر جابجا قیاسات کے اتنے پیوند لگائے کہ اصل واقعہ فسانہ میں گم ہو کر رہ گیا۔

کی ''کتاب الاصنام'' کا واقعہ بھی غالباً اسی موقع کا جزء ہے کہ
''آنحضرت ﷺ'' نے جاہلیت میں بھوری بھیڑ کی قربانی دی تھی۔

اس کے بعد عالم نوجوانی میں چند واقعات ملتے ہیں جن سے

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

تنبیہ: ابھی اوپر ''سیرت حلبیہ'' کے حوالہ سے زمانۂ جاہلیت کی جس جاترا کا ذکر کیا گیا اس کی کچھ مزید تفصیل ''رسول اکرم ﷺ'' کی کھلائی بی بی ام ایمن رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ملتی ہے (جو اگرچہ ''واقدی'' کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے لیکن وہ قرین قیاس ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ''واقدی'' کی ہر بات غلط ہی ہو) اور وہ ہے کہ یہ ''بوانہ'' نامی بت کی سالانہ تقریب تھی، لوگ اس کی پوجا کے بعد سر منڈاتے تھے، جب وہاں جانے سے سال بسال آنحضرت ﷺ نے انکار کیا تو ایک سال ابو طالب بھی خفا ہوئے اور پھوپھیاں بھی اور کہا کہ اپنی قوم کی عید میں شریک نہ ہونا اور مجمع کو بڑھانے میں حصہ نہ لینا بڑی بُری بات ہے، اور پھوپھیاں اتنی بضد ہوئیں کہ آنحضرت ﷺ بھی ساتھ جانے پر آمادہ ہوئے اور پھر غیبی حوادث پیش آئے وغیرہ، اور یہ سب نوعمری اور زمانۂ جاہلیت کا واقعہ ہے اور بفحوائے آیت ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيْمَانُ'' (سورہ شوریٰ ۴۲، آیت ۵۲) کبھی نبی بننے سے پہلے پیش بھی آیا ہو تو ناممکن نہیں ہے[39]۔'' (رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۶۳، ۶۲)

39۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ ساری ریسرچ اپنی دانست میں مستشرقین کی تردید ہی کے لئے ہو، کیونکہ ان لال بجھکڑوں نے ایک مدت کی کاوش دماغی کے بعد یہ پہیلی بوجھی ہے کہ ہو نہ ہو آنحضرت ﷺ کا یہ دعوائے نبوت (معاذ اللہ) اپنے ان تاثرات کا نتیجہ تھا جو شام وغیرہ کے سفر میں بحیرا راہب وغیرہ کی ملاقات یا ان سے تبادلہ خیالات کی بدولت پیدا ہوئے تھے، لہٰذا یہ=

اللہ اللہ! یہ جاترے کا دعویٰ (نعوذ باللہ) اس ذاتِ گرامی کے متعلق ہے جس نے عالم میں توحید کا ڈنکا بجوادیا۔ (ﷺ) اور ثبوت میں پیش کیا جارہا ہے ''کلبی'' اور ''واقدی'' کو۔ اگرچہ ''واقدی'' کے بارے میں خود بھی دل میں دغدغہ ہے مگر اس کو یوں سمجھایا جارہا ہے کہ ''کوئی وجہ نہیں کہ ''واقدی'' کی ہر بات غلط ہی ہو اور ''کلبی'' کے بارے میں تو ماشاء اللہ دل میں خطرہ تک نہ آیا، ریسرچ اسی کا نام ہے حالانکہ فنِ رجال کا معمولی سا عالم بھی اس بات سے ناواقف نہیں کہ ''کلبی'' اور ''واقدی'' دونوں مشہور دروغ گو ہیں اور اسی لئے محدثین کے دربار میں ان کو بالکل بار نہیں بلکہ ان کے یہاں ان دونوں کو متروک الحدیث قرار دیا جاچکا ہے تاہم ''واقدی'' بہر حال ''کلبی'' سے بہتر ہے۔ ''واقدی'' سنی تھا اور ''کلبی'' پکا رافضی اور سبائی۔ ''واقدی'' نے صرف میلہ میں شرکت کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی بادل ناخواستہ کہ پھوپھیاں بضد تھیں اور ''ابو طالب'' خفا ہو رہے تھے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بتوں سے کتنی نفرت تھی، مگر ''کلبی'' نے تو غضب ہی کر دیا بت کے لئے بھیڑ کی قربانی تک منسوب کر دی جو سراسر کذب و افترا ہے۔ ''کلبی'' نے ''کتاب الاصنام'' میں اس خرافات کو ''بلغنا'' کہہ کر ذکر کیا ہے یعنی ''یہ بات ہم کو پہنچی ہے '' اور اس کی سند سرے سے بیان ہی نہیں کی، خدا جانے کس مسخرے نے یہ بات اس سے کہی تھی جس کو اس نے ''ابلہ گفت و دیوانہ باور کرد'' کے اصول پر لکھ مارا۔ اغلب یہ ہے کہ خود اس نے یہ بات اپنے دل سے گڑھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ وہ خود سبائی تھا اور سبائیوں کے عقیدہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے افضل ہیں۔ ممکن ہے یہ

=ثابت کیا جارہا ہے کہ نہیں نہیں وہ تو (العیاذ باللہ) بعثت سے قبل تک اپنے ان ہی خیالات پر تھے جو اہل جاہلیت کے تھے۔ مستشرقین تو وحی و نبوت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے اول فول بکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ایسا نہ چاہیے تھا۔

روایت اس نے محض اس لئے گھڑی ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ وہ کبھی شرک سے ملوث نہیں ہوئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ روایت بھی موجود ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ "کلبی" نے "عزیٰ" نامی دیوی کے متعلق اس قربانی کا ذکر کیا ہے مگر ڈاکٹر صاحب اسے "بوانہ" کے میلے کے ساتھ محض اپنے قیاس سے چسپاں کر رہے ہیں۔

یہ بحث تو روایت کے لحاظ سے ہوئی اور درایت کے اعتبار سے دیکھئے تو خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> "مکہ ایک تجارتی شہر تھا، شہر میں مالدار بھی تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی خانگی تقریبیں شہر میں چہل پہل پیدا کرتی تھیں، ایک مرتبہ کسی ایسی ہی تقریب میں گانے بجانے کا بھی انتظام ہوا تھا جو کسی قدر نادر موقع کہا جا سکتا ہے، "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" نے اپنے ہمکار چرواہے لڑکے سے انتظام کیا کہ وہ ایک دن کے لئے دونوں گلّوں کی رکھوالی کرے (یقینا دوسرے مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی طرح ان رفقاء کا کام کیا ہوگا) [40] اور یہ کہ آپ شہر جا کر گانا سنیں، معلوم ہوتا ہے [41] کہ گرمی کے دن تھے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر پہنچے تو ابھی تقریب کو شروع ہونے میں دیر تھی۔ آپ تقریب گاہ سے باہر سائے میں انتظار

40۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ رفقاء تو گانا سننے جاتے اور آپ ان کے گلّوں کی رکھوالی کرتے تو یہ محض بے تکا قیاس ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہمیشہ یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

41۔ یہ واقعہ صحیح روایات میں موجود ہے جن میں اس کو رات کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے صرف یہ خیال کر کے کہ رات کو اونٹوں کی رکھوالی کس طرح ہو سکتی ہے رات کا دن بنا دیا ہے حالانکہ ناچ گانے کی محفلیں عموماً شب ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ تقریب نکاح کے بیان میں بھی ڈاکٹر صاحب نے خوب جی بھر کے قیاس آرائی کی ہے۔

میں بیٹھے تو غنودگی سے آنکھ لگ گئی اور جب بیدار ہوئے تو بعد از وقت
تھا۔ اس قدرتی سزا کا آپ کے حساس اور غیور دل پر بڑا اثر ہوا، اور پھر
کبھی اس طرح فرض کی نظر اندازی اور بے سود دل بہلائی سے جی نہ
لگانے کا عہد کر لیا۔"

(رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ص ۵۸،۵۷)

بھلا سوچنے کی بات ہے گانا سننے سے تو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے "حبیب" روحی فداہ ﷺ کی حفاظت فرمائے اور بت پر قربانی کرنے سے نہ روکے یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟

اور یہ جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی دانست میں قرآن پاک سے استنباط فرمایا ہے اور یوں دادِ تحقیق دی ہے کہ "یہ سب نوعمری اور زمانۂ جاہلیت کا واقعہ ہے اور بفحوائے آیت "مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْإِيْمَانُ" کبھی نبی بننے سے پہلے پیش بھی آیا ہو تو ناممکن نہیں ہے۔" (کتاب مذکور ص ۶۳)

صحیح نہیں کیونکہ آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ ایمانیہ کی یہ تفصیلات وحی آنے سے پہلے آپ کو معلوم نہ تھیں یہ نہیں کہ ایمانِ مجمل بھی آپ ﷺ کو حاصل نہ تھا، یا (معاذ اللہ) آپ اس سے پہلے دولتِ ایمان ہی سے محروم تھے اگر یہ بات ہوتی تو غارِ حراء میں آپ کس کی عبادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور بچپن کے شق صدر سے کیا فائدہ ہوا اور پھر کافر آپ کو طعنہ نہ دیتے کہ کل تم جن کو پوجتے تھے آج ان کی مذمت کرتے ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں ایمان اجمالی کافی تھا، چنانچہ زید بن عمرو بن نفیل کے لئے جو آپ کی بعثت سے پیشتر فوت ہو چکے تھے آپ نے اسی بنا پر نجات کی خبر دی ہے کہ ان کو ایمانِ اجمالی حاصل تھا۔

"کلبی" المتوفی ۲۰۴ھ اور "واقدی" المتوفی ۲۰۷ھ تو بعد کی پیداوار ہیں ان دونوں سے کہیں پیشتر امام "ابو حنیفہ" رحمہ اللہ المتوفی ۱۵۰ھ اور "محمد بن اسحاق" المتوفی ۱۵۱ھ کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ

فرماتے ہیں:

ومحمد صلی اللہ تعالی علیه وسلم حبیبه ورسوله ونبیه وصَفیهُ ونقیبه لم یعبد الصنم لم یشرک باللہ طرفة عین قط.[42]

اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے حبیب، اس کے رسول اور نبی اور اس کے برگزیدہ و پاک کردہ ہیں آپ نے نہ کبھی بت کی پوجا کی اور نہ ایک لمحہ کے لئے بھی شرک کا ارتکاب کیا۔

اور محمد بن اسحاق کے الفاظ ہیں:

فشب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یکلوہ اللہ ویحفظه ویحوطه من أقذار الجاهلیة.[43]

رسول اللہ ﷺ سیانے ہوئے تو حق تعالیٰ شانہ جاہلیت کی ناپاکیوں سے آپ کی نگرانی اور حفاظت فرماتا رہا اور آپ کو ہر طرح بچاتا رہا۔

کون نہیں جانتا کہ امام "ابو حنیفہ" رحمہ اللہ فقہ و کلام کے مشہور امام ہیں اور "ابنِ اسحاق" سیرت و مغازی کے، پھر ان دونوں ائمہ کی ان تصریحات کے ہوتے "کلبی" اور "واقدی" کے بیان کی کیا حقیقت ہے اور ان دونوں اماموں نے یہ بات اپنے جی سے نہیں کہی بلکہ "بیہقی" کی صحیح حدیث میں وارد ہے:

قال زید: فوالذي أکرمه وأنزل علیه الکتاب ما استلم صنماً قط حتی أکرمه اللہ تعالیٰ بالذي أکرمه وأنزل علیه.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم اس ذاتِ عالی کی جس نے آنحضرت ﷺ کو مکرم فرمایا اور آپ ﷺ پر کتاب نازل

42۔ ملاحظہ ہو "اشارات المرام من عبارات الامام" از علامہ کمال الدین بیاضی، ص 323 تا 335، طبع مصر 1368ھ

43۔ البدایۃ والنہایۃ، از حافظ ابن کثیر، ج2، ص286، طبع مصر 1351ھ

کی، آپ ﷺ نے کبھی کسی بت کی طرف رخ بھی نہیں کیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو اعزاز بخشنا تھا بخشا اور آپ ﷺ پر کتاب نازل کی۔

ابن اسحاق نے بحیرا راہب کے واقعہ میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب اس نے آنحضرت ﷺ سے عالمِ طفلی میں "لات و عزّیٰ" کی قسم دیکر کچھ پوچھنا چاہا تو آپ ﷺ نے اسے سختی سے منع فرمادیا کہ:

لا تسالني بهما فو الله ما أبغضت شيئاً بغضهما.

ان کی قسم دے کر مجھ سے نہ پوچھو، اللہ کی قسم جیسی مجھ کو ان سے نفرت ہے کسی سے نہیں۔

یہ مستشرقین کے ارشد تلامذہ کا حال ہے باقی عام دکا ترہ کا تو ذکر ہی کیا کہ۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

پھر ڈاکٹر صاحب تو اچھے خاصے متشرع مرد مسلمان ہیں ورنہ زنادقہ اور ملاحدہ تو اسلام کو بالکل مسخ کر دینے پر تل گئے ہیں، چنانچہ کہیں "ثقافت اسلامیہ" کے نام پر اسلامی تہذیب کی دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں اور کہیں "معارف قرآنی" کے پردہ میں آنحضرت ﷺ کے قول و فعل کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کی ناپاک مہم جاری ہے۔

مستشرقین کی علمی مہم

حقیقت یہ ہے کہ پرستارانِ صلیب نے گذشتہ دو سو سال سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو ہتھیار اٹھائے تھے وہ ابھی تک ہاتھ سے نہیں رکھے، ہاں طریق جنگ اسلحہ اور ان کا طریقِ استعمال حسبِ ضرورت موقع بموقع تبدیل ہوتا رہا۔ پہلے تسخیر ممالک کے لئے جنگ جاری تھی اس میں کامیاب ہوئے تو مفتوحین کے دل و دماغ کو مسخر کرنے کی فکر ہوئی، سب سے پہلے پادری اس مہم کو سرانجام دینے کے لئے میدان میں آئے، انہوں نے منہ کی کھائی تو شاطرانِ یورپ نے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر

جنگ کا نقشہ بدل دیا، اب سامنے سے حملہ کرنے کی بجائے کمین گاہ سے حملہ ہوتا ہے اور اس سرعت و صفائی سے کہ ذہن مفلوج ہو جائے اور پتہ نہ چلے اس حملہ کی کمان مدت ہوئی کہ پادریوں کی جگہ مستشرقین نے سنبھال لی ہے جو بڑے گرگ باراں دیدہ سرد و گرم عالم چشیدہ ہیں، ان کی گھاتیں بڑی زبردست ہوتی ہیں، چاہتے یہ ہیں کہ حریف اپنے زور میں آپ گرے ان کا مارا پانی نہیں مانگتا، انہوں نے ایک داؤ یہ چلایا ہے کہ مختلف علوم اسلامیہ پر ریسرچ کے نام سے بہت سی غیر متداول کتابیں جو ہر قسم کے رطب و یابس سے پُر تھیں اور عرصہ سے گوشہ گمنامی میں پڑی تھیں نہایت آب و تاب کے ساتھ طبع کرا کر شائع کر دی ہیں۔ بظاہر یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے لیکن دراصل یہ ایک گہری سازش ہے جس کا اصل مقصد مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا کر کے اس سے فائدہ اُٹھانا اور انہیں اپنے نظریات کی طرف مائل کرنا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خود مسلمانوں کا قصور ہے، انہوں نے ایسی کتابیں کیوں لکھیں لیکن دراصل ایسا نہیں، ہر فن کی تدوین کے وقت اس کا تمام مواد یکجا کیا جاتا ہے کہ مبادا کوئی کام کی چیز رہ نہ جائے پھر سارے مواد کا مکمل جائزہ لے کر صحیح اور غلط کی الگ الگ نشاندہی کر دی جاتی ہے مثلاً کسی زبان کی لغت کو اگر اول جمع کیا جائے گا تو اس کی صورت یہی ہو گی کہ شروع میں جتنے الفاظ مل سکیں گے انہیں یکجا کر دیا جائے گا اور بعد کو تمام الفاظ کا جائزہ لے کر متروک و متداول کی نشاندہی ہو گی، صحیح اور غلط کی تصریح کی جائے گی۔ فصیح و غیر فصیح کے باہم امتیاز ہو گا۔ اسلامی روایات کے بارے میں بھی یہی ہوا کہ شروع میں جو روایت جہاں سے ملی سپرد قلم کر دی گئی تاکہ تاریخِ اسلام کا کوئی واقعہ قلمبند ہونے سے رہ نہ جائے اور پھر اصول تنقید کی رو سے ہر روایت کے متعلق وہ رائے قائم کر لی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اصولِ حدیث کا فن ایجاد ہوا، اسماء الرجال کی تدوین ہوئی فقہا نے استنباط کرتے وقت قانونی نقطۂ نگاہ سے ہر روایت کو پرکھا، متکلمین نے اصولِ عقلی پر جانچا، محدثین نے اسناد و

روایت کے لحاظ سے اس پر نظر ڈالی اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو گیا، لیکن سارے فنون مزاولت مشق اور ملکہ کے محتاج ہیں، بغیر اس کے محض عربی زبان کے جان لینے سے کیا کام چلتا ہے، علوم اسلامیہ میں مہارت ہو تو کسی کتاب کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے اور اس کی روایت کو معیار نقد پر جانچنے میں ذرا دقت نہیں ورنہ جو ایک اردو خواں کی حیثیت اردو میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتی ہے وہی حیثیت ان عربی اسکالروں (پی۔ ایچ۔ ڈی صاحبان) کی ہے کہ وہ "کلبی" اور "واقدی" کا بیان بھی اسی طرح باور کر لیتے ہیں جس طرح "امام بخاری" و "امام مسلم" کا۔ حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین اگر ان کتابوں کی علمی حیثیت کو نہیں سمجھتے تو ان کی جہالت ہے اور اگر ان کی حیثیت کو جانتے بوجھتے انہیں متداول کتابوں کے برابر کئے دیتے ہیں تو پھر اس سے زیادہ کیا لغویت ہو گی۔

فإن كنت لا تدري فتلك مصيبة
وإن كنت تدري فالمصيبة أعظم

(ترجمہ) اگر تجھے معلوم نہیں تو یہ ایک مصیبت ہے اور اگر معلوم بھی ہے تو پھر بھاری مصیبت ہے۔

غیر متداول کتابوں سے استدلال و نقل صحیح نہیں

بہر حال ہمارے اسکالروں کی نظر میں ان تصنیفات کی چاہے کتنی ہی اہمیت اور وقعت کیوں نہ ہو لیکن اصول فن کی روشنی میں اول تو غیر متداول کتابوں سے نقل صحیح نہیں کہ ان میں الحاق کا امکان ہے اور پھر وہ بھی غیر مسلموں کی شائع کردہ ہوں تو پوچھنا ہی کیا کہ ہر مسلمان جانتا ہے "دینی امور میں غیر مسلم کی خبر کا کیا اعتبار" چنانچہ محدث ملا علی قاری رحمہ اللہ "موضوعات کبیر" میں لکھتے ہیں:

ومن القواعد الكلية أن نقل الأحاديث النبوية أو المسائل الفقهية والتفاسير القرآنية لا يجوز إلا من الكتب المتداولة لعدم الاعتماد على غيرها من وضع الزنادقة وإلحاق الملاحدة بخلاف الكتب المحفوظة فإن نسخها تكون صحيحة متعددة.[٤٤]

یہ بات قواعد کلیہ میں سے ہے کہ احادیث نبویہ، مسائل فقہیہ اور تفاسیر قرآنیہ کا نقل کرنا صرف ان ہی کتابوں سے جائز ہے جو متداول ہوں کیونکہ غیر متداول کتابوں پر اعتماد نہیں کہ اس میں زنادقہ نے کچھ جعل کیا ہو یا ملاحدہ نے الحاق کر دیا ہو۔ برخلاف کتب محفوظہ کے کہ وہ صحیح ہوتی ہیں اور ان کے متعدد نسخے ہوتے ہیں (لہٰذا ان میں جعل والحاق نہیں ہو سکتا)۔

اور ہمارے شیخ الشیوخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' میں رقمطراز ہیں:

''کتب مشہورہ اہل سنت بجہت کمالِ شہرت و کثرتِ نسخ قابل تحریف نیستند و کتبِ غیر مشہورہ رااعتباری نیست، ولہذا محققین اہل سنت از غیر کتبِ مشہورہ نقل راجائزنداشتہ اند مگر در ترغیب و ترہیب و در حکم صحائف انبیای پیشین می شمارند کہ ہیچ عقیدہ و عمل راازاں اخذ نتواں کرد بجہت احتمال تحریف۔''[٤٥]

ترجمہ: اہل سنت کی مشہور کتابیں تو کمالِ شہرت اور کثرتِ نسخ کی بنا پر قابل تحریف نہیں ہیں اور کتب غیر مشہورہ کا کوئی اعتبار نہیں یہی وجہ ہے کہ محققین اہل سنت ان کتابوں سے جو مشہور نہیں بجز

---

44 ص 87، طبع مجتبائی دہلی

45۔ ص 69 طبع مطبع نولکشور لکھنؤ 1302ھ

ترغیب وترہیب کے اور کسی چیز کا نقل کرنا جائز نہیں رکھتے وہ انہیں
اگلے پیغمبروں کے صحیفوں کا حکم دیتے ہیں کہ جن سے احتمال تحریف
کی وجہ سے کسی عقیدہ اور عمل کو نہیں لیا جاسکتا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ''ترغیب وترہیب'' کو اس لئے مستثنیٰ کیا کہ ترغیب یا ترہیب تو محض کسی حکم کی تائید کے لئے ہوتی ہے اور اصل حکم شرع میں پہلے سے ثابت ہوتا ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اصولِ حدیث کی رو سے صحتِ خبر کی ایک ضروری شرط ''ضبط'' یعنی اس خبر کا پورے طور پر محفوظ کرنا بھی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک ''ضبطِ صدر''، دوسرے ''ضبط کتاب''۔ ''ضبط صدر'' یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ دیکھا یا سنا وہ بیان کرتے وقت تک اس کے سینے میں محفوظ ہو اور ''ضبط کتاب'' یہ ہے کہ جب سے راوی اسے ضبط تحریر میں لایا وقتِ روایت تک وہ تحریر ہر قسم کے الحاق و تزویر سے پاک رہے۔ یہ قاعدہ ان کتابوں کے لئے ہے جو مسلمانوں کے پاس ہوں اور متداول نہ ہوں ورنہ جو کتابیں سرے سے مسلمانوں کے پاس ہی نہیں اور محض مستشرقین کی بدولت انہیں دیکھنا نصیب ہوا ان کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، آپ خود سمجھ لیجئے کہ اصولِ حدیث کے اعتبار سے ان کا کیا حکم ہونا چاہیئے، مستشرقین کے ان کتابوں کو شائع کر دینے کی وجہ سے اب اہل علم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اولاً ان کتابوں کی ان کے اصل مخطوطوں سے جو ہر قسم کے الحاق و تزویر سے پاک ہوں مراجعت کر کے دیکھیں کہ نقل مطابق اصل ہے یا نہیں اور جب اس کا اطمینان ہو جائے کہ واقعی طباعت میں خیانت نہیں کی گئی ہے تو پھر اصول نقد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے استفادہ کریں لیکن ہمارے ملک میں اہل علم جس کسمپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے ہوتے ان بے سروسامانوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اُٹھا سکیں گے، یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے یا ان دریادل امراء کا جو اس کام کی اہمیت سمجھیں اور اس کے لئے ایک علمی

ادارہ تشکیل دیں جو مستند اور باخبر علماء کے زیر نگرانی اس کام کو انجام دے سکے جس کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مستشرقین نے اسلامیات پر خود بھی بڑا زبردست لٹریچر تیار کر دیا ہے جس میں اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کو بڑی بے دردی سے پامال کیا ہے، ادھر عام مسلمان ایک عرصہ سے علوم اسلامیہ کی تحصیل کو خیر باد کہہ چکے ہیں اور ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کو جو انگریزی ہی میں سب کچھ پڑھنا چاہتی ہے جب کسی بات کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ ان ہی مستشرقین کی تصانیف کی طرف رجوع کرتی ہے جن کی بے لاگ تحقیق و ریسرچ کا سکّہ خیر سے پہلے ہی ان لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوتا ہے، اس لئے بغیر کسی ادنٰی مقاومت کے جو کچھ یہ کہہ دیتے ہیں دل ماننے کے لئے تیار ہوتے ہیں، اس طرح مستشرقین نے ہماری نئی نسل کو دینی اور علمی نقطۂ نظر سے جتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے صحیح معنٰی میں اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

عباسی کی دریوزہ گری مستشرقین کے در پر

حال کا تازہ ترین ”فتنہ ناصبیت“ جس کی داغ بیل ”محمود احمد صاحب عباسی“ کے قلم نے ”خلافت معاویہ و یزید“ لکھ کر ڈالی ہے وہ تمام تر ان مستشرقین کی زہر آلود معلومات پر مبنی ہے، مؤلف نے ان معلومات کو ایک مدت کی ریسرچ کے بعد حاصل کیا، جی جان سے انہیں قبول کیا اور اپنے دل و دماغ میں بسایا ہے۔ مستشرقین کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرنے اور ان کے نظریات و افکار کو پوری طرح اپنے اندر ہضم کر لینے سے مؤلف کی نظریں اب اس درجہ خیرہ ہو چکی ہیں کہ ان کو ان مستشرقین کے علاوہ کوئی آزاد اور بے لاگ محقق ہی نظر نہیں آتا اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو بالکل

ان ہی کے رنگ میں رنگ لیا ہے وہ بالکل ان ہی کی طرح سوچتے، ان ہی کی طرح پڑھتے اور ان ہی کی طرح لکھتے ہیں۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا پس منظر یہ ہے کہ اُنہیں اپنے وطن ''امروہہ'' میں وہاں کے کٹّر رافضیوں سے سابقہ پڑا، موصوف کو علومِ اسلامیہ میں دسترس نہ تھی کہ اہل سنت کے جادہ مستقیم پر قائم رہتے اور اعتدال کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے آخر جو ہونا تھا ہو کر رہا، مثالبِ صحابہ کی ناگوار بحث نے تاریخی مباحث کا دروازہ کھولا، روافض کے غلو، بے جا سبّ و شتم اور تبرّا بازی کے مقابلے میں متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جواب ترکی بہ ترکی کے جذبہ نے رد عمل کی صورت اختیار کی جو اپنے حدود سے تجاوز کر کے ''ناصبیت'' میں تبدیل ہو گیا، اب مؤلف اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کی مدد سے مایوسی تھی ناچار غیر مسلموں کو پکارا اور وہ مدد پر آموجود ہوئے۔ ''ڈوزی'' نے فوراً ڈوز پلائے، ''دے خوئے'' نے خوراک بہم پہنچائی اور ''حتّی'' نے ان کی حمایت کی، دورانِ تالیف ہر گام پر مؤلف ان ہی کی انگلی پکڑ کر چلے ہیں اور ان ہی کی حمایت و رہنمائی میں انہوں نے یہ منزل ہفت خواں طے کی ہے اور اس طرح جب بہزار دقت و خرابی ان آزاد اور بے لاگ مستشرقین کی مدد سے ''ناصبیت کا یہ خوانِ لعنت'' تیار ہو گیا تو بیچارے سادہ لوح عوام کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کر دیا۔ اگرچہ غالی رافضیوں کے مقابلے میں بیچارے ''عباسی'' اب بھی طفلِ مکتب ہیں، تاہم اہل سنت کے نقطۂ نظر سے جو کچھ انہوں نے کیا، بالکل غلط کیا، انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

اہل سنت کا شعار گالی کا جواب گالی نہیں ہے ان کی توصفت یہ ہے ''وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَاماً'' (جب لغویات پر گذرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ نکل جاتے ہیں)

اور ''وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً''(اور جب ان سے جاہل مخاطب ہونے لگتے ہیں تو یہ صاحب سلامت کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں) جس طرح ایک یہودی یا نصرانی کے مقابلے میں جو ''آنحضرت ﷺ'' طوفان باندھنے لگے ہم یہ نہیں کرسکتے کہ جذبات سے مشتعل ہو کر خدانخواستہ ''حضرت موسیٰ'' یا ''حضرت عیسیٰ'' علی نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض کرنے لگ جائیں، اسی طرح سبِّ صحابہ کا جواب اہل بیت کی حطِ مرتبت سے دینا کسی طرح ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔

ہاں اس حیثیت سے یہ بالکل نیا کارنامہ ہے کہ رفض کے تو مختلف مکاتب فکر یہاں پہلے سے موجود تھے مگر ''ناصبیت'' کا کوئی ترجمان نہ تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی دانست میں اس کتاب کو لکھ کر ایک بہت بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ پھر جو کچھ کیا نہایت سلیقہ سے کیا، رائی کا پربت، تل کا پہاڑ بنایا، حقیقت کو فسانہ، فسانہ کو حقیقت کر دکھایا اور یہ سب کچھ اس خوبصورتی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے کو حقیقت کا گمان ہونے لگے اور جو سادہ دل ایک دفعہ اس طلسم کی سیر کر لے پھر نہ نکل سکے مگر مؤلف نے جو بزم اس سروسامان سے سجائی ہے اس کا تمام تر میٹریل دساور سے آیا ہے جس کے بنانے اور تیار کرنے میں ''یورپ'' کے بہترین دماغوں نے ایک مدت اپنی ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو صرف کیا ہے، جابجا قیاساتِ بیجا کے پیوند لگائے ہیں، حقائقِ تاریخی پر پردہ ڈالا ہے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کیا ہے تب کہیں جا کر یہ خاص الخاص انوکھے اور نادر معلومات وضع ہوئے ہیں ورنہ اسلام کے تاریخی خزانہ میں اس زرِ قلب کو کون پوچھتا ہے۔ تعجب نہ کیجئے ''جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے'' خود مؤلف سے پوچھئے یہ مال مسالہ کس سے مستعار لیا ہے وہ آپ کو بتائیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن

''دے خوئے'' نے اپنے مقالہ بعنوان ''خلافت'' میں کہا ہے کہ:

"معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"[٤٦]

46۔ دے خوئے یا اس کا کوئی پرستار اگر اس جھوٹ کو سچ کر دکھائے اور مستند تاریخی حوالوں سے ان معاملہ فہم لوگوں کی نشاندہی کر دے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کے ساتھ ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے تو یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوگا، مؤلف تو شاید یہ نہ کر سکیں کیونکہ ان کو یہ تسلیم ہے کہ "تاریخ کی کھلی شہادت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں" (ص ۳۳۳، طبع دوم و ص ۴۶۰، طبع سوم)۔
اس لئے خود ان کی تحقیق و ریسرچ کے مطابق تو ان معاملہ فہم لوگوں کا سرے سے تاریخی وجود ہی نہیں کہ "تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں" پھر معاملہ فہم لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کیسے کر سکتے تھے۔ یہ بھی ان ہی کے الفاظ ہیں کہ "اس زمانہ کی برکات خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک باقی رہیں۔ (ص ۳۴۷ طبع دوم) اور نشو و نمائے ملت اسی منہاج پر جاری رہا جو نبی کریم ﷺ نے معین فرمایا تھا۔

آنحضرت ﷺ برائے نشو و نمائے ملتِ اسلامیہ صورتے معین فرمودند کہ تا آخر عہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ متحقق شد۔ (ازالۃ الخفاء، ۱/۱۳۰)
آنحضرت ﷺ نے ملتِ اسلامیہ کے نشو و نما کے لئے ایک صورت معین فرمائی تھی جو آخر عہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک یقیناً رہی۔

(خلافت معاویہ و یزید طبع سوم ص ۴۶۹)
ظاہر ہے کہ اس تصریح کے بعد اب دے خوئے کی اتباع میں ان لوگوں کو معاملہ فہم کہنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا جو "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے۔"
یہ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ "دے خوئے" کی اس خرافات پر مؤلف نے بغض علی رضی اللہ عنہ کے جذبہ میں دھیان نہیں کیا۔ ان کا مقصود تو صرف "حضرت علی رضی اللہ عنہ" کی مخالفت میں وہ=
=ایک "آزاد نگار مستشرق" کی زوردار شہادت تھی اس لئے وہ اس کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔

(انسائیکلوپیڈیا برنا ٹیکا، گیارہواں ایڈیشن ج۵، ص۲۰)

مؤلف کی ساری کتاب ناصبیت کی آئینہ دار ہے خروج کی نہیں، خروج میں بغضِ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل ہے، بغض عثمان رضی اللہ عنہ پر خوارج و روافض دونوں کا اتفاق ہے، بغض علی رضی اللہ عنہ ''نواصب'' کی خصوصیت ہے اور بغض شیخین ''روافض'' کی۔

مطاعن علی (رضی اللہ عنہ)
نااہلی، تقدس وپارسائی کا فقدان
حصولِ اقتدار وحبِّ جاہ

دشمنان دین اور کفار سے تیغ آزمائی کرنے کی بجائے طلب و حصول خلافت کی غرض سے تلوار اٹھائی گئی تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث رحمہ اللہ دہلوی فرماتے ہیں:

مقاتلات وی (علی) رضی اللہ عنہ برائی طلبِ خلافت بود نہ بجہتِ اسلام۔[47] (ازالۃ الخفاء ۱/۲۷۷، سطر ۲۰)

47۔ مؤلف نے احتیاط کے پیش نظر ''سطر'' تک کا یہاں حوالہ دیدیا ہے تاکہ کسی کو حوالہ کی صحت میں پس وپیش نہ ہو، بیشک مؤلف نے الفاظ کی نقل میں قطع وبرید سے کام نہیں لیا مگر بیانِ مطلب میں جو تحریف کی گئی ہے اس کا کیا علاج؟۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ جملہ اپنی کتاب میں اس مقام پر لکھا ہے جہاں اس آیت پر بحث کی ہے:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ أُولِيْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ. (الفتح)

کہہ دیجئے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم اُن سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں یہ آیت خلافتِ شیخین رضی اللہ عنہما کی دلیل ہے کہ ''أُولِيْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ'' (سخت جنگجو لوگ یعنی فارس وروم) سے جنگ کی دعوت ''اعراب حجاز'' (بادیہ نشینانِ عرب) کو شیخین رضی اللہ عنہما ہی نے دی تھی نہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کیونکہ ان کی جنگیں مطالبہ خلافت کی بنا پر تھیں نہ دعوتِ اسلام کی خاطر، ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بغاوت کو==فرو

کرنے کے لئے میدان میں آئے تھے ان کے حریف کافر نہ تھے کہ جن کو دعوتِ اسلام دی جاتی۔
مؤلف نے اپنے پیش رو مستشرقین یہود و نصاریٰ کی اتباع میں جن کی خاص صفت ہے:

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِه.

پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے۔

یہاں تحریفِ معنوی کی ہے اور عبارت کا مطلب بدل دیا ہے۔ "نہ بجہتِ اسلام" کا ترجمہ ہے: "نہ اسلام کی غرض سے" مؤلف نے "غرض" کی جمع "اغراض" لکھ کر ہر حیثیت سے مقاتلاتِ علی رضی اللہ عنہ کو اسلامی جنگوں میں شمار کرنے سے خارج کر دیا ہے، حالانکہ شاہ صاحب ممدوح رحمہ اللہ نے اس کتاب کی جلد اول کے خاتمہ پر مؤلف جیسے خوش فہم حضرات کو پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ:

"غرضِ من آں نیست کہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ نبود یا در حکمِ شرع خلافت او منعقد نگشت یا سعی او در حروبے کہ پیش آمد نللہ فی اللہ نبود اعوذ باللہ من جمیع ما کرہ اللہ۔" (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۳۳۵)

ترجمہ: میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) خلیفہ نہ تھے یا حکم شرع میں ان کی خلافت منعقد نہ ہوئی، یا ان کی کوشش ان جنگوں میں جو انہیں پیش آئیں للہ فی اللہ نہ تھی، میں اللہ سے ایسی تمام باتوں سے پناہ مانگتا ہوں جو اس کو ناپسند ہوں۔

مؤلف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگوں کو محض دنیوی جنگ سمجھتے ہیں جو حصول اقتدار کے لئے لڑی گئی تھیں، لیکن شاہ صاحب موصوف رحمہ اللہ اس بات کو زبان پر لانے سے بھی اللہ کی پناہ مانگ رہے ہیں، خوب سمجھ لیجئے شاہ صاحب کا منشا اس جملہ سے جو مؤلف نے نقل کیا ہے صرف اتنا ہے کہ ان کی جنگیں اس آیت کے تحت نہیں آتیں کیونکہ ان کی لڑائی اسلام و کفر کی لڑائی نہیں بلکہ خلیفۂ راشد کی باغیوں سے جنگ تھی۔ شاہ صاحب ممدوح کے نزدیک "مقاتلاتِ علی رضی اللہ عنہ" جس آیت کا مصداق ہیں وہ یہ ہے:

وکلمہ "وَالَّذِیْنَ اِذَا أَصَابَہُمْ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ" منطبق است بر علی مرتضیٰ زیرا کہ در ایام خلافت او امرے کہ واقع شد و وے بدان متفرد بود قتالِ بغاۃ است۔ (ازالۃ الخفاج ۱ ص ۲۳۱)

ترجمہ: اور آیت "وَالَّذِیْنَ اِذَا أَصَابَہُمْ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ" (اور وہ لوگ کہ جب ان کو بغاوت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ انتقام لے لیتے ہیں) حضرت علی=

=رضی اللہ عنہ پر منطبق ہے کیونکہ ان کے ایامِ خلافت میں جو خاص بات واقع ہوئی اور جس میں وہ متفرد تھے وہ ''قتال بغاۃ'' ہی ہے۔

مؤلف کو چونکہ ''دے خوئے'' کی زبانی حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر طعن کرنا تھا اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کا حوالہ اس کے لئے بطور تمہید پیش کرنا اس لئے انہیں اس تحریف کے بغیر چارہ نہ رہا تھا۔ ورنہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی جو قدر ان کے دل میں ہے وہ ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ:

> ''شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنی جلالتِ قدر کے باوجود سبائی حضرات سے گلو خلاصی نہ پاسکے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سوابق ان کے سمجھ میں نہ آئے۔''
> (ص ۴۸۵ طبع سوم)

بھلا جو شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے کو حرفِ غلط سمجھتا ہو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے کو کیا وقعت دے گا!

مؤلف کی اس تصریح سے یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کو مستشرقین کی جناب میں جس درجہ عقیدت ہے مسلمان علماء سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں، حد ہو گئی بے لاگ ریسرچ کی کہ ''دے خوئے'' تو آزاد نگار ٹھہرا اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ سبائی حضرات سے اپنی گلو خلاصی تک نہ کرا سکے۔ جب بایں ہمہ اعترافِ جلالتِ قدر شاہ صاحب ممدوح کے متعلق مؤلف نے اپنی ساری کتب میں ایک جگہ بھی کسی مسلمان عالم کو آزاد اور بے لاگ محقق نہیں لکھا ہے غالباً ان کے نزدیک کوئی مسلمان آزاد نگار نہیں کہ یہ بات تو صرف مستشرقین ہی کا حصہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق اس ہرزہ سرائی کے باوجود جس معصومانہ انداز سے مؤلف اپنے آپ کو ان کی بد گوئی سے بری کرتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو، ارشاد ہوتا ہے:

> حضرت علی رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں ہیں، سیاسی معاملات میں ان سے جو لغزشیں ہوئی اس کے باوجود وہ ہمارے امام واجب الاحترام ہیں اور نسبی تعلق سے بھی ہمیں ان سے محبت ہے جو شخص بد گوئی کرتا ہے اس سے وہی کہوں گا جو میرے ایک دادا امیر عبداللہ المعتز عباسی (جو کہ حسب تصریح حافظ زین الدین عراقی ناصبی تھا۔ ملاحظہ ہو ''التقیید والایضاح'' ص ۲۶۷ نعمانی) نے ایسے ہی کسی بد گو کے جواب میں کہا تھا:

زعمت بِأَنّي يا مبغضُ مبغضٌ   عليّا فما فخري إذًا في المحافل=

=أآكلُ من لحمي وأشربُ من دمي	كذبت لحاك الله ياشروا غل
علي و عباس يدان كلاهما	يمين سواء في العلى والفضائل
فهذا أبو هذا وهذا كم ابن ذا	فهل بين هذين اتساع لداخل
ستسمع ما يخزيك في كل محفل	وتمسح رأس العارف المتغافل

- اے دشمن! تو مجھے علی کا دشمن بتاتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کے سامنے میں کیا منہ دکھا سکتا۔
- علی کی برائی کر کے کیا میں اپنا ہی گوشت نوچ کھاؤں اور اپنا ہی خون پیوں۔ اے بدذات جھوٹے تجھ پر خدا کی مار۔
- علی و عباس دونوں یکساں ہیں، فضائل و شرافت میں اونچی چوٹی پر ہیں۔
- یہ (عباس) ان کے باپ ہیں اور وہ (علی) ان کے بیٹے ہیں، سو ان دونوں کے درمیان تیسرے کا کیا دخل۔
- سوائے مخاطب! تو جو ہر محفل میں ہمیں بدنام کرتا ہے اور تجاہلِ عارفانہ کرنے والے کو دھوکہ دیتا ہے عنقریب تجھے نتیجہ معلوم ہوگا۔

(عرض مولف طبع سوم ص)

قربان جایئے اس ریسرچ کے جس میں عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی بزرگ کے لئے یہ کہہ دینا کہ:

> "حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ (حضرت) علی رضی اللہ عنہ کو (خلیفہ شہید کی) جانشینی کا استحقاق واقعاً حاصل نہ تھا علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہے کہ تقدس و پارسائی کا جذبہ تو ان کے (طلب خلافت) میں کارفرمانہ تھا بلکہ حصولِ اقتدار و حب جاہ کی ترغیب تھی۔ اس لئے معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

بلکہ حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ مؤلف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق جس امر کے مدعی ہیں روافض خلفاء ثلاثہ کے متعلق وہی بات کہتے ہیں۔ مؤلف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی شہادت کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو (کہ یہی دو بزرگ عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت زندہ موجود تھے) مستحقِ خلافت نہیں سمجھتے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں: =

"علی رضی اللہ عنہ کی لڑائیاں (مقاتلات) تو (بعد شہادت عثمان رضی اللہ عنہ) اپنی خلافت کی طلب و حصول کے لئے تھیں نہ باغراض اسلام۔"

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اس خیال کی تائید ایک آزاد نگار مستشرق کے بیان سے ہوتی ہے۔ "دے خوئے" نے اپنے مقالہ بعنوان "خلافت" میں یہ لکھتے ہیں ہوئے کہ "بلوائیوں کے جم غفیر نے (حضرت) علی رضی اللہ عنہ کو زمامِ خلافت ہاتھ میں لے لینے کے لئے بلایا اور طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کو ان کی بیعت کے لئے مجبور کیا۔ کہا ہے کہ:

"حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ (حضرت) علی رضی اللہ عنہ کو (خلیفۂ شہید کی) جانشینی کا استحقاق واقعتاً حاصل نہ تھا علاوہ ازیں یہ بھی واضح

= "اس زمانے میں عشرہ مبشرہ میں کے بعض حضرات، اصحاب بدر، اصحابِ بیعت الرضوان اور دیگر صحابہ کرام کی کثیر تعداد بقیدِ حیات تھی لیکن امت کو اختلال وانتشار سے نکالنے، دشمنِ اسلام قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور خلافت کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحل مراد تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کی اہلیت اگر کسی میں بدرجہ اتم تھی تو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات میں تھی۔
(ص ۱۴ طبع دوم وص ۱۸ طبع سوم)

اور روافض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو حالانکہ حضرت علی حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں اس درجہ فروتر نہ تھے جتنے حضرت معاویہ حضرت علی حضرت سعد اور حضرت سعید رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں تھے یہی وجہ ہے کہ حضرات اہلِ سنت حضرت علی کو تو خلیفہ راشد مانتے ہیں مگر حضرت معاویہ کو خلیفہ راشد نہیں کہتے۔

مؤلف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جس حقیقت کا انکشاف کیا ہے اگر وہ صحیح ہوتی تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کو اپنا جانشین بناتے ورنہ کم از کم عشرہ مبشرہ میں سے جن چھ حضرات کی مجلس شوریٰ انہوں نے اپنی وفات پر انتخابِ خلافت کے لئے بنائی تھی اس میں ان کو بھی نامزد کرتے اور اگر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کسی وجہ سے ان کو نظر انداز کر دیا تھا تو ارباب شوریٰ ضرور ان کا خیال کرتے۔

ہے کہ تقدس وپارسائی کا جذبہ توان کے (طلب خلافت) میں کارفرمانہ تھا بلکہ حصولِ اقتدار وحبِ جاہ کی ترغیب تھی۔ اس لئے معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔

مثالب حسین (رضی اللہ عنہ)

غیر معقول حبِ جاہ کے کارن عہد شکنی اور بغاوت کا قصور وار ولی اللہ کے روپ میں

ثابت[٤٨] ہے کہ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ نے بھی امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں امیر یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی............. آزاد اور بے لاگ مؤرخین[٤٩] نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدامِ خروج کے سلسلہ میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔ مشہور مؤرخ ''دوزی'' کا ایک فقرہ اس بارے میں قابل لحاظ ہے وہ لکھتا ہے:

> اخلاف (یعنی آنے والی نسلوں) کا عموماً یہ شعار[٥٠] رہا ہے کہ وہ ناکام مدعیوں کی ناکامی پر جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات انصاف، قومی امن اور ایسی خانہ جنگی کے ہولناک خطروں کو نظر انداز

48۔ اس کے ثبوت میں مؤلف نے تاریخ اسلام کے پورے سرمایہ میں خود یزید کے ایک شعر کو پیش کیا ہے اور پھر اس کا غلط ترجمہ کر کے اس کے استدلال کیا ہے، حالانکہ اس شعر کو مؤلف کے اس دعوی سے دور کا بھی تعلق نہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

49۔ جن میں ایک متنفس بھی شرفِ اسلام سے مشرف نہیں۔

50۔ یہ یورپ کا شعار رہا ہو تو رہا ہو مسلمانوں کے متعلق ایسا گمان کرنا صحیح نہیں، تاریخ اسلام میں ایک نظیر بھی اس سلسلہ میں نہیں پیش کی جا سکتی کہ مسلمانوں نے محض جذبات کی بنا پر کسی ناکام مدعی کی حمایت کی ہو وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مدعی حق کا داعی تھا یا باطل کا حامی، ان کی نفرت و محبت کا معیار محض شرعی ہے نہ کہ جذباتی۔

کر دیتے ہیں جو ابتداء میں نہ روک دی گئی ہو، یہی کیفیت اخلاف کی (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے جو ان کو ایک ظالمانہ جرم کا کشتہ خیال کرتے ہیں۔ ایرانی شدید تعصب نے اس تصویر میں خدو خال بھرے اور (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ کو بجائے ایک معمولی قسمت آزما کے جو ایک انوکھی لغزش و خطائے ذہنی اور قریب قریب غیر معقول حبِ جاہ کے کارن ہلاکت کی جانب تیز گامی سے رواں دواں ہوں، "ولی اللہ"[۵۱] کے روپ میں پیش کیا ہے، ان کے ہم عصروں میں اکثر و بیشتر انہیں ایک دوسری نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ انہیں "عہد شکنی اور بغاوت کا قصور وار" خیال کرتے تھے اس لئے کہ انہوں نے (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی اور اپنے حق یا دعوے کو ثابت نہ کر سکے تھے۔"

(ص ۷۴، "تاریخ مسلمانانِ اسپین" مؤلفہ رہن ہارٹ دوزی مترجمہ فرانس گریفن اسٹوکس۔ مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء) ("خلافت معاویہ و یزید" ص ۹۵، ۹۴، طبع دوم و ص، طبع سوم)

حب جاہ، شیخی اور بے وجہ کی خوش اعتقادی

اپنی دانست میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلافت کا اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتے تھے اور اپنا "حق" لینا اپنے اوپر واجب کر چکے تھے۔ مسلم کے واقعہ سے آپ نے یہ صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس حالت میں کوفہ جانا مفید طلب نہ ہو گا مگر آپ کے ساتھی کوفیوں نے جب آپ کو پھر ترغیب دی اور یقین دلایا کہ آپ کی شخصیت مسلم کی طرح نہیں ہے آپ کی صورت دیکھتے ہی لوگ آپ کی طرف دوڑ پڑیں گے، حصولِ مقصد

51۔ یہ ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اصلی مؤقف عباسی کے آزاد اور بے لاگ محققین کے نزدیک۔

کے جذبے نے حزم واحتیاط پر غلبہ پالیا اور جس طرح اپنے ہمدردوں اور عزیزوں کے عاقبت اندیشانہ مشوروں کو نظر انداز کر دیا تھا اور کوفیوں کے مواعید پر بھروسہ کر کے مکہ سے روانہ ہو گئے تھے وہی خوش اعتقادی اب بھی آگے بڑھنے کی محرک ہوئی۔ آزاد مؤرخ دوزی نے لکھا ہے کہ ان کوفیوں کے خطوط و مراسلات کے مندرجہ مواعید پر انہیں ایسا اعتماد تھا کہ لوگوں کے سامنے فخریہ پیش کرتے تھے۔ مؤرخ دوزی کا یہ فقرہ یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ:

> "ضرورت سے زیادہ سریع الاعتقاد اور بھولے گورنر کی نگرانی سے بچ کر حسین رضی اللہ عنہ بمعیت عبداللہ (ابن الزبیر) رضی اللہ عنہ مکہ کی مقدس سرزمین پر پناہ گزیں ہوئے تھے، اہالیانِ کوفہ کے خطوط و مراسلات جب ان کو موصول ہوگئے تو ان کو اس سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ان خطوط میں التجا کی گئی تھی کہ وہ آن کر ان کی قیادت کریں۔ کوفیوں کی ان تحریرات میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ ہم آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیں گے اور پوری آبادی کو آپ کی خلافت قبول کرنے پر راضی کر لیں گے۔ کوفہ سے قاصد پر قاصد بڑی سرعت سے آتے رہے، آخری قاصد جو بڑی طویل درخواست لایا تھا اس کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سو صفحات کی فہرست لوگوں کے دستخطوں کی منسلک تھی۔ حسین رضی اللہ عنہ کے دور اندیش دوستوں نے لاکھ منت سماجت کی کہ ایسی خطرناک مہم کے اندر ناعاقبت اندیشانہ اپنے کو جوکھم میں نہ ڈالیں اور ان لوگوں کے مواعید اور مصنوعی جوش وولولہ پر اعتماد نہ کریں جنہوں نے ان کے والد سے دغا کی تھی اور ان کو دھوکہ دیا تھا مگر حسین رضی اللہ عنہ نے حب جاہ کی مہلک ترغیبات پر کان دھرنے کو ترجیح دی اور ان لاتعداد خطوط (دعوت ناموں) کی فخریہ طور سے نمائش کرتے رہے جو ان کو موصول ہوئے تھے اور جن کی تعداد جیسا کہ شیخی سے

کہتے تھے ایک اونٹ کے بوجھ کے مساوی تھی۔ قضا کے سامنے بالآخر انہوں نے سر جھکا دیا اور کوفہ روانہ ہو گئے.....(قتل مسلم کے) مصیبت خیز واقعات کی خبریں حسین رضی اللہ عنہ کو اس وقت ملیں جب کوفہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھے اور ان کے ساتھ مشکل سے سو نفوس تھے جن میں زیادہ تر ان کے اہل خاندان [۵۲] تھے بایں ہمہ انہوں نے سفر جاری رکھا اسی خوش اعتقادی کی سحر آفریں کشش نے جو دعویداروں پر اثر انداز ہوا کرتی ہے۔ان کا ساتھ نہ چھوڑا، ان کو یقین تھا کہ جیسے ہی شہر کوفہ کے پھاٹک پر جا موجود ہوں گے اہالیانِ شہر ان کے مقاصد کی خاطر ہتھیار سنبھال لیں گے۔

(ص ۴۶، "تاریخ مسلمانانِ اسپین" مؤلف رہن ہارٹ دوزی مترجمہ فرانس گریفن مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء)("خلافت معاویہ ویزید" ص ۱۷۰، ۱۶۹، طبع دوم وص ۱۹۴ تا ۱۹۵ طبع سوم)

ناعاقبت اندیشانہ مہم
اور پھر اس پر عمر بن سعد، ابن زیاد
اور یزید کو قاتل سمجھنا

ولندیزی محقق "دے خوئے" نے اپنے محققانہ مقالہ میں "حادثہ کربلا" کے متعلق ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"کسی دوسرے انجام اور نتیجہ کی توقع اس ناعاقبت اندیشانہ مہم کے

52۔اس تصریح کے باوجود مؤلف یہ بھی فرماتے ہیں "ساٹھ کوفی تو معیت میں چلنے کے انتظار میں ٹھہرے رہے جو بعد میں ان کے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔" اگر یہ ساٹھ کوفیوں والی بات صحیح ہے تو حسینی قافلہ میں جو مشکل سے سو نفوس پر مشتمل تھا زیادہ تر تعداد اُن کوفیوں کی ہوئی نہ کہ ان کے اہل خاندان کی۔(ص ۱۱۵ طبع دوم وص ۱۳۶ طبع سوم)

سلسلہ میں نہیں کی جاسکتی تھی مگر پیغمبر (صاحب) کے نواسہ، علی رضی اللہ عنہ کے فرزند اور ان کے اتنے اہلِ خاندان (کے مقتول ہو جانے) کا تعلق اور شمول چونکہ اس حادثہ میں تھا اس لئے "حسین رضی اللہ عنہ" کے دلی حامیوں نے جو اپنی درخواستوں (دعوت ناموں) کی بنا پر اس حادثہ فاجعہ کا اصلی اور حقیقی سبب ہوئے تھے (انہوں نے بعد میں) اس کو ایک المیہ بنالیا اور واقعات نے تدریجاً ایک فسانہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ "عمر بن سعد" اور اس کے فوجی افسروں کو "عبید اللہ" (بن زیاد) کو حتیٰ کے "یزید" کو بھی قاتل سمجھا جانے لگا۔"

(ص ۲۹، ج ۱، "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" گیارھواں ایڈیشن)

("خلافت معاویہ و یزید" ص ۱۹۹، ۱۹۸، طبع دوم و ص ۲۴۳ تا ۲۴۴ طبع سوم)

ولندیزی محقق "دے خویۓ" نے صحیح کہا ہے کہ:

"جب اس حادثہ کے بیانات نے افسانہ کی سی نوعیت اختیار کر لی ابن سعد کو بھی قاتل کہا جانے لگا۔"[۵۳]

("خلافت معاویہ و یزید" ص ۲۱۳ طبع دوم و ص ۲۶۱ طبع سوم)

53۔ مؤلف کو "دے خویۓ" کی تحقیق مبارک، لیکن مسلمانوں کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ بیان کافی ہے کہ:

حدثنا موسى ثنا سليمان بن مسلم أبو المعلي العجلي قال سمعت أبي أن الحسين لما نزل كربلاء فأول من طعن في سرادقه عمر بن سعد فرأيت عمر بن سعد وابنيه قد ضربت أعناقهم علقوا على الخشب ثم ألهبت فيهم النار. (تاريخ صغير)

ہم سے موسیٰ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہمیں "سلیمان بن مسلم ابو المعلی عجلی" نے بتایا کہ میں نے اپنے والد سے سنا فرماتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا میں فروکش تھے تو سب سے پہلے جس شخص نے ان کے سراپردہ میں نیزہ مارا وہ عمر بن سعد تھا، پھر میں نے (یہ منظر بھی) دیکھا کہ عمر بن سعد اور اس کے دونوں بیٹوں کی گردنیں ماری گئیں اور انہیں شہتیر پر لٹکا کر نذر آتش کر دیا گیا۔

بقول محقق ''دے خوئے'':

''حادثہ کربلا نے رفتہ رفتہ اور تدریجاً افسانہ کی شکل اختیار کرلی وضعی روایتوں اور مسلسل پروپیگنڈے، مثالب کی لغو حکایتوں، مناقب کی جھوٹی حدیثوں سے واقعاتِ تاریخ مسخ صورت میں پیش کیے گئے حقیقت تعصّبات کے پردوں میں روپوش ہوگئی اور ایسی فضا پیدا کردی گئی کہ سبّ و شتم کے سوائے کسی کو کچھ یاد نہیں رہا اور اب تو یہ نوبت آپہنچی ہے کہ

انہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ ''ابن معاویہ'' مے نوش و فاسق اور ستمگر تھا

(خلافت معاویہ و یزید ص ۳۶۵، ۳۶۴، طبع دوم و ص ۵۰۸ طبع سوم)

حادثہ کربلا کی اصل حقیقت بے لاگ تحقیق کے مطابق

ارشاد ہوتا ہے:

''انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے اچانک قاتلانہ حملہ کر دیا گیا۔''[۵۴]

آزاد اور بے لاگ محققین و مستشرقین نے بے لاگ تحقیق سے اسی بات کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کے فوجیوں پر اس طرح اچانک حملہ سے یہ حادثہ محزون پیش آگیا۔

''انسائیکلوپیڈیا آف اسلام'' کے مقالہ نویسوں نے کہا ہے کہ:

''گورنر (کوفہ) ''عبید اللہ بن زیاد'' کو ''یزید'' نے حکم دیا تھا کہ (حسینی

54۔ یہ ایسی غلط بیانی ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔

قافلہ) کے ہتھیار لے لینے کی تدابیر کرے اور (صوبہ) عراق میں ان کے داخل ہونے اور جھگڑا اور انتشار پھیلانے سے باز رکھے۔ کوفہ کے "شیعان علی" میں سے کوئی مدد کو کھڑا نہ ہوا۔ حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے سے بدرجہا طاقتور فوجی دستہ پر جو ان سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا غیر مآل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا۔"[۵۵]

(ص ۱۱۶۲)("خلافت معاویہ و یزید" ص ۲۱۲،۲۱۱، طبع دوم و ص ۲۵۹ طبع سوم)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

55۔ اسی کے ساتھ مؤلف کا یہ بیان بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"بہر حال حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طہارت طینت کی برکت تھی کہ آپ نے بالآخر اپنے موقف سے رجوع کر لیا..... حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ سعادتِ کبریٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خروج عن الجماعت کے شر سے محفوظ رکھا اور بالآخر اس کی توفیق ارزانی فرمائی کہ جماعت کے فیصلے کی حرمت برقرار رکھنے کا اعلان کر دیں، اقدام خروج میں آپ نے غلطی کی تھی مگر آخر میں جب خروج پر ابھارنے والوں کی غداری عیاں ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے برادر بزرگوار (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) کے منشا کے مطابق، خیر خواہوں اور ہمدردوں کی رائے کے موافق اور کتاب و سنت کی روشنی میں واجب تھا۔"

(ص ۱۷۹،۱۷۸، طبع دوم و ص ۱۹۳ تا ۱۹۵ طبع سوم)

جائے غور ہے دمِ آخریں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طہارت طینت اور ان کی سعادت کبریٰ کا اعتراف کرتے ہوئے کس سادگی کے ساتھ مؤلف نے ان پر قاتلانہ حملہ کا الزام عائد کیا ہے۔

مناقب یزید

پہلے یہ پڑھ لیجئے:

"اغانی" کے غالی مؤلف نے امیر یزید کی اس غیرت و حمیت ملیہ اور حرارت دینیہ کے متعلق کہ نبی اکرم ﷺ کے میزبان اور محترم صحابی کی نعش کی بے حرمتی کا خیال بھی برداشت نہ کر سکے، بے خوف و خطر رومیوں کے ہجوم پر حملہ آور ہوئے، یہ لغو توجیہ کی ہے کہ رومی کیمپ میں چونکہ قیصر روم اور جبلہ بن یہم کی خوبصورت بیٹیاں موجود تھیں ان پر ہاتھ ڈالنے اور قبضہ کرنے کا جذبہ اس بے باکانہ حملہ کا محرک اصلی تھا۔ اس قول کی رکاکت خود ہی عیاں ہے، بعض مستشرقین نے جنہیں خلفائے اسلام کی تنقیص کی حکایتیں بیان کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔

"اغانی" کے حوالہ سے یہ حکایتیں نقل کی ہیں، پروفیسر ہتی نے بھی امیر یزید کے بارے میں اس حکایت کو بیان کیا ہے لیکن دوسری جگہ حاشیہ پر یہ بھی فرما دیا کہ: "اغانی وغیرہ کی ان روایات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے جو خلفاء کی رنگین زندگی سے متعلق ہوں۔"

(ص ۳۱۴، ۳۱۳، طبع دوم و ص ۱۹۳ تا ۱۹۵ طبع سوم)

یہ بھی مؤلف کے بے لاگ ریسرچ کا ایک نمونہ ہے کہ مستشرقین کی اس حرکت ناشائستہ کو تسلیم کر لینے کے باوجود جب بھی اپنی کتاب میں ان سے کچھ نقل کرتے ہیں پہلے ان کو "آزاد اور بے لاگ محقق" کہہ کر ان کی جناب میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت عثمان، حضرت علی، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں جب یہ مستشرقین کچھ بکواس کریں تو

مؤلف ان کی بات کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اسے حرفِ آخر سمجھیں اور انہیں آزاد اور بے لاگ محقق بتائیں لیکن یہی لوگ جب مؤلف کے ممدوح امیر یزید کے متعلق زبان چلانے لگیں تو ان کی شہادت نا قابلِ اعتبار ٹھہرے کیونکہ ''ان کو خلفاء اسلام کی تنقیص کی حکایتیں بیان کرنے میں مزہ آتا ہے۔''

یہ واضح رہے کہ یہ ''رنگین زندگی کے واقعات'' مؤلف کے ممدوح یزید جیسے لوگوں ہی کے متعلق ہو سکتے ہیں اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بابت تو اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

عرب کا سورما

عباسی صاحب رقم طراز ہیں:

''جہاد قسطنطنیہ'' میں سپہ سالار لشکر [56] امیر یزید نے حسنِ انتظام اور ذاتی شجاعت و شہامت کا ثبوت دیا اور امتیازی درجہ حاصل کیا جس کی بنا پر ملت کی طرف سے ''فتی العرب'' (عرب کا سورما) کا خطاب پایا۔ امیر یزید ہی عرب کے پہلے شخص ہیں جنہیں یہ خطاب دیا گیا [57]۔ امیر یزید کے اس خطاب ''فتی العرب'' کو تو پروفیسر ہتّی نے بھی تسلیم کیا ہے۔''

(''ہسٹری آف دی عربس'' ۲۰۱) (''خلافت معاویہ و یزید'' ص ۲۹ طبع دوم و ص ۳۶ طبع سوم)

56۔ لیکن سنن ابی داؤد کتاب الجہاد میں جو روایت مذکور ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے فرزند نامدار عبدالرحمن بن خالد تھے۔

57۔ واقعی بجا ہے یزید سے پہلے عرب میں کوئی سورما ہوا کب؟ یہی شیعوں کا اس نعرہ کا اصل جواب کہ ''لا فتیٰ إلا علي، لا سیف إلا ذو الفقار۔''

یزید کی شجاعت وبسالت

””مشہور یورپین مؤرخ ”ایڈورڈ گبن“ نے اپنی تالیف ”تاریخ عروج وزوالِ رومتہ الکبریٰ“ میں امیر یزید کے جہادِ قسطنطنیہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی شرکت اور وفات پانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس معرکۂ جہاد میں (امیر المؤمنین) معاویہ رضی اللہ عنہ کے فرزند یزید کی موجودگی اوران کی شجاعت وبسالت کی مثال اس وقت اسلامی فوج کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کا موجب اور سبب بن گئی تھی، اس مؤرخ نے یہ بھی بالصراحت بیان کیا ہے کہ (حضرت) حسین رضی اللہ عنہ بھی قسطنطنیہ کے اس اولین جہاد میں موجود تھے۔ ”گبن“ کے الفاظ یہ ہیں:

> ””حسن رضی اللہ عنہ [۵۸] کے چھوٹے بھائی حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے جرأت ودلیری کا کچھ نہ کچھ [۵۹] حصہ ورثہ میں پایا تھا اور عیسائیوں کے خلاف قسطنطنیہ کے جہاد میں امتیازی خدمت انجام دی تھی۔“(ص تاریخ عروج وزوال رومتہ الکبریٰ، گبن)
> (”خلافت معاویہ ویزید“ ص ۳۱۵ طبع دوم وص ۴۳۴ طبع سوم)

یزید کے اوصافِ حمیدہ

””علم وفضل، تقویٰ وپرہیزگاری، پابندی صوم وصلوۃ کے ساتھ امیر یزید حد درجہ کریم النفس، حلیم الطبع، سنجیدہ ومتین تھے۔ ایک عیسائی رومی مؤرخ نے ان کی سیرت کے بارے میں ان کے ہم عصروں کا بیان ان الفاظ میں لکھا ہے:

58۔ یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر تعریض تو نہیں ہے؟

59۔ یہ ”کچھ نہ کچھ“ کی بھی ایک ہی رہی۔

"وہ (یعنی امیر یزید) حد درجہ حلیم و کریم، سنجیدہ و متین، غرور و خود بینی سے مبرا، اپنی زیر دست رعایا کے محبوب، تزک واحتشام شاہی سے متنفر تھے۔ عام شہریوں کی طرح سادہ معاشرت سے زندگی بسر کرنے والے اور مہذب تھے۔"

("انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" ص ۱۱۶۳)

("خلافت معاویہ ویزید" ص ۴۹ طبع دوم ص ۶۲ طبع سوم)

یزید کی محبوبیت

"الغرض والد محترم کی تربیت نے اس ذہین فرزند کی فطری صلاحیتوں کے سنوارنے اور خیر القرون کے بقیہ صحابہ وتابعین کی مجلسوں اور صحبتوں کے ماحول کے اثرات نے امیر یزید کی سیرت میں وہ پاکیزگی پیدا کی کہ غیر مسلم مؤرخ بھی ان کے حلم و کرم، رحمدلی اور دیگر صفات حسنہ کے معترف ہیں جیسا کہ ایک رومی مؤرخ نے بتایا ہے کہ امیر یزید پبلک اور عوام کے کس درجہ محبوب تھے۔"

(ص ۲۰۸ طبع دوم، ۴۲۳، ۴۲۲ طبع سوم)

سیرت یزید پر آزاد اور بے لاگ رائیں

سیرتِ یزید کے بارے میں غیر مسلم مؤرخین و محققین کی رائیں ہی یقیناً آزاد اور بے لاگ رائیں ہوسکتی ہیں [60]۔ ان غیر مسلم مؤرخین کے بعض اقوال یہاں نقل کرنے بے جانہ ہوں گے۔

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے لائق مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

60۔ اگر کوئی مسلمان یزید کے بارے میں لکھ دیتا تو مؤلف بگڑ جاتے مگر یہ آزاد اور بے لاگ محققین کی تصریح ہے اس لیے مؤلف اس کو بسر و چشم ماننے کے لیے تیار ہیں۔

"یزید نہ تو غیر سنجیدہ اور بیہودہ شہزادہ تھا اور نہ ایسا لاابالی اور بے پرواہ حکمران جیسا ان مؤرخین نے بیان کیا ہے جو یا تو شیعوں کے بغض و عناد سے تاثر پذیر ہیں یا عراق و حجاز و شام کے سیاسی جھگڑوں کے حالات سے یا پھر اس کی بہت ہی مختصر سی مدت حکمرانی کے حادثہ کا اثر لئے ہوئے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ یزید نے (اپنے والد) معاویہ رضی اللہ عنہ کی پالیسی و طریقہ کار کو بدستور جاری رکھنے کی کوشش کی اور ان کے باقی ماندہ رفقاء کار کو قائم و برقرار رکھا، وہ خود شاعر تھا، موسیقی کا ذوق رکھتا تھا[61]، اہل ہنر اور شعراء کا قدردان اور ادب و آرٹ کا مربی اور سرپرست تھا۔

مملکت کے شمالی حصے میں اس نے نئی فوجی چھاؤنی "جند قنسرین" قائم کر کے ملک شام کے دفاع اور عسکری قلعۂ بندی کی تکمیل کی اور انتظامی نظام کو مکمل کر دیا۔ مالیات کی از سر نو تنظیم کی، نجرانی عیسائیوں کے جزیہ کی شرح کو جو خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ملک عرب سے تحکمانہ طور سے خارج البلد کیے گئے ہلکا کر دیا بر خلاف اس کے سامری یہودیوں پر جن کو ابتدائی فتوحاتِ اسلامی کے زمانہ میں بصلۂ خدمات جزیہ سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، جزیہ عائد کر دیا۔

یزید کو زراعت کی ترقی سے دلچسپی تھی، دمشق کے نخلستانی علاقہ غوطہ میں آبپاشی کے سسٹم کو مکمل کرنے کی غرض سے بالائی علاقہ میں ایک نہر کھدوائی جو اس کے نام سے "نہر یزید" کہلاتی ہے اور مضافات "سلیحیہ" کی اس سے آبپاشی ہوتی ہے۔ خلفاء اسلام میں تنہا یزید ہی ایسا خلیفہ ہے جس کو "مہندس" (نہر و کاریز کا ماہر و انجینیر) کا

61۔ اگر کوئی مسلمان یزید کے بارے میں لکھ دیتا تو مؤلف بگڑ جاتے مگر یہ آزاد اور بے لاگ محققین کی تصریح ہے اس لیے مؤلف اس کو بسر و چشم ماننے کے لیے تیار ہیں۔

لقب دیا گیا تھا۔

سیرت یزید کے پیش پا افتادہ تصویر کشی کے قطعاً خلاف مؤلف continutica by zantino arabica اپنی تالیف میں یہ تصویر پیش کرتا ہے:

''یزید حد درجہ متواضع و حلیم، سنجیدہ و متین، خود بینی و تکبر سے مبرا، اپنی زیر دست رعایا کا محبوب، تزک و احتشام شاہی سے متنفر، معمولی شہریوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرنے والا مہذب تھا۔[٦٢]

''دلہازن'' مؤرخ کا قول ہے کہ ''کسی بھی خلیفہ کی[٦٣] مدح و ثنا اس طور سے نہیں ہوئی یہ الفاظ تو دل کی گہرائیوں[٦٤] سے نکلے ہیں۔ (ص ۱۱۶۳، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

ایک اور بلند پایہ محقق ''انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا'' کے مقالہ نگار ''دے خوئے'' امیر یزید کی سیرت کے بارے میں رومی مؤرخ کے مندرجہ بالا الفاظ نقل کرنے کے بعد جن میں امیر موصوف کو طبعاً سنجیدہ و نرم خو و مہذب بتایا گیا ہے لکھتے ہیں[٦٥]:

''اس قول کی تصدیق اس امر واقعہ سے ہوتی ہے کہ معاویہ ثانی (فرزند یزید) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اپنے والد کی طرح نرم خو

62۔ یہاں طبع سوم میں حاشیہ پر مؤلف نے لکھا ہے کہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی تقریباً یہی الفاظ لکھے ہیں جو محض غلط ہے۔

63۔ خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا تو خیر سے ذکر ہی کیا، کیا خود یزید کے والد ماجد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور مروان کی بھی نہیں؟

64۔ ایک غیر مسلم مستشرق کے دل کی گہرائی سے تو ایسی ہی بات نکلے گی۔

65۔ یہ بتانے والا بھی غیر مسلم ہے۔

حکمران تھا۔ یزید کے مخالفین نے بغض و تعصب سے ان کے بارے میں جو بیان کیا ہے پھر روایتوں سے اور بھی رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں اس کی بہت کچھ تردید (رومی مؤرخ کے) اس بیان سے ہو جاتی ہے۔ شراب نوش ہونے کے اتہام کے خلاف تو خود یزید نے اس وقت جب ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں فوجی دستہ بھیج رہا تھا اپنے اشعار میں احتجاج کیا تھا۔ اس بارے میں فیصلہ کن شہادت تو ابن حنفیہ رضی اللہ عنہ (برادر حسین رضی اللہ عنہ) کی ہے جنہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اہلِ مدینہ نے جو الزامات (یزید کی شراب نوشی وغیرہ کے) لگائے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ یزید شکار کے شوقین تھے مگر وہ امن پسند و صلح جو اور فیاض و فراخ دل شہزادہ تھا۔" ("انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا"، گیارہواں ایڈیشن)

("خلافت معاویہ ویزید" ص ۳۲۶ تا ۳۲۷ طبع دوم و ص ۴۴۸ تا طبع سوم)

سیرت یزید پر ان غیر مسلم مؤرخین و محققین کی یہ آزاد اور بے لاگ رائیں قلمبند کرنے کے بعد آخر مؤلف کو خیال آہی گیا کہ کسی ایسے شخص کی رائے بھی اگر ان محققین کی تائید میں پیش کر دی جائے جو گو آزاد اور بے لاگ محقق نہ سہی تاہم مسلمان تو ہو، چنانچہ بعد از تلاش بسیار ایک ہمنوا اس سلسلہ میں ان کو فراہم ہو گیا، فرماتے ہیں:

"ان غیر مسلم محققین کے علاوہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیرتِ یزید کے بارے میں جو فقرات لکھے ہیں وہ آپ ابتدائی اوراق میں پڑھ چکے، ان سے ان بیانات کی پوری تائید ہوتی ہے کہ یزید کی ذات میں حلم و کرم، فصاحت و شجاعت کی عمدہ صفات تھیں اور ملک داری کے بارے میں عمدہ رائے رکھتے تھے۔"

("خلافت معاویہ ویزید" ص ۳۲۷ طبع دوم و ص ۴۴۸ طبع سوم)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی جو وقعت مؤلف کی نظر میں ہے پہلے اس کو ملاحظہ

کر لیجئے، ارشاد ہے:

"اب ایک اور علامہ وقت مؤرخ و محدث (ابن کثیر) کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو جنہوں نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا ہے کہ ابو مخنف کی روایتیں قابل اعتبار نہیں لیکن ابن جریر طبری جیسے ائمہ نے چونکہ ان کو درج کر دیا ہے اس لئے ہم بھی نقل کیے دیتے ہیں۔"

(ص ۱۲۲ طبع دوم و ص ۱۴۴ طبع سوم)

معلوم ہوا ابن کثیر رحمہ اللہ مؤلف کی نظر میں آزاد اور بے لاگ محقق نہیں ہیں۔ اب ابن کثیر رحمہ اللہ کے فقرات ملاحظہ ہوں، مؤلف ناقل ہیں:

وقد كان يزيد فيه خصال محمودة من الكرم والحلم والفصاحة والشعر والشجاعة وحسن الرأي في الملك وكان ذا جمال حسن المعاشرة.

(البداية والنهاية 8/ 230 و تاريخ الإسلام ذهبي 3/ 93)

اور یزید کی ذات میں قابل ستائش صفات حلم و کرم، فصاحت و شعر گوئی اور شجاعت و بہادری کی تھیں نیز معاملاتِ حکومت میں عمدہ رائے رکھتے تھے اور وہ خوبصورت اور خوش سیرت تھے۔

(ص ۴۹ طبع دوم و ص ۶۳ طبع سوم)

مؤلف فقرات تو ابن کثیر رحمہ اللہ کے لکھنے بیٹھے تھے اس لئے قاعدہ سے یہاں حوالہ صرف ان کی تصنیف "البدایہ والنہایہ" کا ہی ہونا چاہیے تھا مگر قلم نے جولانی دکھلائی تو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی "تاریخ الاسلام" کا حوالہ آگیا، لیجئے "یک نہ شد دو شد"، کیا چاہیے اب تو دو شاہد عادل مل گئے مگر یاد رہے اس دوسرے حوالہ کا وجود صرف مؤلف کے ذہن رسا میں ہے واقع میں اس کا وجود نہیں ہے کیونکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی جو کتاب "تاریخ الاسلام" کے نام سے حال میں مصر سے طبع ہو کر شائع

ہوئی ہے اس میں اس عبارت کا سرے سے پتہ ہی نہیں، البتہ ''البدایہ والنہایہ'' میں ان فقروں کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے:

وكان فيها أيضاً إقبال على الشهوات وترك بعض الصلوات في بعض الأوقات واماتتها في غالب الأوقات.

اور اس میں نفسانی خواہشوں پر ڈھلنا اور بعض وقت کسی نماز کا سرے سے چھوڑ دینا اور اکثر اوقات نمازوں کا بے وقت پڑھنا بھی تھا۔

لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے یہ فقرات چونکہ مؤلف کے ممدوح امیر یزید کی شخصیت کو مجروح کرتے تھے اس لئے ان کو قصداً نظر انداز کر دیا۔ یہ ہے مؤلف کی بے لاگ ریسرچ کا ادنیٰ نمونہ کہ صرف تعریف کو لے لیا اور تنقید کو چھوڑ دیا۔

دیکھا آپ نے۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

مستشرقین کی یہی لغویات ہیں جو اس کتاب کی جان ہیں اور جن کو مؤلف خیر سے بے لاگ تحقیقات سمجھ بیٹھے ہیں۔ ساری کتاب ان ہی لغویات کی شرح اور یہ ہفوات و خرافات اس کا متن ہیں۔ ان بے لاگ تحقیقات یا مفتریاتِ واہیہ پر ایک بار پھر نظر ڈالیئے اور غور فرمایئے کہ ان میں صداقت کا کہیں نام و نشان بھی ہے؟ عبارات مذکورہ صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مطاعن سے پُر نہیں بلکہ ان میں خلفاء ثلاثہ حضرات عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم پر بھی نازیبا اعتراضات ہیں، بس تعریف کے پُل باندھے گئے ہیں تو مؤلف کے ممدوح امیر یزید کے۔ اس ''بے لاگ تحقیقات'' کے متعلق سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے جو مؤلف نے ابو مخنف وغیرہ کے بیانات کے بارے میں کہا ہے کہ:

"یہ بیانات نا قابلِ اعتبار حقیقت سے بعید، بلکہ طبع زاد ہیں۔ کچھ کذب وفترا ہے، کچھ کذب حق نما ہے۔" ("خلافت معاویہ ویزید" ص ۱۹۸ طبع دوم وص ۲۴۲ طبع سوم)

واقعہ یہ ہے مؤلف کے یہ الفاظ ابو مخنف سے زیادہ ان مستشرقین کے بیانات پر چسپاں ہیں چنانچہ حسب ذیل امور:

۱۔ نجرانی عیسائیوں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تحکمانہ طور پر خارج البلد کیا جانا۔

۲۔ معاملہ فہم لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرنا۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کی جانشینی کا استحقاق فی الواقع حاصل نہ ہونا۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طلب خلافت میں تقدس و پارسائی کے جذبہ کا کار فرمانہ ہونا۔

۵۔ معاملہ فہم لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرنے کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دینا۔

۶۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید سے بیعت کر لینا۔

۷۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا (نعوذ باللہ) اخلاق رذیلہ حبِ جاہ، شیخی، فخر و نمائش وغیرہ میں مبتلا ہونا۔

۸۔ عمر بن سعد اس کے فوجی افسروں ابنِ زیاد اور یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری سے بالکل بری قرار دینا۔

۹۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مٹھی بھر متبعین کا انتہائی ناعاقبت اندیشی سے فوجی دستہ کے سپاہیوں پر جو ہتھیار رکھوانے کی غرض سے گھیرا ڈالے ہوئے تھے اچانک قاتلانہ حملہ کر دینا۔

یہ سب کذب وافترا کی بدترین مثالیں ہیں اور یزید کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کذب حق نما کا پُر فریب نمونہ ہے۔

یزید کے اوصافِ حمیدہ کا جو نقشہ مستشرقین نے کھینچا ہے اگروہ صحیح ہے (اور) مؤلف کے نزدیک یقیناً صحیح ہے کہ ”غیر مسلم مؤرخین و محققین کی رائیں ہی یقیناً آزاد اور بے لاگ رائیں ہو سکتی ہیں“ تو ہمیں مؤلف کی فہم عالی پر تعجب ہوتا ہے کہ ان بے لاگ محققین کے علی الرغم انہوں نے اس کتاب میں اپنے ممدوح کے متعلق بعض ایسے نازیبا واقعات درج کر دیئے ہیں جن سے ان کی تمام مذکورہ بالا تصریحات پر پانی پھر جاتا ہے۔

یزید کی تواضع ومتانت کے دواہم واقعے

مثلاً تواضع اور متانت و سنجیدگی کے سلسلہ میں ذیل کے یہ دو واقعے جن کو مؤلف نے بڑی اہمیت دے کر بیان کیا ہے اور جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مؤلف کے ممدوح کا اپنے استاد محترم مربی واتالیق نیز اپنے عم بزرگوار کے ساتھ کیا طرزِ عمل تھا۔ پہلا واقعہ مؤلف نے ”تعلیم و تربیت“ کے زیر عنوان اپنے ممدوح کی ثنا و صفت کرتے ہوئے اس طرح سپرد قلم کیا ہے:

> ”خوش بیان و حاضر جواب تھے۔ بچپن کا واقعہ ہے ان کے اتالیق نے کسی خطا پر سرزنش کی تھی استاد شاگرد میں یہ گفتگو ہوئی:
>
> فقال له مؤدبه: أخطأت يا غلام!
>
> فقال يزيد: الجواد يعثر.
>
> فقال المؤدب: إي والله! يضرب فيستقيم.
>
> فقال يزيد: إي والله فيضرب أنف سائسه.
>
> (ص ۳ ج ۴ ”قسم انساب الاشراف“ بلاذری مطبوعہ یروشلم)
>
> اتالیق نے کہا: اے لڑکے! تو نے خطا کی۔

یزید نے کہا: اصیل گھوڑا ہی ٹھوکر کھاتا ہے۔
اتالیق نے کہا: ہاں واللہ کوڑا کھاتا ہے تو سیدھا ہو جاتا ہے۔
یزید نے کہا: ہاں واللہ پھر تو اپنے سائیس کی ناک پھوڑ ڈالتا ہے۔"
("خلافت معاویہ ویزید" ص ۲۸۶، ۲۸۷ طبع دوم و ص ۳۹۹ طبع سوم۔)

ظاہر ہے کہ اس مودبانہ گفتگو پر اتالیق تو یزید کی تواضع اور سنجیدگی کا دل سے معترف ہو گیا ہو گا اور اس طرزِ عمل کے ہوتے ہوئے سعادت مند شاگرد نے استاد سے جو کسبِ فیض کیا ہو گا اس کا تو کہنا ہی کیا۔ دوسرا واقعہ مؤلف نے "خطابت" کے زیرِ عنوان اس طولانی تمہید کے ساتھ لکھا ہے:

"صحابہ کرام و علماء و صلحاء کی صحبتوں کے علاوہ جس کا مختصر ذکر ابتدائی اوراق میں ہو چکا ہے امیر یزید ریعانِ سن سے اپنے والد محترم کی مجالس میں بالالتزام حاضر رہتے جو ان جیسے ذہین و فطین تاثر پذیر اور اخاذ طبیعت کے نوجوان کے لئے درس گاہ کی حیثیت رکھتیں۔ سالہاسال یہ سلسلہ جاری رہا، ان ہی مجالس میں سے ایک مجلس کا یہ لطیفہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب ایک مرتبہ امیر زیاد اپنے صوبہ (عراق) سے دمشق آئے اور زرِ کثیر نیز جواہر سے مملو ایک صندوقچہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پیش کیا وہ اس سے خوش ہوئے، امیر زیاد نے کھڑے ہو کر تقریر کی جس میں اپنے زیر حکومت علاقہ میں نظم و ضبط قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنے حسن کار گزاری کا مؤثر پیرایہ میں تذکرہ کیا۔ امیر موصوف اعلیٰ پایہ کے مدبر و منتظم ہونے کے علاوہ زبردست خطیب بھی تھے۔ امیر یزید بھی اس مجلس میں موجود تھے، اس لن ترانی کو سن کر ان سے رہا نہ گیا، امیر زیاد کی تقریر کے بعد کھڑے ہوئے اور نہایت جامع الفاظ میں صرف تین فقرے ایسے بلیغ کہے کہ زیاد سٹپٹا کے رہ گئے۔ وہ فقرے سنانے سے پہلے ناظرین کو یاد دلاؤں کہ زیاد ابتداءً دفتری خدمات پر مامور ہوئے

تھے ان کے مادری نسب کے بارے میں تین مختلف روایتیں ہیں جن میں سے ایک یہ روایت بھی علامہ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف (ص ۱۲۵)[66] میں بزمرۂ اولاد ابو سفیان بعنوان "زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ تعالیٰ"[67] بیان کی ہے کہ زیاد کی ماں "سمیہ" نامی ایک عجمی کنیز مقام "زندرود" (ایران) کی رہنے والی وہاں کے شہنشاہ کسریٰ کی حواری میں سے تھی جسے شہنشاہ مذکور نے یمن کے ایک حکمران ابو الخیر بن عمرو الکندی کو ہبہ کر دیا تھا۔ یہ یمنی حکمران جب ایران سے یمن واپس جاتا ہوا طائف سے گزر رہا تھا اتفاقاً بیمار پڑ گیا وہاں کے طبیب حارث بن کلدۃ بن عمرو بن علاج ثقفی کے علاج معالجہ سے شفایاب ہوا۔ اس کامیاب علاج کے صلے میں اس نے اس کنیز کو بھی طبیب مذکور کو دیدیا۔ طبیب خود عقیم تھا، اس کے غلام سے دو بیٹے ابو بکر نفیع رضی اللہ عنہ اور نافع ہوئے، اول الذکر کو صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اپنے کو "مولی رسول اللہ ﷺ" کہا کرتے تھے۔ ان کے باپ کے فوت ہو جانے پر ان کی ماں "سمیہ" کا زمانہ جاہلیت کے پانچ مروجہ

66۔ کتاب المعارف (ص 125 پر) بزمرہ اولاد ابی سفیان نہیں بلکہ حضرت ابو بکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ کے تذکرہ کے ضمن میں جو زیاد کے اخیافی (ماں شریک) بھائی تھے۔

67۔ بے شک المعارف (ص ۱۵۱) میں زیاد کے لئے "رحمہ اللہ تعالیٰ" کے الفاظ ہیں جو اگر مؤلف کے قلم سے ہیں تو ان کی ناصبیت کی غمازی کرتے ہیں اور زیاد کے ساتھ ان کی عقیدت کے ترجمان ہیں۔ ابن قتیبہ کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "لسان المیزان" میں تصریح بھی کی ہے کہ:۔

فإن في ابن قتيبة انحرافاً عن أهل البيت.

ابن قتیبہ میں اہل بیت سے انحراف ہے۔

نکاحوں میں سے ایک قسم کا نکاح ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے ہوا جس سے زیاد پیدا ہوئے۔[٦٨]

68۔ یہ بات کہ ان کے باپ کے فوت ہو جانے پر ان کی ماں ''سمیہ'' کا زمانۂ جاہلیت کے پانچ مروجہ نکاحوں میں سے ایک قسم کا نکاح ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے ہوا جس سے زیاد پیدا ہوئے ''معارف ابن قتیبہ'' میں مذکور نہیں نہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں (ص ۱۲۵ پر) اس کا پتہ ہے اور نہ (ص ۱۵۱ پر) ''زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ تعالیٰ'' کے زیر عنوان۔ جناب مؤلف نے اپنی طرف سے اس عبارت کو بڑھا کر خواہ مخواہ یزید کی تکذیب کی۔ یزید کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ''ہم نے زیاد کو ثقیف کی ولاء سے قریش کی طرف اور زیاد بن عبید کے انتساب سے حرب بن امیہ کی طرف منتقل کر دیا۔''

''ولاء'' نصرت کے اس تعلق کو کہتے ہیں جو غلام کے آزاد ہو جانے کے بعد اس کو اپنے مولی و آقا سے باقی رہتا ہے اور جس کی بنا پر اگر اس آزاد کردہ شخص کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث اس کے مولی یعنی آزاد کرنے والے کو پہنچتی ہے۔ زیاد کی ماں سمیّہ حارث بن کلدۃ ثقفی کی کنیز تھی (''الاستیعاب فی اسماء الاصحاب'' از حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ) اس کا باپ عبید قبیلہ ثقیف کا غلام تھا۔ زیاد کا ایک شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے باپ عبید کو ایک ہزار درہم خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ (الاستیعاب) چونکہ یہ اپنے باپ عبید کے یہاں پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو زیاد بن عبید کہا جاتا تھا (''الاصابہ فی تمیز الصحابہ'' از حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ) اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یزید کا مطلب ان طعنوں سے کیا تھا اور وہ زیاد پر کیا چوٹ کر رہا تھا؟۔ بات واضح ہے وہ برملا کہہ رہا ہے کہ زیاد ''یہ محض ہماری بندہ پروری ہے کہ ہم نے تجھ کو ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی اولاد بتا کر حرب بن امیہ کی نسل میں شامل کر لیا اور ہماری اس کارروائی کی بنا پر تیرا اشمار خاندانِ قریش میں ہونے لگا ورنہ تیری حقیقت کیا تھی، تو قبیلہ ثقیف کے عبید نامی ایک غلام کا لڑکا تھا، چنانچہ اسی قبیلہ سے تیرا ولاء کا تعلق تھا۔'' مؤلف یہاں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے نکاح کی داستان سنانے بیٹھ گئے، ظاہر ہے کہ اگر ان سے اس کی ماں کا نکاح ہوا ہوتا تو وہ اپنے لخت جگر کو مرتے دم تک اس طرح ایک غلام کی فرزندی میں کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ ان کو تو چاہیے تھا کہ عہد نبوی ﷺ ہی میں اس مسئلہ کو اُٹھاتے اور

جاہلیت کے مروجہ نکاحوں میں سے کسی نکاح سے جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب اسلامی شریعت کے مطابق تسلیم کیا جائے گا۔

امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی اصول کے تحت امیر زیاد کا نسب بعد تحقیقات شرعی تسلیم کیا اور انہیں اپنے والد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا اور اپنا بھائی سمجھا۔

ان توضیحی کلمات کے بعد اب وہ روایت علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ میں سنیئے فرماتے ہیں۔ کہ امیر یزید نے امیر زیاد کو مخاطب کر کے کہا:

إن تفعل ذلك يا زياد! فنحن نقلناك من ولاء ثقيف إلى قريش، ومن القلم إلى المنابر، ومن زياد بن عبيد إلى حرب بني أمية. فقال له معاوية: اجلس فداك أبي وأمي. (البداية والنهاية: 8/ 22/)

اے زیاد! تم نے یہ سب کچھ کیا تو (تعلّی کیوں ہے) کیونکہ ہم ہی تو

اپنے نور دیدہ کو اپنی فرزندی میں لے لیتے یا پھر شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اس کا اظہار کرتے تا کہ شرع کے مطابق اس غریب کا نسب ثابت ہو جاتا۔ یہ عجیب نکاح ہے جس کا نہ ناکح کو پتہ ہے نہ منکوحہ کو، نہ خود اس لڑکے کو جو اس نکاح سے پیدا ہوا، بس ایک مؤلف کو معلوم ہے۔ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ جو زیاد کے ماں جائے بھائی تھے اور جن کے متعلق خود مؤلف کو اعتراف ہے کہ "ان کو صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہ اپنے کو مولی رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے۔"

ان کی تصریح تو اس بارے میں یہ ہے کہ "خدا کی قسم! میں نہیں جانتا کہ سمیّہ نے کبھی ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی صورت بھی دیکھی ہو۔" (الاستیعاب)

مگر مؤلف کو سمیّہ سے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے نکاح پر اصرار ہے، جو بات مؤلف کو معلوم ہے اگر خود یزید یا زیاد کو معلوم ہو جاتی تو نہ یزید زیاد کو اس طرح بر سر عام ذلیل کرتا اور نہ زیاد یہ طعنہ سن کر اس طرح سٹپٹا جاتا بلکہ ایسا دندان شکن جواب دیتا کہ یزید دم بخود ہو کر رہ جاتا۔ بہر حال اس واقعہ سے یزید کی شرافت کا حال کھلا کہ جس کو چچا بنایا اس کے ساتھ اس طرح بد تمیزی سے پیش آیا۔

ہیں جنہوں نے تم کو (قبیلہ) ثقیف کی (تعلق حلیفی ورشتہ [۶۹]) سے
ہٹا کر قریش میں ملایا اور قلم (کی گھس گھس اور خدمتِ کاتب) سے
منبر پر (حاکم و گورنر کی حیثیت میں) پہنچایا اور زیاد فرزندِ غلام
سے حرب بن امیہ کے اخلاف میں شامل کیا (تو پھر تم کیا دون [۷۰]
کی لیتے ہو) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر بیٹے سے کہا
بس اب بیٹھ جاؤ تم پر میرے ماں باپ قربان۔"

("خلافت معاویہ و یزید" ص ۲۹۰ تا ۲۹۲ طبع دوم و ص ۴۰۲ تا ۴۰۴ طبع سوم)

یہ ہے حد درجہ متواضع و حلیم، سنجیدہ و متین، خود بینی و تکبر سے مبرّا ایک سعادت مند بھتیجے کا کردار اپنے عم بزرگوار کے ساتھ، اور چچا جان پر یزید کے ان جملوں کا جو اثر ہوا وہ خود مؤلف نے بیان کر دیا ہے کہ "زیاد سٹپٹا کے رہ گئے۔"

زیاد کی جس حسن کارگزاری کا ابھی ذکر آیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد تقریباً بیس سال تک مسند
خلافت پر متمکن رہے اور بے نظیر حسنِ تدبر سے تمام فتنہ پرورانہ
سرگرمیوں کو دور کر کے ہر خطۂ مملکت میں امن و امان کو بحال کیا۔
سب سے زیادہ ابتر حالت شرقی ممالک کی تھی، وہاں کا نظم و نسقِ
حکومت درست کرنے کے لئے اپنے سوتیلے بھائی امیر زیاد کو متعین کیا
جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے سے گورنر فارس تھے [۷۱]

69۔ "ولاء" کا ترجمہ یہاں مؤلف نے صحیح نہیں کیا۔ یہاں "ولاء" کے لفظ سے مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔

70۔ مؤلف کی تحقیق علمی کا یہ حال ہے کہ آپ نے لفظ "عبید" کا بھی ترجمہ فرما دیا ہے جو کہ زیاد کے باپ کا نام ہے پھر لطف یہ ہے کہ "عبید" مصغر ہے اور ترجمہ میں تصغیر کی رعایت نہیں، ترجمہ ہی کرنا تھا تو "غلمٹا" لکھتے۔ سچ ہے: "عیب کردن را ہنر باید۔"

71۔ جب زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے سے گورنر فارس تھا تو یزید کا اس کو یہ طعنہ دینا کہ "ہم نے تجھ کو قلم کی گھس گھس اور خدمتِ کاتب سے منبر پر حاکم و گورنر کی حیثیت میں=
=پہنچا دیا۔" "دروغ گویم بر روئے" تو کا مصداق نہیں تو کیا ہے۔

اور حسنِ انتظام کی بدولت ایرانی رعایا ان کو "نوشیر وان ثانی" کہتی تھی۔[72] (ص ۲۸۵ "جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی" ۱۹۸۰ء مقالۂ ایڈورڈ تھامس) اپنے بھائی کی طرح امیر زیاد بحیثیت مدبر و منتظم حکمراں عظیم شخصیت کے حامل تھے، مفسدین کے لئے درشت مزاج امن پسندوں کے لئے نرم خو۔" ("خلافت معاویہ و یزید" ص ۳۳۸ طبع دوم و ص ۴۷۹ طبع سوم)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ملت کی سربراہی اپنے وقت میں جیسی آل ابوسفیان کی کامیاب رہی اس کا ثبوت کتب تاریخ کے علاوہ آثار قدیمہ سے بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ خلافت میں نہیں لیکن کاروبارِ خلافت اور انتظام مملکت کی بہترین انجام دہی میں (نیز داخلی فتنوں کے سدِّ باب میں[73]) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی امیر زیاد اور ان کی اولاد کا ممتاز حصہ رہا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ حزن انگیز میں امیر ابن زیاد کو متہم کیا جاتا ہے لیکن بے لاگ تحقیق میں ان کا کوئی قصور ثابت نہیں ہوتا۔"[74]

72۔ یہ ان میل بے جوڑ بات مؤلف جیسا بے لاگ محقق ہی کہہ سکتا ہے کہ "زیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے سے گورنر فارس تھے اور حسن انتظام کی بدولت ایرانی رعایا ان کو نوشیروان ثانی کہتی تھی"، مگر پھر بھی "سب سے زیادہ ابتر حالت شرقی ممالک کی تھی" کہ جن میں فارس داخل ہے۔

73۔ "طبع سوم" میں بین القوسین الفاظ کو نکال دیا ہے۔

74۔ مؤلف کو زیاد اور اس کے بیٹے عبد اللہ بن زیاد سے اس لئے عقیدت ہے کہ ان دونوں باپ بیٹوں نے آلِ علی رضی اللہ عنہ اور محبانِ اہل بیت پر وہ مظالم ڈھائے ہیں کہ خدا کی پناہ، مؤلف کے ممدوح امیر زیاد کے متعلق حافظ ابن حبان صاحب الصحیح کے کتاب "الضعفاء" میں یہ الفاظ ہیں: =

(ص ۳۵۰،۳۴۹ طبع دوم وص ۴۹۲ طبع سوم)

یزید کے حلم وکرم کے دو نمونے

یزید کے حلم وکرم کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے ان اشعار کو پڑھیئے جو مؤلف نے "حکومت کا نرم رویہ" کے زیر عنوان اس تمہید کے ساتھ درج کئے ہیں:

"مکہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ چار مہینے سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور اس تمام مدت میں عراقیوں کی تحریرات اور ان کے وفود آتے جاتے رہے، خروج کی تیاریاں ہوتی رہیں، لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا نہ ان کی نگرانی ہوئی، نہ عراقیوں کو ان کے

=ظاهر أحواله المعصية، وقد أجمع أهل العلم على ترك الاحتجاج بمن كان كذلك.

(میزان الاعتدال، ترجمہ زیاد بن ابیہ)

اس کے ظاہری حالات معصیت کے ہیں اور اہل علم کا اتفاق ہے کہ جو ایسا ہو اس کی روایت سے حجت پکڑنا متروک ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی "لسان المیزان" میں رقم طراز ہیں:

لم ينقل أنه رأى النبي صلى الله عليه وسلم فهو من نمط مروان بن الحكم والمختار بن أبي عبيد والعجب أن هؤلاء الثلاثة أسنانهم [۱] متقاربة وكذا نسبتهم إلى الجور في الحكم وكل منهم ولي إلا مرة وزاد مروان أنه ولي في آخر عمره الخلافة. (ترجمه زياد بن أبيه)

یہ منقول نہیں کہ زیاد نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہو، پس یہ بھی مروان بن الحکم اور مختار بن ابی عبید کی طرح ہوا اور یہ عجیب بات ہے کہ ان تینوں کی عمریں بھی قریب قریب ہیں اور اسی طرح اپنے دورِ حکومت میں جور وستم کی نسبت میں بھی (ملتے جلتے) ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو امارت ملی ہے اور مروان اس حیثیت سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں متولی خلافت بھی ہوا۔

(۱) لسان المیزان کے مطبوعہ نسخہ میں "أسنانهم" کے بجائے "أنسابهم" غلط طبع ہو گیا ہے۔

پاس آنے جانے سے روکا گیا حتیٰ کہ نہ اسلحہ وغیرہ کی فراہمی پر کوئی قدغن کیا گیا، قوی آثار سے ظاہر ہے کہ خود امیر یزید نے ان کو مخاطب کیا اور اللہ کا عہد یاد دلایا جیسا کہ اس قطعۂ اشعار میں صاف اشارہ ہے جو امیر موصوف نے باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھ کر بھیجے تھے ۷۵،

75۔ مؤلف نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہر شخص سمجھ جائے گا کہ ان اشعار میں یزید کا روئے سخن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف ہے کیونکہ وہ ان ہی کا نام لے رہا ہے اور ان کی ہی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کر رہا ہے لیکن بے لاگ محقق فرماتے ہیں کہ "یزید نے یہ اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھ کر بھیجے تھے۔" یزید کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے بھی مؤلف نے اپنے اسی خیال کا اظہار کیا ہے حالانکہ جن کتابوں کا وہ حوالہ دے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ تصریح نہیں کہ "یہ اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھے گئے تھے" نہ طبری نے یہ لکھا ہے، نہ ابن کثیر نے، نہ ناسخ التواریخ میں یہ تصریح مذکور ہے کہ یہ اشعار یزید نے اس خط میں لکھے تھے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ میں آمد پر اس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ بے لاگ محقق خود بھی اپنے قلم سے صرف تین چار صفحے پہلے یہی داد تحقیق دے آئے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

"امیر یزید کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی کہ عراق کے لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو طلب خلافت پر آمادہ کر رہے ہیں تو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جو اس وقت خاندانِ بنی ہاشم کے بزرگ اور سردار تھے تحریر بھیجی کہ حسین رضی اللہ عنہ کو تفرقہ ڈالنے کی کارروائی سے روکیں:

وكتب يزيد بن معاوية إلى ابن عباس يخبره بخروج الحسين إلى مكة، وأحسبه قد جاءه رجال من أهل المشرق فمنوه الخلافة، وعندك منهم خبر وتجربة، فإن كان قد فعل فقد قطع راسخ القرابة، وأنت كبير أهل بيتك والمنظور إليه، فاكففه عن السعي في الفرقة. (البداية والنهاية 8/ 164)=

=اور یزید ابن معاویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو مکہ خط لکھا

جس میں انہیں مطلع کیا کہ حسین رضی اللہ عنہ (مدینہ سے نکل کر) مکہ کو چلے گئے ہیں، اہل مشرق (یعنی عراقیوں) میں سے چند آدمی ان کے پاس آئے ہیں اور انہیں حصولِ خلافت پر آمادہ کیا ہے، آپ کو حالات کا علم اور تجربہ (سابقہ واقعات کا) ہے اگر واقعی ایسا ہے تو انہوں نے (یعنی حسین رضی اللہ عنہ نے) قرابت کے مضبوط رشتہ کو قطع کر دیا ہے، آپ اہلِ بیت کے بزرگ ہیں اور حسین رضی اللہ عنہ کے پسندیدہ شخص ہیں اس لئے آپ انہیں تفرقہ ڈالنے سے روکیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں جو تحریر امیر یزید کو بھیجی تھی جسے شیعہ مؤرخین نے مسخ کر کے بیان کیا ہے اس میں لکھا تھا:

إني لارجو أن لا يكون خروج الحسين لامر تكرهه، ولست أدع النصيحة له في كل ما تجتمع به الالفة وتطفي به الثائرة.
(البداية والنهاية: 8/ 164)

مجھے امید ہے کہ حسین کوئی ایسا خروج نہ کریں گے جو برائی کا موجب ہو اور میں انہیں اس بات کی نصیحت کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا جس سے الفت قائم رہے اور ہنگامہ کی آگ بجھ جائے۔

دیگر مؤرخین کے علاوہ ''ناسخ التواریخ'' کے غالی مؤلف میرزا محمد تقی سپہر کاشانی نے ''ذکر نگارش نامۂ یزید بعبداللہ بن عباس در امر حسین بن علی رضی اللہ عنہ'' کے عنوان سے جو مکتوب امیر المؤمنین یزید سے منسوب کر کے درج کیا ہے اس میں بھی حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے مدینہ سے مکہ چلے جانے کا ذکر کرتے ہوئے تقریباً وہی عبارت موجود ہے جو علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ وغیرہ نے لکھی ہے ......

آخر میں امیر موصوف کے وہ اشعار بھی درج کئے ہیں جو آئندہ اوراق میں = =''قطعۂ اشعار امیر یزید'' کے عنوان سے آپ مطالعہ کریں گے اور اسی کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی جانب سے جوابِ خط

بھی درج ہے جس کی ابتدائی سطور میں یہ لکھا ہے کہ ”حسین رضی اللہ عنہ کے مدینہ چھوڑ کر مکہ چلے آنے کا سبب یہ ہوا کہ مدینہ میں جو عمال تمہارے ہیں انہوں نے ناشائستہ کلمات ان کے بارے میں کہے ”وعجلوا علیه بالكلام الفاحش فأقبل إلى حرم الله مستجيراً به“ اس لئے وہ بیت اللہ میں پناہ لینے چلے آئے.........

یہ مکاتیب بین ثبوت ہیں عراقی سبائیوں کی ریشہ دوانیوں کے جو انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حصولِ خلافت پر آمادہ کرنے کے لئے شروع کیں، اور یہ خطوط جو شیعہ مؤرخین نے درج کئے ہیں مسکت ثبوت ہیں اس بات کا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تھا۔“

مؤلف کو ان خطوط کی صحت پر اس درجہ وثوق ہے کہ وہ ان کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف ”بین ثبوت“ اور ”مسکت ثبوت“ مانتے ہیں۔ ان خطوط میں کیا ہے؟ یزید کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر الزام اور وہ بھی کسی یقین کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے خیال و گمان پر چنانچہ خود اس کے الفاظ ہیں کہ:

وأحسبه قد جاءه رجال من أهل المشرق فمنوه الخلافة.

میں گمان کرتا ہوں کہ ان کے پاس اہل مشرق میں سے کچھ لوگ آئے ہیں جنہوں نے ان کو خلافت کی توقع دلائی ہے۔

یہاں سے طبع سوم میں اضافہ ہے۔ مؤلف نے ”أحسبه“ کا ترجمہ ہی سرے سے چھوڑ دیا ہے۔

یہ خط کس سلسلہ میں لکھا گیا تھا وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

وكتب يزيد بن معاوية إلى ابن عباس يخبره بخروج الحسين إلى مكة.

اور یزید بن معاویہ نے ابن عباس کو مکہ خط لکھا جس میں انہیں مطلع کیا کہ حسین (مدینہ سے نکل کر) مکہ کو چلے گئے ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ میں آنا غضب ہو گیا، یزید کے =

=پیروں تلے زمین نکل گئی، اب چین کہاں، اطلاع کے ساتھ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نقل و حرکت کی تفتیش اور پھر اس پر تشویش شروع ہو گئی، فوراً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خط بھیجا گیا قرابت کا واسطہ دلایا گیا اور انہیں لکھا گیا کہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو فہمائش کریں کہ آخر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے صفائی کرنی پڑی اور انہوں نے یزید کو لکھا کہ ”گھبرانے کی بات نہیں حضرت حسین کا مکہ آجانا کسی ایسے امر کی بنا پر نہیں جو تمہیں ناگوار ہو“ فرماتے ہیں:

إني لارجو أن لا يكون خروج الحسين لامر تكرهه.

مجھے امید ہے کہ حسین کا مدینہ سے نکلنا کسی ایسے امر کی بنا پر نہ ہو گا جو تمہیں ناگوار ہو۔

مؤلف نے اپنی قابلیت سے اس عبارت کا یہ ترجمہ فرمادیا ہے کہ:

”مجھے امید ہے کہ حسین کوئی ایسا خروج نہ کریں گے جو برائی کا موجب ہو۔“

”جو برائی کا موجب ہو“ معلوم نہیں کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔ پھر خط میں ذکر ”خروج الحسين إلى مكة“ (مدینہ طیبہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ معظمہ کی طرف نکلنے کا ذکر) ہے جواب خط میں اسی خروج کا تذکرہ ہے، مگر مؤلف نے بلند پروازی دکھائی وہ ابھی سے مکہ معظمہ سے عراق کی طرف خروج کی سوچنے لگے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب نامہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس خروج کی وجہ بھی بتلادی ہے کہ:

وعجلوا عليه بالكلام الفاحش فأقبل إلى حرم الله مستجيراً به.

مدینے میں تمہارے عمال نے ناشائستہ کلمات ان سے کہے اس لئے وہ بیت اللہ میں پناہ لینے چلے آئے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان صحیح ہے تو صورتِ حال بالکل واضح ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ابھی ابھی مکہ معظمہ میں قدم رکھا ہے، عمالِ یزید کی بداطواریوں سے تنگ آکر وہ حرم الٰہی میں پناہ لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں کہ یزید نے الزام تراشی شروع کر دی، اس کو تو خدشہ لگا ہوا ہے کہ کہیں عراقی ان کی حمایت پر کھڑے نہ ہو جائیں، اس لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر اندیشہ کا اظہار شروع کر دیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جہاں اس سلسلہ میں خط لکھا ساتھ ہی=

= نظم میں کھلی تہدید بھی کردی کہ اگر ہماری اطاعت سے ذرا سرتابی کی گئی تو پھر خیر نہیں، اپنی نعشوں کو عقاب و کرگھس کا طعمہ بنانے کے لئے تیار ہو جاؤ، مؤلف بھی یزید کی لے میں لے ملانے لگے اور ابھی سے خروجِ عراق کی تمہیدیں جمانے لگے، حالانکہ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جوابِ خط سے ظاہر ہے یہاں ابھی عراق جانے کا ذکر فکر کچھ بھی نہیں۔

اب ناظرین خود فیصلہ فرمالیں کہ یہ "مکاتیب" کس بات کا بیّن ثبوت ہیں، عراقی سبائیوں کی ریشہ دوانیوں کا کہ جس کا ذکر یزید نے محض اپنے گمان کی بنا پر کیا ہے اور اس امر کا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تھا، جیسا کہ مؤلف کا دعویٰ ہے یا اس بات کا کہ مکہ معظمہ میں ان کی آمد یزیدی عمال کی حرکات ناشائستہ کی بنا پر تھی اور وہ حرمِ الٰہی میں محض پناہ لینے کی غرض سے آئے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے، یہ مؤلف کی غایت و سعادتمندی ہے کہ انہیں اپنے دادا صحابی رسول اللہ ﷺ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا بالکل اعتبار نہیں اور یزید کا کہا ان کے نزدیک پتھر کی لکیر ہے، نیز یہ بات بھی سوچنے کے لائق ہے کہ یزید کی اس خط و کتابت میں بے لاگ محقق کو اپنے امیر المؤمنین کے بارے میں ذرا دیر کے لئے بھی یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ اس کا یہ اقدام محض اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق انہوں نے جھٹ سے یہ فتویٰ جڑ دیا۔

خیر یہ بحث تو جملہ معترضہ کی طرح بیچ میں آگئی، عرض کرنا یہ ہے کہ مؤلف نے تحریر بالا میں جیسا کہ "خط کشیدہ الفاظ" سے ظاہر ہے تسلیم کرلیا ہے کہ یزید کا یہ "قطعۂ اشعار" اس کے مکتوب کے آخر میں درج تھا اس لئے اب یہ لکھنا کہ یہ اشعار باغیانِ مدینہ کی تنبیہ کے لئے لکھے گئے تھے کس قدر غلط ہے، کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مکہ معظمہ میں آمد اور اہل مدینہ کے یزید کے خلاف صف آرا ہونے میں تین سال سے زائد کا عرصہ ہے۔ خود مؤلف نے لکھا ہے کہ:

"حادثہ کربلا کے بعد جو ۱۰ محرم ۶۱ھ کو پیش آیا تھا، تین برس تک یعنی ۲۸ ذی الحجہ ۶۳ھ تک عالم اسلام میں کسی جگہ کوئی ہنگامہ بپا نہ ہوا۔"
(ص ۳۶۸ طبع سوم)

"حادثہ کربلا کے بعد تین سال کے عرصہ تک کسی جگہ کسی قسم کا کوئی ہنگامہ یا شورش نہیں ہوئی۔" (ص ۲۶۸)

=

اس قطعۂ اشعار کو شیعہ مؤرخ طبری نے بھی (جلد ٦ ص ۴۱۹) پر درج کیا ہے اور دیگر مؤرخین خصوصاً علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی "ص ۱۶۴ جلد ۸" میں اور "ناسخ التواریخ" کے

غالی مؤلف نے ص ۱۷۲، ج ۲، کتاب دوم میں دیا ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

يـأيهـا الراكـب الغـادي لطيتـه — على عُـذَافِـرةٍ في سـيرهـا قحـم

أبلغ قريشا على شحط المزار بها — بيني وبين الحسين الله وللرحم

وموقف بفنـاء البيـت أنشـده — عهـد الإلـه ومـا ترعى لـه الـذمم

عنفتم قومكـم فخـرا بـأمكـم — أم خصـان لـعـمـري بـرة كـرم

هي التي لا يداني فضـلهـا أحد — بنت النبي وخير الناس قد علموا

وفضـلها لكـم فضـل وغيركـم — من قومكـم لهـم من فضلهـا قسـم

=ثابت ہوا کہ یہ اشعار اس وقت لکھے گئے تھے جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے اور ان اشعار میں وہ سب دھمکیاں موجود ہیں جو ایک باجبروت بادشاہ اپنے مخالفین کو دیا کرتا ہے، تو اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا وہ اندیشہ بالکل صحیح نکلا جس کا ذکر مؤلف نے اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے کہ:

"فرزدق شاعر سے ایک سوال منسوب کر کے غالی راویوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے منہ سے تعجیل سفر کی وجہ یہ بیان کرائی ہے:

سوال فرزدق — ما أعلك عن الحج؟

ایسی جلدی کیا پڑی ہے کہ آپ حج چھوڑ کر جا رہے ہیں؟

جواب حسین — لو لم اعجل لاخذت

میں ایسی جلدی نہ کرتا تو گرفتار کر لیا جاتا۔

(ص ۲۱۸ ج ٦ طبری، ص ۱۶۷ ج ۸، البدایہ والنہایہ) ("خلافت معاویہ ویزید" ص ۱۱۳ و ۱۲۴ طبع دوم و ص ۱۳۵ طبع سوم)

مؤلف کو یزید کے حلم و کرم کو دیکھتے اس واقعہ کی صحت سے انکار ہے لیکن ان اشعار کے تیور یزید کی سفاکی اور قساوت کو بتلائے دے رہے ہیں۔

إني لأعلـم أو ظـنـا كـعـالمـه والظن يصـــدق أحيانـا فينتظم

أن ســوف ينزلكم ما تطلبون بها قتلى تهاداكم العقبان والرخم

يا قومنا لا تشبوا الحرب إذ خمدت ومسكوا بحبال السلم واعتصموا

لا تركبوا البغي إن البغي مصرعة وإن شـــارب كأس البغي يتخم

فقد جرب الحرب من قد كان قبلكم من القرون وقد بادت بها الأمم

فأنصـفوا قومكم لا تهلكوا بذخا فرب ذي بـذخ زلـت بـه القـدم

اے سوار! جو طیبہ (مدینہ) کی طرف سے ایسی اونٹنی پر جا رہا ہے جس کی چال میں بانکپن ہے کہ تھکاوٹ کے باوجود قدم جم کر پڑتا ہے۔

میرا پیغام قریش کو پہنچادے کیونکہ ان سے ملنے کو فاصلہ بہت ہے کہ میرے اور حسین کے درمیان اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ ہے۔
اور "صحن حرم میں کھڑے ہو کر کہی ہوئی بات ہے۔ میں انہیں اللہ کا عہد اور ہر اس چیز کی یاد دلاتا تھا جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت قابل لحاظ ہوتی ہیں۔"

تم اپنی ماں پر فخر کر کے قوم کے سامنے ناک چڑھاتے ہو، ہاں وہ ماں ایسی ہی ہیں پاک دامن اور میری جان کی قسم بڑی نیک کردار اور عزت والی۔

وہ ایسی ہیں کہ ان کے شرف کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ نبی ﷺ کی بیٹی اور دنیا جانتی ہے کہ سب سے اچھی۔

ان کی فضیلت میں تمہاری (حسین رضی اللہ عنہ) فضیلت ضرور ہے، مگر تمہارے علاوہ بھی تمہاری قوم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کے شرف سے بہرہ مند ہیں۔

میں جانتا ہوں یا جاننے والے کی طرح گمان کرتا ہوں کیونکہ بسا

اوقات گمان سچا نکلتا ہے اور بات پوری ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

کہ عنقریب تم پر (اے باغیانِ مدینہ!)[76] وہی چیز نازل ہو گی جو اس بغاوت سے تم حاصل کرنا چاہتے ہو، یعنی مقتولوں کی لاشیں جو تمہاری طرف سے عقابوں اور کرگسوں کے لئے سامانِ ضیافت ہوں گی۔

اے میری قوم! جنگ کی آگ بجھ چکی اسے مت بھڑکائو اور صلح کی رسی کو مضبوط پکڑو اور اسی پر قائم رہو۔

بغاوت کا ارتکاب مت کرو، بغاوت پچھاڑ دینے والی ہے اور جامِ بغاوت پینے والا اسے ہضم نہیں کر سکتا۔

لڑائی کا تجربہ انہیں ہو چکا جو تم سے پہلے گزر چکے، اقوام عالم کے لئے یہ بھولی بسری باتیں ہو چکیں۔

اپنی قوم کے حق میں عدل کی راہ اختیار کرو اور بے جا حرکتوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو، کیونکہ اکثر بے جا حرکتوں سے ہی آدمی ٹھوکر کھاتا ہے۔

امیر یزید کے مندرجہ بالا قطعۂ اشعار سے اس وقت کے احوال کا بہت کچھ صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تیسرے شعر کے مضمون سے ثابت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں امیر یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی، وہ مضمون شعر کا یہ ہے "اور صحن حرم میں کھڑے ہو کر کہی ہوئی بات ہے میں انہیں اللہ کا عہد اور اس چیز کی یاد دلاتا تھا جن کا ذمہ داریوں سے عہدہ برآ

76۔ یہ "باغیانِ مدینہ" کے الفاظ اسی غلط مفروضہ پر مبنی ہیں کہ یہ خط باغیوں کو لکھا گیا تھا۔

ہوتے وقت لحاظ رکھا جاتا ہے۔"[۷۷] ان الفاظ سے صاف اشارہ اسی طرف ہے۔ آزاد اور بے لاگ مؤرخین نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام خروج کے سلسلے میں اسی بات کو بیان کیا ہے۔" (ص ۷۳تا۷۶ طبع دوم و ص ۹۲تا۹۴ طبع سوم)

ان اشعار میں یزید نے جس حلم و کرم کا مظاہرہ کیا ہے اس کا جواب نہیں، وہ اپنے مخاطب (سبطِ پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صاف صاف کہہ رہا ہے کہ "عنقریب تم پر وہی چیز

77۔ یوں تو مؤلف اگرچہ عام طور پر ترجمہ غلط ہی کیا کرتے ہیں لیکن یہاں تو کمال ہی کر دکھایا وہ ترجمہ فرمایا ہے کہ جس سے مطلب بالکل خبط ہو کر رہ گیا۔ لغت دانی کی حد ہو گئی، "موقف" کا ترجمہ کیا ہے "کھڑے ہو کر کہی ہوئی بات ہے" حالانکہ یہ "مصدر میمی" ہے، بمعنی وقوف کے اور معطوف ہے "الرحم" پر اس لئے اس کا تعلق دوسرے شعر کے اخیر مصرعہ سے ہو گا اور ترجمہ یوں کیا جائے گا:

"میرا اور حسین (رضی اللہ عنہ) کے درمیان اللہ کا اور رشتہ داری کا، اور بیت اللہ کے حوالی میں ان کے ٹھہرے رہنے کا تعلق آڑے ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ خدا کا خوف اور رشتہ داری کا تعلق اور حرمِ الٰہی میں ان کا قیام یہ تین چیزیں ہیں جو میرے اور ان کے درمیان حائل ہیں، ورنہ میں ان کو ان کے کئے کا وہ مزہ چکھاتا کہ انہیں معلوم ہو جاتا مجھ سے بیعت نہ کرنا کیسا ہوتا ہے؟۔ مؤلف نے "موقف" کا ایسا خود ساختہ ترجمہ کر کے جس کو سُن کر ہر لغوی کو وجد آجائے اس سے یہ تاریخی مسئلہ نکالا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے صحنِ حرم میں ولی عہدی کی بیعت کر لی تھی۔ اگر اگلے مؤرخین بھی مولف کی طرح عربی زبان کی کچھ شدبُد رکھتے اور بے لاگ محقق ہوتے تو اس نادر تاریخی تحقیق کو ضرور اپنی تصانیف میں جگہ دیتے۔

اور یہ جو یزید نے کہا کہ "أنشده عهدًا الا له وما ترعى به الذمم" تو یہاں وہ واعظ ناصح بن گیا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خدا کا عہد اور اپنی ذمہ داریاں یاد دلا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھئے اور خدا کے عہد یعنی امیر وقت کی اطاعت کا خیال رکھئے۔

نازل ہو گی جس کے تم طلبگار ہو اور تم اس طرح مقتول پڑے ہو گے کہ عقاب و کرگس تمہاری لاشوں کو آپس میں بطور ہدیہ بانٹ رہے ہوں گے۔"[78]

چنانچہ ان اشعار میں جو کہا گیا تھا "کربلا" اور "حرّہ" میں وہی کر دکھایا گیا۔ "حرّہ" کے متعلق تو خود مؤلف کو اعتراف ہے کہ یزید نے امیر عسکر سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

"مدینہ کے لوگوں کو تین دن کی مہلت دینا مان جائیں تو خیر ورنہ لڑائی کرنا، جب غلبہ پا جاؤ تو باغیوں کا مال اور روپیہ اور ہتھیار اور غلہ (من مال أو رقة أو السلاح أو طعام فهو للجند) یہ لشکریوں کے لئے ہے۔ بلاذری اور طبری میں ان ہی اشیاء کے لے لینے کے الفاظ ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

("خلافت معاویہ و یزید" ص ۳۷۹ طبع سوم)

تمام فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ باغیوں کے مال و اسباب سے تعرض نہ کیا جائے کیونکہ اہل سنت کے خلیفہ راشد امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے باغیوں کے مال و اسباب سے تعرض نہیں کیا تھا مگر مؤلف کے خلیفہ راشد اور امیر المؤمنین یزید کے حلم و کرم کا تقاضا ہے کہ باغیوں پر غلبہ پا جانے کے بعد ان کا مال، روپیہ، ہتھیار اور غلہ سب لشکریوں کے لئے ہے۔ معلوم نہیں یزید نے یہ مسئلہ کہاں سے نکالا، کتاب و سنت میں تو اس کا پتہ نہیں ہے۔ جناب مؤلف کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ یزید کے اس ظالمانہ حکم کے باوجود ان کی بے لاگ تحقیق میں "لوٹ کھسوٹ وغیرہ کی سب روایتیں سبائیوں کی تراشیدہ ہیں۔" (ص ۲۷۲ طبع دوم)

شاید باغیوں نے یہ سب چیزیں خوشی خوشی لا کر لشکریوں کو خود نذر کر دی ہوں گی۔ مولف نے یہ نہیں بتایا کہ پھر ان بے سر و سامان لوگوں کا جن کی ہر چیز چھین کر

78۔ آٹھویں شعر کا صحیح ترجمہ۔

لشکریوں کے حوالہ کردی گئی تھیں، انجام کیا ہوا اور یزید کے حلم و کرم نے ان بیکسوں کا مداوا کس طرح کیا؟۔

یزید کا ذوق موسیقی

مولف نے یزید کے علم و فضل کے بڑے گُن گائے ہیں لیکن ان مستشرقین اور بے لاگ محققین نے اس کی قرآن فہمی، حدیث دانی، فقہ واجتہاد اور علمِ مغازی و سیر کا ذکر کرنے کے بجائے اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا کہ ''وہ خود شاعر تھا، موسیقی کا ذوق رکھتا تھا، اہلِ ہنر اور شعراء کا قدر دان تھا، ادب و آرٹ کا مربّی اور سرپرست تھا۔''

''ادب و آرٹ'' کے الفاظ مستشرقین کے یہاں اپنے اسی وسیع معنی میں بولے جاتے ہیں جس معنی میں کہ آج کل یورپ میں ان کا رواج ہے، مؤلف نے یزید کی آرٹ نوازی کا ایک دلچسپ قصہ اپنی کتاب میں ''منصف مزاجی'' کے زیر عنوان درج کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''منصف مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی معاملات میں بھی امیر یزید دامنِ انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے سلامہ نامی ایک کنیز کا واقعہ بیان کیا ہے جو مدینہ منورہ کی رہنے والی، حسن و جمال میں یکتا اور ہمہ صفت موصوف تھی۔ قرآن شریف اچھی قراءت سے سناتی، شاعرہ اور مغنیہ تھی۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے فرزند عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے جو خود بھی شاعر تھے اور جن کا ذکر ایک قصہ میں اوپر گذر چکا۔ اس کنیز کی امیر یزید سے بہت کچھ ثنا و صفت کر کے اس کی خریداری پر راغب کیا۔
>
> ودله على سلامة وجمالها و حسنها وفصاحتها وقال لا تصلح إلا لک یا امیر المؤمنین وأن تکون من سمارک.
>
> (البداية والنهاية: 8/ 234)

اور انہیں (امیر یزید کو) سلامہ اور اس کے حسن و جمال و فصاحت کی طرف رغبت دلائی اور کہا کہ اے امیر المؤمنین! یہ کنیز سوائے آپ کے اور کسی کے لائق نہیں [۷۹] خواہ آپ اسے قصہ خوانی کے لئے رکھ لیں۔

کنیز کے آقا سے خریداری کا معاملہ طے کر لیا گیا، کنیز مذکورہ مدینہ سے دمشق آکر داخل حرم کی گئی اور دوسری کنیزوں پر اسے فوقیت حاصل ہو گئی [۸۰] لیکن جب یہ راز افشا ہوا یہ کنیز اور مدینہ منورہ کا ایک شاعر احوص بن محمد ایک دوسرے کے دامِ محبت میں گرفتار

79۔ یہ ترجمہ غلط ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اے امیر المومنین! یہ تو صرف آپ کے لائق ہے اور آپ کے داستان سراؤں میں داخل ہونے کے" معلوم ہوا امیر المؤمنین کے پر لطف مشاغلِ زندگی میں قصہ کہانیوں کے سننے کا دلچسپ مشغلہ بھی تھا اور اس کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ان کے یہاں اس خدمت کی بجا آوری کے لئے داستان سراؤں کی ایک مستقل ٹولی موجود تھی جس میں صنفِ نازک کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ سلامہ کی خریداری کی اصل وجہ بھی اسی بزم کی رونق تھی، ظاہر ہے کہ امیر المؤمنین کا یہ مشغلہ بھی ادب اور آرٹ کی سرپرستی کے سلسلہ میں تھا۔

80۔ یہاں مؤلف نے پیچ کی کڑی چھوڑ دی جو اس واقعہ کی اصل جان تھی اور وہ یہ ہے کہ سلامہ کے ولولہ عشق میں احوص نے دمشق کی راہ لی اور یہاں آکر دربار سے تعلق پیدا کیا۔ یزید کی مدح میں قصائد کہے جس کی بدولت اسے خوب عروج نصیب ہوا۔ سلامہ کو جب اس کی آمد کا پتہ چلا تو ایک خادم کو اپنا ہمراز بنایا اور اسے کچھ دے دلا کر کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ احوص کو ایک بار اس سے ملادے، کمبخت خادم نے یزید کے پاس جا کر سارا راز فاش کر دیا، یزید کو تجسس ہوا اور اس نے اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے خادم کو کہہ دیا کہ سلامہ کا کہنا کر دے، وہ جا کر احوص کو بلا لایا اور یزید چھپ کر کسی ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے اپنے حرم کی کارگزاری دیکھ سکے، ادھر مدت کے بچھڑے ایک دوسرے سے ملے تو حالت دگرگوں ہو گئی، سلامہ کی نظر جیسے ہی احوص پر پڑی زار و قطار رونے لگی۔

ہیں، امیر یزید نے احوص کو جو دمشق میں موجود تھا نیز سلامہ کو مواجہ میں طلب کر کے تصدیق کی ان دونوں نے فی البدیہ اشعار میں اقرار محبت کیا، سلامہ نے کہا کہ شدید محبت مثل روح کے میرے رگ و پے میں سرائیت کئے ہوئے ہے تو کیا اب روح اور جسم میں مفارقت ہو سکے گی۔

حبًّا شـــديـدًا جرى كـالروح في جســـدي

فـــهـل يـفـرق بـيـن الــروح والجســـد

امیر یزید نے یہ حال دیکھ کر سلامہ کو احوص کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا:

خذها يا أحوص! فهي لک ووصله صلة سنية.

(البدایہ والنہایہ: ۲۳۶/۸)

اے احوص! اب یہ سلامہ تمہاری ہے تم اسے لے لو، پھر اسے اچھا انعام بھی عطا کیا۔

("خلافت معاویہ ویزید" ص ۳۱۸، ۳۱۹ طبع دوم و ۴۳۷ تا ۴۳۹ طبع سوم)

یزید کی اس انصاف پروری کی قدر موجودہ دور میں جیسی سینما کے پردہ پر ہو سکتی

احوص کا بھی برا حال ہوا، تھوڑی دیر تو اسی بے قراری میں گذری جب ذرا دل کو قرار آیا تو سلامہ نے کرسی منگوا کر باعزاز تمام احوص کو بٹھایا، اب سلسلہ کلام شروع ہوا، راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں، گفتگوئے محبت نے طول کھینچا کہ اسی اثنا میں رات بیتی سحر ہو گئی، بزمِ محبت میں تفرقہ پڑ گیا، دونوں جذبات اُلفت میں سرشار تھے، جدا ہونے لگے تو طرفین سے شاعری شروع ہو گئی جو اس وقت کی دلی کیفیات کی آئینہ دار تھی، احوص جیسے ہی الوداع ہو کر باہر نکلا دَھر لیا گیا۔ یزید نے شب کی سرگذشت پوچھی اور تشنہ کامان محبت نے جو عشق کے ہاتھوں مجبور تھے کچھ اس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ یزید سا سنگدل بھی ان پر رحم کھائے بغیر نہ رہ سکا۔

ہے اور کہیں نہیں ہو سکتی، کیا اچھا ہوتا اگر مؤلف اس سلسلے میں ایک فلمی کہانی سپرد قلم کر دیتے اور عوام کی نظروں میں بھی ان کے ہیرو کے چار چاند لگ جاتے۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

وقد روي أن يزيد كان قد اشتهر بالمعازف وشرب الخمر والغنا والصيد واتخاذ الغلمان والقيان والكلاب والنطاح بين الكباش والدباب والقرود، وما من يوم إلا يصبح فيه مخمورا، وكان يشد القرد على فرس مسرجة بحبال ويسوق به، ويلبس القرد قلانس الذهب، وكذلك الغلمان، وكان يسابق بين الخيل، وكان إذا مات القرد حزن عليه. وقيل: إن سبب موته أنه حمل قردة وجعل ينقزها فعضته. وذكروا عنه غير ذلك والله أعلم بصحة ذلك.

اور روایت کیا گیا ہے کہ یزید باجے گاجے، مے نوشی، گانے بجانے، شکار کرنے، گانے والی چھوکریوں کے رکھنے، کتے پالنے اور مینڈھے، ریچھ اور بندروں کے لڑانے میں شہرت رکھتا تھا اور کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا کہ جس کی صبح کو مخمور نہ اٹھے، وہ زین کسے ہوئے گھوڑوں پر بندروں کو رسیوں سے باندھ کر انہیں ہانک دیتا تھا، اور اسی طرح نوخیز لڑکوں کو سونے کی ٹوپیاں اُڑھاتا تھا، گھوڑ دوڑ کرایا کرتا تھا، جب کوئی بندر مر جاتا تو اس پر غمگیں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت کا سبب بھی یہی ہوا کہ ایک بندریا کو سوار کرا کر اسے نچا رہا تھا دفعتاً اس نے کاٹ کھایا، مؤرخین نے اس کے بارے میں ان باتوں کے علاوہ اور چیزیں بھی بیان کی ہیں جن کی صحت کا اللہ ہی کو خوب علم ہے۔
(البدایہ والنہایہ ۸/۲۳۵و۲۳۶)

یہ ہے یزید کے ''ادب و آرٹ'' کے مربی و سرپرست ہونے کی تفصیل، اب

ظاہر ہے کہ یزید کی ان خوبیوں کی قدر جیسی اربابِ طرب واہل نشاط کو ہو سکتی ہے بھلا زاہدانِ خشک کو کیا ہوگی۔ وہ اس ذاتِ شریف کو کیا پہچانیں؟۔ بقول باباجی:

"ایک پابند رسوم واوہام ملا آپ کی بلند پایہ تاریخی تحقیق وریسرچ کو کیا سمجھ سکتا ہے۔"[۸۱]

یزید کو اس دور میں یا تو "باباجی" نے سمجھا ہے جو ادب وآرٹ کے اتنے بڑے مربی ہیں کہ کیا مجال جو اُن کے جیتے جی "انجمن ترقی اردو" سے کوئی مذہبی کتاب شائع ہو جائے اور ان کے مربی ادب ہونے میں بٹہ لگ جائے یا پھر جناب عباسی نے کہ جو بے لاگ تحقیق کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔

یزید کی صورت خود اپنے آئینہ میں

"کربلا کے المناک حادثہ کے کچھ عرصہ بعد جب حضرت محمد بن علی رضی اللہ عنہ (ابن الحنفیہ) دمشق تشریف لے گئے تھے، امیر المؤمنین یزید نے پہلی ہی ملاقات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر ان الفاظ میں ان سے اظہار تاسف وتعزیت کیا تھا۔
پھر یزید نے ابن الحنفیہ کو ملاقات کے لئے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر ان سے کہا:
حسین رضی اللہ عنہ کی موت پر خدا مجھے اور تمہیں اجر عطا کرے، بخدا حسین رضی اللہ عنہ کا نقصان جتنا بھاری تمہارے لئے ہے اتنا ہی میرے لئے بھی ہے اور ان کی موت سے جتنی اذیت تمہیں ہوئی ہے اتنی ہی مجھے بھی ہوئی ہے، اگر ان کا معاملہ میرے سپرد ہوتا اور میں

81۔ ملاحظہ ہو بابائے اردو کا خط مؤلف کے نام جو طبع سوم میں سرورق کے بعد ان دونوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ منسلک ہے، کاش ان دونوں بزرگوں کے ساتھ خود ان کے بزرگ و ممدوح یزید کا بھی فوٹو ہوتا تو آرٹ کا پورا پورا مظاہرہ ہوتا۔

دیکھتا کہ ان کی موت کو اپنی انگلیاں کاٹ کر اپنی آنکھیں دیکر ٹال سکتا ہوں تو بلا مبالغہ دونوں ان کے لئے قربان کر دیتا گو کہ انہوں نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی اور خونی رشتہ کو ٹھکرادیا تھا۔
تم کو ضرور معلوم ہوگا کہ ہم پبلک میں عیب[۸۲] جوئی حسین رضی اللہ عنہ کی کرتے ہیں، بخدا یہ اس لئے نہیں کہ عوام میں خاندانِ علی رضی اللہ عنہ کو عزت و حرمت حاصل نہ بلکہ اس سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت و خلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔[۸۳]
یہ باتیں سن کر ابن الحنفیہ رحمہ اللہ نے کہا:
"خدا تمہارا بھلا کرے اور حسین رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے اور ان کے گناہ کو معاف کرے۔
یہ معلوم کر کے مسرّت ہوئی کہ ہمارا نقصان تمہارا نقصان اور ہماری محرومی تمہاری محرومی ہے۔ حسین رضی اللہ عنہ اس بات کے مستحق نہیں کہ تم ان کو برا بھلا کہو اور برملا ان کی مذمت کرو امیر المؤمنین! میں درخواست کرتا ہوں کہ حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہیے جو مجھے ناگوار ہو۔"

82۔ مقامِ غور ہے جو شخص مرنے کے بعد حضرت ممدوح کے عیب جوئی سے نہ چوکے وہ زندگی میں ان کے لئے کیا خاک قربانی کرتا۔

83۔ یہ یزید ہی کی شرافت ہے کہ مرنے کے بعد حضرت حسین کی عیب جوئی سے باز نہ آیا حالانکہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو عیب لگانے کی ممانعت آئی ہے اور حدیث شریف میں مردوں کو برا کہنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر کوئی کھلا فاسق ہو اور اس سے دینی ضرر کا اندیشہ ہو تو اور بات ہے۔ تعجب ہے بے لاگ محقق کو یزید کے لعن طعن پر تو بڑا غصہ آیا مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی پر کچھ نہ بولے حالانکہ یزید کا ظلم و فسق متواتر ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا تقویٰ و پرہیز گاری۔

یزید نے جواب دیا:

''میرے چچیرے بھائی! میں حسین کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے تمہارا دل دُکھے۔'' (انساب الاشراف بلاذری ف ج۴)

(''خلافت معاویہ ویزید'' ص۱۸۱، ۱۸۲ طبع دوم۔ ص۲۰۷، ۲۰۸ طبع سوم)

مؤلف کی اس نقل سے پتہ چلا کہ یزید کی زندگی کے دو رُخ تھے، نجی زندگی میں اس کا برتاؤ کچھ اور تھا اور سب کے سامنے کچھ اور، چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ سے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے علاتی بھائی تھے اس کی نجی گفتگو کا کیا انداز ہے اور ان کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر اپنے کس قدر گہرے افسوس کا اظہار کر رہا ہے، لیکن سب کے سامنے اس کا جو طرزِ عمل تھا خود ہی بیان کر دیا ہے کہ:

''ہم پبلک میں حسین رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کرتے ہیں........ اس سے ہم لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت وخلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔''

یہ ہے یزید کے سہ سالہ دورِ حکومت کے شاندار کارناموں کی اصلی علت وغایت جو خود مؤلف نے اپنے ممدوح کی زبانی نقل کی ہے، سچ ہے ''حق بر زبان جاری''۔

مؤلف نے مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مشہور اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کا جو قول نقل کیا ہے وہ بھی اسی ذہنیت کا ترجمان ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مصعب رضی اللہ عنہ جب قتل ہو گئے عبدالملک کو اس کا ملال ہوا اور کہا:

لقد كان بيني وبين مصعب صحبة قديمة، وكان من أحب الناس إلي، ولكن هذا الملك عقيم. (البداية والنهاية: 8/ 316)

مجھ میں اور مصعب میں پرانی دوستی تھی، مجھے وہ سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے لیکن سلطنت کی حالت بانجھ عورت کی سی ہے اس میں تعلقات کا لحاظ نہیں ہوتا۔ (ص۲۴۹ طبع دوم وص۳۰۳ طبع سوم)

یزید اور عبدالملک دونوں کے مندرجہ بالا بیانات سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ دونوں اموی خلیفہ اقتدار کے کس قدر بھوکے تھے؟ اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے وہ کسی ناجائز سے ناجائز امر کے ارتکاب سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

مصعب رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی امیر المؤمنین حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق کے والی تھے، عبدالملک نے جب امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کی تو یہ اس سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، ان کی زندگی کا یہ واقعہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے جس کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی انصاری چودھری کے متعلق ان کو کچھ شکایت پہنچی اور انہوں نے چاہا کہ اس کو سزا دیں لیکن آنحضرت ﷺ کے خادم خاص حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ نے جب ان کو یہ حدیث سنائی کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ:

استوصوا بالانصار خیرًا اقبلوا من محسنهم وتجاوزوا عن مسئیهم.

یاد رکھو! انصار کے ساتھ نیک سلوک کرنا ان کے نکوکار کی نیکی کو قبول کرنا اور ان کے خطاکار سے درگذر کرنا۔

تو ان کی یہ کیفیت ہوئی کہ بے اختیار اپنے آپ کو تخت سے گرا دیا اور فرش پر اپنا رخسار رکھ کر نہایت عاجزی سے کہنے لگے:

أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم على الرأس والعين.[٨٤]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سر آنکھوں پر۔

لیکن ان کی شہادت کے بعد جب حجاج ظالم عبدالملک کی طرف سے اسی عراق کا عامل بن کر آیا تو اس نے خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی تذلیل واہانت میں کوئی کسر

84۔ تاریخ الاسلام ذہبی اور البدایہ والنہایہ میں مصعب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ملاحظہ ہو۔

باقی نہ چھوڑی حتیٰ کہ اس ظالم نے ان کے ہاتھ پر مہر کرادی تھی جس میں تحریر تھا ''عتیق الحجاج''[85] (حجاج کا آزاد کردہ غلام) حالانکہ یہ وہی انس رضی اللہ عنہ ہیں جن کی زبانی حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے یہ نقل کیا ہے کہ:

خدمت رسول الله صلى الله عليه وسلم عشر سنين فما ضربني ولا سبني ولا عبس في وجهي.[86]

میں نے آنحضرت ﷺ کی دس سال تک خدمت کی، سو آپ نے نہ کبھی مجھے مارا نہ برا بھلا کہا اور نہ میری کسی بات پر ترش رو ہوئے۔

مؤلف نے مستشرقین کی زبانی یزید کی جو مدح کی ہے وہ آپ کی نظر سے گزر چکی اور یزید کی سیرت و کردار کے مذکورہ بالا واقعات بھی آپ پڑھ چکے جو خود مؤلف نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اب خود فیصلہ کر لیجئے کہ مؤلف اور ان کے بے لاگ محققین کے بیانات میں کس قدر صداقت ہے۔

مؤرخین کے بیان کردہ نہ دن صحیح ہیں نہ تاریخیں

بے لاگ محقق نے تاریخی واقعات کو علمِ ریاضی کی روشنی میں جانچا ہے اور مؤرخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچنے کے لئے از روئے تقویم و کلیۂ حساب ایک ایسی جدول تیار کی ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ:

''مندرجہ ذیل جدول پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ دیگر واقعات تو رہے در کنار خروج کے سلسلہ میں جو جو تاریخیں اور دن کتب تاریخ میں بتصریح ماہ و سال درج ہیں ان میں ایسی ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ نہ کسی تاریخ سے دن کی مطابقت ہوتی ہے اور نہ کسی دن

85۔ تاریخ الاسلام ذہبی، تذکرۂ حضرت انس رضی اللہ عنہ۔

86۔ تاریخ الاسلام ذہبی، تذکرۂ حضرت انس رضی اللہ عنہ۔

سے تاریخ کی تقویم ہجری وعیسوی نیز کلیۂ حساب کی رو سے راویوں کی بیان کردہ تاریخ کا جو دن آتا ہے آخری خانۂ جدول میں درج ہے اور یہی دن صحیح دن ہے جس کی جانچ بھی کچھ دشوار نہیں۔ مؤرخ طبری اور دوسرے مؤرخین نے حسب ذیل الفاظ میں یہ تاریخیں اور دن صراحت سے بیان کئے ہیں:

وكان خروج الحسين من المدينة إلى مكة يوم الاحد لليلتين بقيتاً من رجب سنة ستين، ودخل مكة ليلة الجمعة لثلاث مضين من شعبان، فأقام بمكة بقية شعبان ورمضان وشوال و ذي القعدة، وخرج من مكة لثمان مضين من ذي الحجة يوم الثلاثاء يوم التروية.

(طبری ۲۱۵/۶، والبدایہ والنہایہ ۱۵۸/۸)

حسین مدینہ سے یک شنبہ کے دن ۲۸ رجب کو نکل کر مکہ گئے اور جمعہ کی رات میں ۳ شعبان کو مکہ میں داخل ہوئے [87] پھر بقیہ ماہ

87۔ یہ واضح رہے کہ عام شاہراہ کے اعتبار سے جس پر کاروان چلا کرتے تھے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک دس مرحلے پڑتے ہیں، چنانچہ حمد اللہ مستوفی "نزہۃ القلوب" میں لکھتے ہیں:

"از مدینہ تا مکہ دہ مرحلہ" (ص ۱۹۴ طبع بمبئی)

اس اعتبار سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو راستہ میں پورے دس روز لگنے چاہیے تھے، حالانکہ ان مؤرخین کی تصریح کے مطابق وہ پانچ روز ہی میں مکہ معظمہ جا پہنچے کیونکہ یکشنبہ کو مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے اور دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ، پنجشنبہ سفر میں گذار کر شب جمعہ کو (کہ جس کی صبح کو جمعہ کا دن آنے والا ہے) مکہ معظمہ میں آگئے اور مؤلف کی تقویم کے مطابق بجائے یکشنبہ کے جمعہ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور شب چہار شنبہ کو مکہ معظمہ پہنچے، بہر صورت کل پانچ دن میں سفر تمام ہوا لیکن مؤلف کو جو دقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفر کربلا میں پیش آئی اور انہیں ذرا بھی یہ خدشہ نہ گذرا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو قاعدہ کے لحاظ سے دس دن راہ میں لگنے تھے پھر وہ ۲۸ رجب کو چل کر بجائے ۸ شعبان کو پہنچنے کے ==۳ شعبان کو خلافِ

قاعدہ مکہ معظمہ میں پانچ دن پہلے کیسے پہنچے اور دس مرحلے پانچ یوم میں کیونکر طے ہو گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کربلا کے سفر میں مولف کو یہ فکر ہے کہ کہیں ۱۰ تاریخ سے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہاں نہ پہنچ جائیں ورنہ ان کے ممدوح عمر بن سعد اور ابن زیاد کے مظالم کا پردہ چاک ہو جانے کا ڈر ہے اور کاروانِ اہل بیت پر پانی کی بندش کا انکار مشکل ہو جائے گا لیکن مکہ معظمہ میں اگر کاروانِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پانچ دن پہلے پہنچ جائے تو کچھ حرج نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قیام کی مدت جتنی زیادہ ثابت ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے تا کہ مؤلف کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ:

> "مکہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ چار مہینے سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور اس تمام مدت میں عراقیوں کی تحریرات اور ان کے وفود آتے جاتے رہے، خروج کی تیاریاں ہوتی رہیں لیکن حکومت کی جانب سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔" (ص ۳۷ طبع دوم و ص ۹۲ طبع سوم)

جملہ مؤرخین متفق البیان ہیں کہ:

> "حضرت حسین رضی اللہ عنہ پورے چار مہینے اور چند دن مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے۔" یعنی ماہ شعبان و رمضان و شوال و ذی قعدہ نیز ماہ ذی الحجہ کے چند ابتدائی ایام اور اس تمام عرصے میں کوفیوں کے صدہا خطوط، بیسیوں وفود اور سینکڑوں اشخاص عراق میں ان کے پاس آتے جاتے اور بیعتِ اطاعت کے حلف اٹھاتے رہے............ان تمام حالات سے حکومت پوری طرح باخبر تھی، بایں ہمہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ (ص ۱۱۴، ۱۱۵ طبع دوم و ص ۱۳۶ طبع سوم)

یہ واضح رہے کہ مؤلف کے نزدیک کوفہ کی جانب "حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روانگی ۱۰/ ذی الحجہ بعد ادائے فریضہ حج ہوئی تھی۔ (ص ۱۳۰ طبع دوم و ص ۱۵۳ طبع سوم)

۱۰/ شعبان سے ۱۰/ ذی الحجہ تک پورے چار ماہ اور خود ان کی تصریح کے مطابق "حضرت حسین رضی اللہ عنہ پورے چار ماہ اور چند دن مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے۔" اس لئے یقیناً وہ ۱۰/ شعبان سے چند روز پہلے مکہ معظمہ میں پہنچ گئے تھے، لہٰذا مؤلف کو جب یہ تسلیم ہے کہ =

شعبان و رمضان و شوال وذی قعدہ مکہ میں مقیم رہے اور ۸/ذی الحجہ سہ شنبہ کے دن یوم ترویہ کو مکہ سے روانہ ہوئے۔

ناسخ التواریخ کے مؤلف بھی یہی کچھ لکھتے ہیں:

"حسین علیہ السلام یک شنبہ بست و ہشتم رجب از مدینہ...... بیرون شد و روز جمعہ سیم شعبان وارد مکہ گشت............. یوم ترویہ کہ روز سہ شنبہ ہشتم ذی الحجہ بود از مکہ آہنگ عراق نمود ہماں روز کہ مسلم بر ابن زیاد بیروں آمد و روز دیگر کہ یوم عرفہ بود شہید گشت۔"

(ص ۲۷ ج ۶، از کتاب دویم مطبوعہ ایران)

پھر ورودِ کربلا کی تاریخ ۲ محرم بتاتے ہوئے ص ۲۲۵ پر لکھتے ہیں کہ:

"ایں واقعہ در روز پنجشنبہ دوم شہر محرم الحرام بود۔

مؤرخ طبری بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قریہ العقر میں وارد ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم نزل (أي العقر) وذلک یوم الخمیس وهو الیوم الثاني من المحرم سنة 61ھ (ص 232 ج 2، طبری)

پھر (العقر) کے مقام پر اتر پڑے اور یہ دن پنجشنبہ کا تھا اور محرم

=حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی مسافت جو حسب معمول دس دن میں طے ہونا چاہیے تھی چند دن پہلے ہی طے کر لی تھی، تو پھر انہیں کربلا کے سفر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چند روز پہلے وہاں جا پہنچنے سے کیوں انکار ہے؟۔

باقی رہی یہ بات کہ کوئی حاجی ذی الحجہ کی ۱۰/تاریخ کو مکہ معظمہ سے کیونکر روانہ ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ایامِ تشریق منٰی میں گزارنے ہیں اور رَمی جمار کرنا ہے، یعنی کنکریاں مارنی ہیں، یہ تو بالکل ایسی بات ہوئی جیسے کوئی یوں کہنے لگے کہ فلاں نمازی جمعہ کی نماز سے بغیر سلام پھیرے چلتا بنا تو اس میں مؤلف معذور ہیں کیونکہ انہوں نے نہ کبھی حج کیا، نہ کسی حاجی سے حج کی تفصیل پوچھی، پھر یہ مسئلہ مسائل کے بکھیڑے ہیں جن میں پڑنا ایک "پابند رسوم واوہام مُلّا" کا کام ہے اور مؤلف تو بلند پایہ تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔

۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی۔

مؤرخین کی مندرجۂ بالا تصریحات (تاریخ و دن) کا جب موازنہ جدول کے آخری خانہ کے مندرجات سے کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ راویوں کے بیان کئے ہوئے دن اور تاریخیں اس درجہ مختلف و متضاد ہیں کہ کسی طرح لائق وثوق و قابل یقین نہیں، بلکہ اس شبہ میں قوت پیدا کرنے کا موجب ہیں کہ اس واقعہ حزن انگیز کے اسّی (۸۰) نوے (۹۰) برس کی مدت منقضی ہونے کے بعد وضعی روایتوں کے ساتھ ساتھ یہ دن اور تاریخیں بھی وضع ہوئے ورنہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ واقفانِ حال غلط تاریخیں اور دن بیان کرتے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی راوی کا نہ کوئی چشم دید واقعہ ہے اور نہ راویوں میں سے کوئی حسینی قافلہ میں موجود تھا۔[۸۸]

مؤلف "مجاہد اعظم"[۸۹] کو اعتراف ہے کہ "مردانِ اہل بیت" سے کوئی واقعہ مروی نہیں۔ "سید الساجدین حالتِ بیماری میں خیمہ کے اندر رہتے حسن مثنیٰ یا وہ لوگ جو درجۂ شہادت پر فائز نہ ہوئے ان سے کوئی واقعہ مروی نہیں، جس شخص نے جیسا سنا دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے بیان کر دیا۔ بیان واقعات میں کسی راوی

88۔ لیکن مؤلف اور ان کے پیشرو مستشرقین شاید اس وقت کربلا میں موجود تھے جو اپنے چشم دید واقعہ کے طور پر یہ بیان کرتے ہیں کہ:

"حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مٹھی بھر متبعین نے اپنے سے بدرجہا طاقتور فوجی دستہ پر جو اُن سے ہتھیار رکھوا لینے کو بھیجا گیا تھا غیر مآل اندیشانہ طور سے حملہ کر دیا۔" ("خلافت معاویہ و یزید" ص ۲۱۲ طبع دوم و ص ۲۵۹ طبع سوم)

89۔ مؤلف "مجاہد اعظم" "شاکر حسین نقوی امروہوی" کے متعلق مؤلف کو اقرار ہے کہ وہ شیعہ ہیں۔ (ص ۸ عرضِ مؤلف طبع سوم و ص ۲۲۵ طبع سوم)

سے سہو ہوا، کسی کے طرزِ بیان نے واقعہ کی اصلیت کو افراط و تفریط سے مسخ کر دیا۔(ص ۱۷۲) سچ ہے حق بر زبان جاری۔ کسی کا کوئی چشم دید واقعہ نہیں ہے۔"[90]

جدول تاریخ و دن

تاریخیں اور دن جو مؤرخین نے ابو مخنف کی روایت سے بیان کی ہیں از روئے تقویم و کلیہ حساب اور صحیح دن

کسی ایک دن یا تاریخ کے بیان کرنے میں سہواً غلطی ہو جاتی تب بھی تاویل کی گنجائش ممکن تھی لیکن یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ ساتوں تاریخیں اور دن جو راویوں کے بیان کردہ ہیں باہم مطابق نہیں، نہ

نمبر شمار	تفصیل واقعہ	سنہ	تاریخ	دن	صحیح یا غلط	عیسوی سنہ و تاریخ وماہ سے مطابق	
۱	مدینہ سے مکہ کو روانگی	۶۰ھ	۲۸ رجب	یکشنبہ	غلط	جمعہ	۴ مئی ۶۸۰ء
۲	مکہ آمد	۶۰ھ	۳ شعبان	جمعہ	غلط	چہار شنبہ	۹ مئی //
۳	مسلم کا حملہ گورنر کوفہ پر	۶۰ھ	۸ ذی الحجہ	سہ شنبہ	غلط	یکشنبہ	۹ ستمبر //
۴	مسلم کا قتل ہونا	۶۰ھ	۹ ذی الحجہ	چہار شنبہ	غلط	دوشنبہ	۱۰ ستمبر //
۵	مکہ سے عراق کو روانگی	۶۰ھ	۸ ذی الحجہ	سہ شنبہ	غلط	یکشنبہ	۹ ستمبر //
۶	الطف (کربلا) پہنچنے کی وضعی تاریخ	۶۱ھ	۲ محرم	پنجشنبہ	غلط	سہ شنبہ	۱۲ اکتوبر //
۷	حادثہ کربلا	۶۱ھ	۱۰ محرم	جمعہ	غلط	چہار شنبہ	۱۰ اکتوبر //

تاریخ دن سے اور نہ دن تاریخ سے حالانکہ یہ سب دن اور تاریخیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدامِ خروج کے ایسے اہم اور ناقابل فراموش دن اور تاریخیں ہیں کہ کمزور یادداشت کا کوئی راوی بھی خواہ

90۔ ”یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے“ سے یہاں تک طبع سوم میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اس کا اپنا چشم دید واقعہ بھی نہ ہوتا لیکن اس نے کسی ایسے شخص کی زبانی
یہ حالات سنے اور معلوم کئے ہوتے جسے ان کا ذاتی علم تھا تب بھی وہ
ایسی فاش غلطیوں اور غلط بیانیوں کا ہر گز ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔
جب دن اور تاریخیں تک بھی صحیح بیان نہ ہوئی ہوں تو دوسرے تمام
حالات اور واقعات جو بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے راویوں نے بیان
کئے ہیں جن سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں وہ کیونکر قابلِ وثوق ولائق
یقین ہو سکتے ہیں۔" (ص ۱۹۱، ۱۹۴ طبع دوم و ص ۲۳۲ تا ۲۳۶ طبع سوم)

عباسی کی تقویم دانی

مؤلف کا یہ سارا غرہ اس وجہ سے ہے کہ خوش قسمتی سے انہیں اردو زبان میں ایک ایسی تقویم مل گئی جس سے ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت معلوم ہو سکے اور یہ تقویم چونکہ ایک "جرمن مستشرق" کی تیار کردہ تقویم کی مدد سے مرتب کی گئی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ جنابِ مؤلف کو جو مستشرقین کی عظمت و صداقت کے نقیب ہیں اسے بعینہ من وعن تسلیم کرنے میں کیا شک وشبہ ہو سکتا تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"راقم الحروف کے پیش نظر انجمن ترقی اردو (ہند۔ دہلی) کی شائع
کردہ تقویم ہجری و عیسوی مطبوعہ ۱۹۳۹ء ہے جو ابوالنصر محمد خالدی ایم
اے (عثمانیہ) نے ایک جرمن مستشرق ایڈورڈ ماہلے کی تقویم کی مدد
سے مرتب کی تھی، یہ بڑی کار آمد و مستند تقویم ہے۔" (ص ۱۹۱ طبع
دوم و ص ۲۳۳ طبع سوم)

مؤلف کو یہ تقویم کیا ملی گویا چودہ طبق روشن ہو گئے اور مورخین کی ساری غلط بیانیاں عیاں ہو گئیں، اس لئے بار بار کتب تقویم کی اہمیت جتاتے چلے جاتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''موجودہ زمانہ میں ایسی جنتریاں اور کتب تقویم ہر شخص کو باآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں جن کی مدد سے موجودہ سال ہجری تک اس قسم کی صحیح معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں کہ کس سنہ کے کس مہینہ کی کس تاریخ کو کون سادن تھا، اس پر آئندہ صفحات میں راویوں کی غلط بیانیوں کے سلسلہ میں تفصیلی بحث آتی ہے۔''

(ص۱۵۹، طبع دوم و ص ۱۸۳، طبع سوم)

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''موجودہ زمانے میں ایسی کتب تقویم اور جنتریاں موجود ہیں اور باآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں جن کی مدد سے صحیح طور سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس سنہ کے کس مہینے کی کس تاریخ کو کون سا دن تھا، آئندہ اوراق میں ابو مخنف کی اس قسم کی غلط بیانیوں کے سلسلے میں تفصیلی بحث آتی ہے جس میں ایسا فارمولا بھی پیش ہوگا جس سے ہر شخص خود حساب لگا کر یہ معلومات حاصل کرسکتا ہے۔''

(ص ۱۶۱ طبع دوم و ص ۱۸۵ طبع سوم)

عباسی صاحب کی ریاضی میں مہارت

اب قبل اس کے کہ مؤلف کے بیان کردہ فارمولے اور تقویم کی رو سے مؤرخین کے بیان کردہ دن اور تاریخوں کی صحت پر بحث کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو سابق میں علمِ ریاضی سے جو تعلق رہ چکا ہے اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے تاکہ ناظرین کو ان کی خوش فہمی کا اندازہ ہوسکے، مؤلف نے اپنی تالیف ''تذکرۃ الکرام'' یعنی ''تاریخ امروہہ'' جلد ثانی کے خاتمہ پر ''راقم الحروف بندہ محمود'' کے عنوان سے اپنے ذاتی حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اس میں ایک موقع پر ان کے قلم سے یہ الفاظ بھی نکل گئے ہیں:

"ریاضی سے طبیعت کو مناسبت نہ تھی اس لئے یونیورسٹی کے امتحانات میں بار بار ناکام رہا۔" (ص ۲۷۵ طبع محبوب المطابع، دہلی)

یہ ریاضی ہی کی جھنجھٹ تھی کہ جس کی بدولت جناب مؤلف کو گریجویٹ ہونا نصیب نہ ہو سکا، چنانچہ سید طفیل احمد صاحب آنریری جائنٹ سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے الفاظ ہیں:

"مولوی محمود احمد صاحب گریجویٹ نہیں ہیں۔" (تاریخ امروہہ ج ص ۳۸۳)

مؤلف کی ریاضی دانی کے بعض نادر نمونے اس کتاب میں بھی آ گئے ہیں جو ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ مؤلف نے مکہ معظمہ سے لے کر کربلا تک کی منزلوں اور ان کے باہمی فاصلوں کی ایک جدول تیار کی ہے اور کل فاصلہ مکہ معظمہ سے کربلا کا ۸۰۰ عربی میل لکھا ہے [۹۱] حالانکہ خود بدولت نے فاصلوں کی جو تفصیل دی ہے اس کو جمع کیا جائے تو کل ۷۹۳ میل ہوتے ہیں، [۹۲] یہ جمع کی غلطی ہے اور چونکہ سیکڑوں کا حساب تھا اس

91۔ حالانکہ ابراہیم رفعت باشا کے مشہور سفر نامے "مرائة الحرمين" میں "درر الفرائد" کے حوالے سے جدول المسافات بین مکہ وامہات المدن الاسلامیہ (مکہ معظمہ اور مرکزی اسلامی شہروں کے درمیانی فاصلوں کی جدول) میں مکہ معظمہ سے کوفہ کا فاصلہ کل ۵۱۰ میل مرقوم ہے۔

92۔ پھر لطف یہ ہے کہ مؤلف نے جلدی میں خود مکہ معظمہ کو بھی جہاں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سفر کی ابتدا ہوتی ہے ایک منزل شمار کیا ہے اور اس طرح بستان ابن عامر کو جو مکہ معظمہ سے چوبیس میل پر پہلی منزل ہے دوسری منزل قرار دیا ہے اور اسی بنا پر اس کو بجائے ایک دن میں طے کرانے کے دو دن میں طے کرایا ہے، یہ اس جدول کی پہلی غلطی ہے۔ مؤلف نے اس جدول میں مکہ معظمہ سے کربلا تک اکتیس منزلیں شمار کی ہیں اور لکھا ہے کہ:

"مستند کتب بلدان وجغرافیہ، سفر ناموں نیز قدیم وجدید نقشوں میں یہی منزلیں=

=اور فاصلے ان تمام تصریحات کے ساتھ درج ہیں۔"
(ص ۱۴۹ و ۱۵۰ طبع دوم و ص ۱۷۳ طبع سوم)

اس سلسلہ میں مؤلف نے حسب ذیل کتابوں کے نام بھی دیئے ہیں:
(۱) کتاب البلدان یعقوبی (۲) نزہۃ القلوب از حمد اللہ مستوفی (۳) کتاب الخراج از قدامہ بن جعفر (۴) رحلۃ ابن بطوطہ، مشہور مستشرق گب کے انگریزی ترجمہ اور نوٹس کے ساتھ (۵) معجم البلدان از یاقوت حموی۔

ہمیں اس جدول پر تفصیلی بحث تو اس وقت مقصود نہیں وہ تو انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی، سرِ دست صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ یعقوبی کی کتاب میں تو ان منزلوں کی باہمی مسافت کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور "نزہۃ القلوب" میں نجف سے لیکر مکہ معظمہ تک ستائیس مرحلے بتائے ہیں اور نجف سے کوفہ کا فاصلہ کل دو فرسنگ یعنی چھ میل لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ القلوب ص ۱۹۳ طبع بمبئی) لیکن مؤلف کی جدول میں ستائیسویں منزل مغیثہ ہے جو مکہ معظمہ سے نجف کو جاتے ہوئے اس سے چوبیس میل پہلے ہی آجاتی ہے اور "کتاب الخراج" میں ان منزلوں کی مسافتِ باہمی کے جو اعداد و شمار لکھے ہیں وہ مؤلف کی تصریحات کے مطابق نہیں، رہا "ابن بطوطہ" تو اس نے کوفہ کا سفر اس راہ سے کیا ہی نہیں جو مؤلف نے اپنی جدول میں لکھا ہے وہ تو مکہ معظمہ سے پہلے مدینہ طیبہ گیا تھا اور پھر وہاں سے نجف و کربلا، پھر ان کتابوں میں جدول کی اٹھائیسویں منزل سے لیکر اکتیسویں منزل تک کا کچھ پتہ نہیں چلتا، اور "معجم البلدان" میں اتفاقی طور پر کسی کسی منزل کی بعدِ مسافت کا بیان آیا ہے مگر وہ بھی مؤلف کی بیان کردہ مسافت سے بعض جگہ بالکل مختلف ہے، مثلاً مؤلف کی جدول میں سلیلہ کا فاصلہ ربذہ سے پچاس میل بنتا ہے لیکن "یاقوت" کی تصریح ہے کہ:

من الربذة إليها ستة وعشرون ميلاً

ربذہ سے لے کر سلیلہ تک میل ہیں۔

اسی طرح "معجم البلدان" میں مغیثہ اور قادسیہ کا باہمی فاصلہ چوبیس (۲۴) میل لکھا ہے مگر مؤلف نے اسے کھینچ تان کر چونتیس میل بنادیا ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ ایک طرف تو بے لاگ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ: =

''حسینی قافلہ کا موقعہ واردات پر وقوعہ سے ایک دن پہلے بھی پہنچ جانا بعدِ مسافت اور منازل مراحل کی تعداد کے اعتبار سے جب محال تھا ممکن الوقوع نہ تھا تو منعِ آب اور وحشیانہ مظالم کی یہ سب روایتیں ہباءً منثوراً ہو جاتی ہیں، تار عنکبوت کی سی سکت بھی ان میں باقی نہیں رہتی۔'' (ص ۲۰۸ طبع دوم و ص ۲۵۵ طبع سوم)

لیکن دوسری طرف اس کا یہ انکشاف ہے کہ:

''حضرت حسین اور ابن سعد کے مابین تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ أنهما كانا التقيا مراراً ثلاثاً أو أربعاً حسين و عمر بن سعد۔ (ص ۲۳۵ ج ۲ طبری)

ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں اس خط کا ابن زیاد کے پاس بھیجا جانا بتایا گیا ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:

فإن الله قد أطفأ النائرة وجمع الكلمة وأصلح أمر الأمة. (ص 235 ایضًا)

خدا نے آتش (اختلاف) کو بجھا دیا، اتحاد و اتفاق پیدا کر دیا اور امت کی اس سے بہتری چاہی۔

اس کے بعد وہ تین شرطیں بھی لکھیں جو مؤرخین نے نقل کی ہیں گذشتہ اوراق میں جن کا ذکر آچکا ہے۔ راویوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ خط پڑھ کر ابن زیاد کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے:

هذا كتاب رجل ناصح لأميره ومشفق على قومه نعم قد قبلت. (ص 236 ج 2 طبری)

یہ خط ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جو اپنے امیر کا صحیح مشیر ہے اور اپنی قوم کا مشفق ہے، ہاں تو میں نے قبول کیا۔'' (ص ۲۰۸، ۲۰۹ طبع دوم و ص ۲۵۸ طبع سوم)

''عمرو بن سعد کی ملاقاتوں کے نتیجہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب آمادہ ہوگئے کہ امیر المؤمنین سے بیعت کرلیں ان سے مطالبہ ہوا کہ دمشق تشریف لے جانے سے پہلے ہی ان کے نمائندے کے ہاتھ پر یہیں بیعت کریں۔'' (ص ۲۱۰ طبع دوم و ص ۲۵۸ طبع سوم)

''یہ مطالبہ ابن زیاد کا جواب وصول ہونے پر کیا گیا تھا اور اس کے جواب=

لئے ریاضی سے مؤلف کی عدمِ مناسبت کو دیکھتے ہوئے اگر ناظرینِ کرام ان کو فی الجملہ معذور سمجھیں تو بہتر ہے۔

۲۔ لطف یہ ہے کہ کبھی مؤلف سے اکائیوں اور دہائیوں کے جمع کرنے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے مثلاً ارشاد ہے:

"حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی عمر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان تھی، یعنی سنِ تمیز میں شرف صحابیت حاصل تھا۔" (ص ۱۴۴ طبع دوم و ص ۱۶۷ طبع سوم)

حضرت موصوف کی عمر وفاتِ نبوی ﷺ کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان کس حساب سے ہوئی اس کی تفصیل مؤلف نے اس طرح بیان کی ہے:

"حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی ولادت ملک حبشہ

=میں بقول مولف فوجی دستہ کے سپائیوں پر ناعاقبت اندیشانہ اچانک قاتلانہ حملہ کر دینے سے یہ واقعہ حزن انگیز یکا یک اور غیر متوقع پیش آکر گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ختم ہو گیا تھا۔" (۲۲۳ طبع دوم و ص ۲۷۴ طبع سوم)

یہ سب نزول کربلا کی سرگذشت ہے لیکن یہاں مؤلف کو کوفہ سے کربلا کا فاصلہ بالکل یاد نہ آیا جو حسب تصریح حمد اللہ مستوفی چوبیس میل ہے (ملاحظہ ہو نزہۃ القلوب ص ۱۳۴) اس حساب سے قاصد کو کوفہ جانے اور وہاں سے جواب لانے میں کم از کم اڑتالیس میل کا فاصلہ ضرور طے کرنا پڑے گا ورنہ قصرِ حکومت سے لے کر فوجی کیمپ تک دو چار میل کا مزید فاصلہ اور بھی ہو جائے تو تعجب نہیں، اب ذرا غور فرمائیے یہ واقعہ حزن انگیز تو خیر بقول مؤلف گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ختم ہو گیا مگر پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ابن سعد کے مابین تین چار ملاقاتوں میں کتنا وقت صرف ہوا ہو گا، اور ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں ابن زیاد کے پاس خط کا بھیجا جانا اور کوفہ آنا جانا اور اڑتالیس میل کا فاصلہ طے کر لینا آخر اس میں کتنی دیر لگی ہو گی؟ اور جب بے لاگ محقق کے نزدیک ایک دن میں یہ سب کچھ ہونا ممکن ہے تو کاروانِ اہل بیت کے لئے ایک دن میں دو منزل طے کر لینا کیوں ممکن نہیں؟

میں اس وقت ہوئی تھی جب ان کے والدین ابتدائے بعثت نبی اکرم ﷺ میں مکہ سے وہاں ہجرت کر گئے تھے۔ (ص ۱۴۳ طبع دوم وص ۱۶۶ طبع سوم)

گویا ابتدائے بعثتِ نبی اکرم ﷺ سے لیکر آپ کی وفات تک مؤلف نے حساب لگایا تو کل دس گیارہ برس کے درمیان کا عرصہ نکلا، حالانکہ ہر ادنیٰ مسلمان جانتا ہے کہ ابتدائے بعثت سے لے کر وفاتِ نبوی ﷺ تک ۲۳ سال کی مدت ہوتی ہے، سال ہجرت سے قبل آنحضرت ﷺ کا مکہ معظمہ میں قیام رہا اور دس سال ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں۔ لیکن مؤلف کو ریاضی اور تاریخ دونوں میں ایسا ملکہ ہے کہ اس کی بدولت یہ مدت گھٹ گھٹا کر کل دس اور گیارہ سال کے درمیان ہی رہ گئی۔

۳۔ اب تفریق کا نمونہ ملاحظہ ہو جو صرف اکائیوں پر مشتمل ہے، ابھی آپ مؤلف کے یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ:

"حضرت عبداللہ بن جعفر کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت دس اور گیارہ برس کے درمیان تھی۔"

اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بابت ان کی یہ تصریح ہے کہ:

"ان حقائق کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو جیسا ذکر ہو چکا ہے سن و سال میں حضرت ابن جعفر سے کئی سال چھوٹے مثل برادرِ خورد کے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت تقریباً پانچ برس کی عمر تھی۔" (ص ۱۴۶ طبع دوم وص ۱۶۹ طبع سوم)

مؤلف کے ان دونوں بیانات سے ہر بے پڑھا لکھا شخص بھی نہایت آسانی سے سمجھ جائے گا کہ ان دونوں حضرات کی عمروں میں پانچ چھ برس کا فرق تھا، لیکن بے لاگ ریسرچ اسکالر کو ریاضی سے جو طبعی مناسبت ہے اس کی بنا پر پانچ کو دس میں سے منہا کرنے کے بعد بھی دس ہی بچتے ہیں، چنانچہ ان کے حساب سے حضرت عبداللہ بن

جعفر رضی اللہ عنہما، حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے پانچ چھ برس بڑے ہونے کے بجائے نو دس برس بڑے ٹھہرتے ہیں، ارشاد ہے:

> "اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قریب ترین بزرگوں[۹۳] میں دو ہمنام حضرات زندہ تھے، یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما، یہ دونوں بزرگ سن و سال میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نو دس برس بڑے تھے۔" (ص ۹۸ طبع دوم و ص ۱۱۸، ۱۱۹ طبع سوم)

93۔ اب تک تو یہی سنتے چلے آئے تھے کہ "بزرگی بعقل است نہ بسال" مگر اب معلوم ہوا کہ بے لاگ تحقیق میں یہ بات بھی صحیح نہیں بلکہ اصل بزرگی سن و سال کے اعتبار سے ہے، لہٰذا جس کی عمر بڑی وہی بزرگ اور اسی لئے مؤلف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بزرگ سمجھتے ہیں۔ مؤلف کی اس ریسرچ پر ہمیں ان کے حسبِ حال ایک واقعہ یاد آگیا جس کا ذکر مؤرخین نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> وقد يروى عن ابن عباس إنه أمسک للحسن والحسين رضي الله وعنهما ركابيهما حين خرجا من عنده فقال له بعض من حضر أتمسک لهذين الحدثين ركابيهما وأنت أسن منهما فقال له اسكت ياجاهل! لا يعرف الفضل لأهل الفضل إلا ذوا الفضل.
>
> ("تاریخ بغداد" از خطیب بغدادی، "نزہۃ الالبّاء" از ابن الانباری اور تاریخ ابن خلکان میں فراء نحوی کا تذکرہ ملاحظہ ہو۔)
>
> اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما ان کے پاس سے اُٹھ کر تشریف لے جانے لگے تو حضرت موصوف نے (آگے بڑھ کے) ان دونوں بزرگوں کی رکابیں تھام لیں، اس پر حاضرین میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ آپ ان نوعمروں کی رکابیں تھامے کھڑے ہیں حالانکہ آپ سن و سال میں ان سے بڑے ہیں۔ (یہ سن کر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے ڈانٹا کہ او جاہل! زبان بند کر بڑوں کی بڑائی بڑے ہی جانتے ہیں۔

یہ تفریق کا ایسا نمونہ ہے کہ اس کے آگے ریاضی کے سارے فارمولے گرد ہیں۔

۴۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر کے متعلق ایک تحقیق تو مؤلف کی یہ ہے جو ابھی آپ کی نظر سے گذری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ برس کی تھی، متن کتاب میں متعدد جگہ مؤلف نے اسی بات کو دُہرایا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ اتنے چھوٹے نواسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت پانچ ساڑھے پانچ برس کے اتنے صغیر السن اور کم عمر تھے کہ ان کو اپنے مقدس اور ہادیٔ برحق نانا کے نہ حالات و معمولات کی کوئی بات یاد تھی نہ زبان مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد۔"[۹۴] (ص ۹۹ طبع دوم و ص ۱۲۰ طبع سوم)

94۔ کیسی اچھوتی ہے یہ تحقیق اور کتنا نادر ہے یہ انکشاف، سچ فرمایا جناب مؤلف نے:

"تیرہ سو سال کی طویل مدت میں کسی مؤرخ اور مصنف نے ان تاریخی واقعات کے بارے میں جن پر صدیوں سے وضعی روایتوں، من گھڑت حکایتوں اور افسانوں کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس نوعیت سے تحقیق و ریسرچ کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔" (ص ۷ عرض مؤلف طبع سوم)

تحقیق کی ندرت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس تبصرہ کا پس منظر سامنے ہو۔ سنئیے بے لاگ محقق فرماتے ہیں:

"ابن عباس رضی اللہ عنہ اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکابر میں سے تھے اور ان سب میں تفاسیر قرآن کے سب سے بڑے عالم تھے، ایسے ذی مرتبت و اعلم و اعقل اہلِ زمانہ بزرگ نے جو متفق علیہ خلیفہ وقت کی بیعت میں خود بھی بطیب خاطر داخل تھے اور دوسروں کو بھی جماعت سے وابستگی کی اور تفرقہ سے محترز رہنے کی ہدایت فرماتے "اولوالامر" کی اطاعت اور اس کے خلاف خروج کے جواز و عدم جواز کے بارے میں احکامِ شریعت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقیناً اسی طرح بتائے اور سمجھائے جس طرح دوسروں کو بتاتے اور سمجھاتے == تھے، کیونکہ یہ

اور دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

چھوٹے نواسے آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت پانچ ساڑھے پانچ برس کے اتنے صغیر السن اور کم عمر تھے کہ ان کو اپنے مقدس اور ہادیٔ برحق نانا کے یہ حالات و معمولات کی کوئی بات یاد تھی نہ زبانِ مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو گفتگوئیں ان سے کیں، جماعت سے وابستگی اور تفرقہ سے اجتناب پر جو نصیحتیں فرمائیں ان کے بعض فقرات غالی راویوں کی روایتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔"
(ص ۹۹ طبع دوم و ص ۱۲۰ طبع سوم)

یہ ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی علمی پوزیشن مؤلف کی نظر میں کہ حضرت ممدوح کی عمر کا آخری سال ہے اور بقول ان کے متفق علیہ خلیفہ کے خلاف خروج کا ارادہ رکھتے ہیں، مگر دینی معلومات کا یہ حال ہے کہ "ان کو اپنے مقدس اور ہادیٔ برحق نانا کے نہ حالات و معمولات کی کوئی بات یاد تھی، نہ زبانِ مبارک سے سنا ہوا اسلامی سیاست کے بارے میں آپ کا کوئی ارشاد لیکن اپنے ممدوح کے بارے میں بے لاگ تحقیق کا یہ فیصلہ ہے:

"امیر یزید کبار تابعین میں تھے، اپنے محترم والد ماجد کے علاوہ بعض اجلہ صحابہ سے فیض صحبت اُٹھایا یعنی حضرت دحیہ الکلبی رضی اللہ عنہ سے جو جلیل القدر صحابی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے سفیر بھی رہے تھے۔
امیر یزید نے زمانۂ طالبِ علمی ہی سے احادیث نبوی ﷺ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس علم میں ان کو بصیرت خاص حاصل تھی۔" (ص ۴۵ طبع دوم و ص ۵۵، ۵۶ طبع سوم)

واقعی اس نوعیت کی تحقیق اور ریسرچ آج تک کس مؤرخ یا مصنف کی ہے؟ یہ نرالی معلومات اور بے لاگ تحقیقات تو بس مؤلف کا خاص الخاص حصہ ہے بھلا اس میں کسی دوسرے کا کیا دخل۔

"ان کی حقیقی بہن سیدہ (۱) شراف بنت خلیفہ سے آپ نے نکاح بھی کیا تھا اور وہ امیر یزید کے رشتہ میں ماموں بھی ہوتے تھے، نیز حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ اور مُحبِّ رسول اللہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور دیگر متعدد صحابہ کرام سے استفادہ کیا۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ اور اپنے والد ماجد سے حدیث کی روایت کی۔ (ص ۴۴، ۴۵ طبع دوم و ص ۵۳ طبع سوم)

"اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر وفاتِ نبوی کے وقت پانچ برس کے قریب تھی۔" (ص ۷۳ طبع دوم و ص ۴۵ طبع سوم)

"ابن قتیبہ کی ایک روایت کے مطابق (المعارف ص ۶۹) ان کے بڑے بھائی کی ولادت رجب ۶ھ میں ہوئی تو یہ ۷ھ میں تولد ہوئے، اس اعتبار سے ان کی عمر اس وقت تین چار سال کی ہو گی۔" (حاشیہ ۱۶۹ طبع سوم)

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ

"حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا[۹۵] کی شادی غزوہ احد کے بعد اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ۴ھ میں ہونے کی روایت کے اعتبار سے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت چار پانچ سال کی ہوتی ہے۔ (حاشیہ ص ۱۲۰، طبع سوم)

ملاحظہ فرمایئے ایک دفعہ تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ۶ھ میں ولادت ہونے کے اعتبار سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر وفات نبوی ﷺ کے وقت تین سال کی ہوتی ہے اور دوسری دفعہ اسی حساب سے چار پانچ سال کی۔

95۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جناب عباسی کو امروہہ کے سیدوں نے اپنا کفو نہیں سمجھا، اس لئے وہ ان سیدوں سے اس کا انتقام اس طرح لے رہے ہیں کہ یزید کی بیوی شراف کلبیہ کو تو "سیدہ" لکھتے ہیں مگر خود حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے متعلق جو بنص حدیث "سیدۃ نساء العالمین" ہیں اس لفظ کا استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

۵۔اب تقسیم کا نمونہ ملاحظہ ہو جو اور بھی دلچسپ ہے، فرماتے ہیں:

"نصر بن مزاحم متوفی ۲۱۲ھ نے کتاب "وقعہ الصفین" میں اور ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں بعنوان "بيعته أهل البصرة عليًّا وقسمه ما في بيت المال فيهلكها" ہے کہ ساٹھ ہزار کی رقم بیت المال میں تھی جو فوجیوں پر تقسیم کر دی گئی، ہر ایک کے حصّے میں پانچ سو پانچ سو کی رقم آئی، پھر ان سے کہا گیا کہ:

لكم إن أظفركم الله عزوجل بالشام مثلها.

اگر خدائے عزوجل اہل شام پر تم کو فتح مند کرے تو اتنا ہی تمہیں اور ملے گا۔(ص ۴۴،۴۵ طبع دوم و ص ۵۳ طبع سوم)

بے لاگ محقق اس نقل سے اپنے ناظرین کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ پانچ پانچ سو کی رقم کے لالچ میں لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فوج میں بھرتی ہوا کرتے تھے [۹۶] لیکن حساب نہ جاننے کا یہ خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا کہ اتنی موٹی سی بات ان کی فہم رسا میں نہ آئی کہ ساٹھ ہزار کی رقم پانچ پانچ سو فی کس کے اعتبار سے کل ایک سو بیس

96۔ مؤلف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوجِ ظفر موج کے متعلق جس میں سابقین اوّلین اور مہاجرین وانصار کی بڑی تعداد شریک تھی جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے اس کے بارے میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے جو خود انہوں نے اپنے ممدوح یزید کی ولی عہدی کے سلسلہ میں اس کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"گویا امتِ محمدیہ جو آج بھی خوف اور لالچ سے بالا ہے وہ خیر القرون میں ان دونوں قسم کی پستیوں میں مبتلا تھی اور وہ بزرگوار جنہوں نے دین قائم کرنے کے لئے جانی ومالی اور ظاہری وباطنی کسی قربانی سے دریغ نہ کیا وہ سب باطل پرست ہو گئے۔ عقبہ اور شجرہ کی بیعت، بدر واُحد وخندق کے غزووں نے انہیں کندن نہیں بنایا تھا، دھات کا میل کر دیا تھا۔ "نعوذ بالله من سوء الظن في أصحاب محمد ﷺ۔"(ص طبع سوم)

آدمیوں پر تقسیم ہو کر ختم ہو جاتی ہے، پھر ہر ایک کے حصہ میں پانچ پانچ سو کی رقم آنا کیا معنی؟ لیکن انہیں اس طرف توجہ ہو تو کیوں ہو؟ وہ ابھی تک اسی خیال میں مست ہیں کہ یہ کوئی اتنی بڑی رقم ہے کہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جو ہزاروں کا لشکر شریک ہوا تھا ان سب کو اس میں سے پانچ پانچ سو فی کس کے حساب سے ملے تھے۔ یہ وہ خوش فہمی ہے کہ اس پردہ دنیا پر سوائے شیخ چلی کے شاید اور کسی کو ہوئی ہو۔

پھر اس فہم و فراست پر جرات کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ لکھا ہے دو کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے حالانکہ یہ دونوں کتابیں کوئی قلمی اور نایاب بھی نہیں بلکہ مطبوعہ اور متداول ہیں۔ "تاریخ طبری" تو بارہا چھپ چکی ہے اور نصر بن مزاحم منقری المتوفی ۲۱۲ھ کی تالیف "وقعۃ" سے لکھا ہے تاکہ ناظرین کو مؤلف کی صداقت میں ذرا شک نہ ہونے پائے، "وقعۃ صفین" ۱۳۶۵ھ میں جامعۂ فاروق کے مدرسِ اول عبدالسلام محمد ہارون کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ قاہرہ سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، اب جس کا جی چاہے ان دونوں کتابوں کو اُٹھا کر دیکھ لے، "وقعۃ صفین" میں تو خیر سے اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور "تاریخ طبری" میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے وہاں رقم کی تعداد چھ لاکھ سے کچھ اوپر بتائی ہے، چنانچہ طبری کے الفاظ میں: "فإذا فيه ستمائة ألف و زيادة"، "وقعۃ صفین" کے محشی عبدالسلام نے بھی اپنے حاشیہ میں (ص۱۸۸) طبری کے حوالے سے یہی لکھا ہے، اگرچہ یہ تعداد بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ پانچ پانچ سو فی کس کے اعتبار سے چھ لاکھ کی رقم کل بارہ سو افراد کے حصہ میں آئے گی اور زیادہ کی تفصیل اگرچہ یہاں مذکور نہیں تاہم وہ چند ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اس لئے دس بیس کا حصہ اور نکل سکتا ہے، حالانکہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج دس بارہ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔

لطف یہ ہے کہ کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' بار بار شائع ہوئی اور مؤلف کی نظر سے گزرتی رہی اور اب تیسری مرتبہ تو خود انہوں نے صاف لفظوں میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ''کتاب میں جو اغلاط رہ گئے تھے، بعض عبارتیں ترک ہو گئیں تھیں، نظر ثانی میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔'' (ص ۳۸ عرض مؤلف طبع سوم)

تاہم یہ لطائف و ظرائف جو جانِ کتاب ہیں بدستور چلے جاتے ہیں اور مؤلف کو اپنی اس بے لاگ ریسرچ پر ذرا تنبہ نہیں ہوتا۔

ان پانچ مثالوں سے ناظرین کو بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ خدا نے جناب مؤلف کو فنِ ریاضی میں کیا کچھ کمال عطا فرمایا ہے، اسی کمال کا یہ ثمرہ ہے کہ ان کا ذہن بے لاگ ریسرچ کرتے وقت اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں کسی محقق کے طائر خیال کا بھی گزر نہیں، آخر تقویمیں تو روزانہ اہل علم کی نظر سے گزرتی ہی رہتی ہیں مگر مؤرخین کے بیان کردہ اور تاریخ کے جانچنے کی کسی نے آج تک زحمت نہ کی؟ یہ صرف بے لاگ محقق کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے جب اپنے ممدوح یزید کی براءت کے لئے قلم اُٹھایا تو مؤرخین کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیئے، موصوف نے مؤرخین کے بیان کردہ ایک ایک دن اور ایک ایک تاریخ کا گہرا جائزہ لیا اور جب ان دنوں اور تاریخوں کو اپنی مستند تقویم کے مطابق نہ پایا تو صاف کہہ دیا کہ:

> ''جب دن اور تاریخیں تک بھی صحیح صحیح بیان نہ ہوئی ہوں تو دوسرے تمام حالات اور واقعات جو بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے راویوں نے بیان کئے ہیں جن سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں وہ کیونکر قابلِ وثوق و لائقِ یقین ہو سکتے ہیں۔'' (ص ۲۳۶ طبع سوم)

تقویم کو سامنے رکھ کر تاریخ کو اس طرح چیلنج کرنا مؤلف جیسے فاضلِ نامدار کے علاوہ کس کے بس کی بات تھی کیونکہ ان کا تو شیوہ ہی یہ ہے کہ۔

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

مؤلف کے اس چیلنج کی بنیاد ان کے اس مزعومہ پر ہے کہ تقویم کا تعلق ریاضی سے ہے اور علمِ ریاضی میں ہر چیز دو اور دو چار کی طرح بالکل قطعی اور یقینی ہوتی ہے، اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ :

> "کسی ایک دن یا تاریخ کے بیان کرنے میں سہواً غلطی ہو جاتی تب بھی تاویل کی گنجائش ممکن نہ تھی لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ ساتوں تاریخیں اور دن جو راویوں کے بیان کردہ ہیں باہم مطابق نہیں، نہ تاریخ دن سے اور نہ دن تاریخ سے۔" (ص۲۳۶ طبع سوم)

مگر خدا کی شان کے قربان، مؤلف بھی تو آخر مؤرخ ہی ہیں نہ صرف وہ بلکہ بے لاگ محقق بھی اس لئے قدرتی طور پر جو الزام وہ مؤرخین کو دیتے تھے اس سے خود کس طرح بچ سکتے تھے، چنانچہ یہی ہوا کہ مورخین کے بیان کردہ دن اور تاریخوں کے متعلق تو انہیں سات جگہ دعویٰ ہے کہ وہ ان کی مستند تقویم کے مطابق نہیں۔

لیکن ہم نے جب مؤلف کی تالیف منیف "تذکرۃ الکرام" یعنی "تاریخ امروہہ" جلد ثانی مطبوعہ المطابع دہلی ۱۳۵۰ھ کا سرسری جائزہ لیا تو اس میں نو مقامات ایسے نکلے جہاں مؤلف کے بیان کردہ دن اور تاریخیں ان کی مستند اور کار آمد تقویم سے جس کو "انجمن ترقیِ اردو" نے شائع کیا ہے بالکل مطابقت نہیں رکھتے، چنانچہ ہم بھی ذیل میں ایک جدول پیش کر رہے جس میں مؤلف کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کے مقابل آخری خانہ میں وہ تاریخ اور دن درج ہے جو از رُوئے تقویم جرمن مستشرق ہونا چاہیے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جدول تاریخ ویوم

تاریخیں اور دن جو مولف کی کتاب تذکرۃ الکرام میں مرقوم ہیں						صحیح دن ازروئے تقویم	
نمبر شمار	تفصیل واقعہ	سنہ	تاریخ وماہ	دن	صحیح یا غلط	مع مطابقت تاریخ عیسوی	
۱	وفات شاہ عبدالہادی صدیقی۱	۱۱۹۰ھ	۴ رمضان	جمعہ	غلط	پنجشنبہ	۱۷ اکتوبر ۱۷۷۶ء
۲	وفات شاہ دوست محمد	۱۲۲۹ھ	۱۳ ذیقعدہ	جمعہ	غلط	پنجشنبہ	۲۷ اکتوبر ۱۸۱۴ء۲
۳	ولادت شاہ عبدالباری	۱۱۶۰ھ	۸ رجب	دوشنبہ	غلط	یکشنبہ	۵ جولائی ۱۷۴۷ء۳
۴	وفات شاہ عبدالباری	۱۲۲۶ھ	۱۱ شعبان	جمعہ	غلط	شنبہ	۳۱ اگست ۱۸۱۱ء
۵	وفات میراں حاتم علی چشتی	۱۲۴۵ھ	۲۹ رجب	دوشنبہ	غلط	یکشنبہ	۲۴ جنوری ۱۳۸۰ء۴
۶	ولادت شاہ رحمن بخش چشتی	۱۲۰۱ھ	۳ صفر	جمعہ	غلط	شنبہ	۲۵ نومبر ۱۷۸۶ء
۷	وفات شاہ رحمن بخش چشتی	۱۲۸۰ھ	۱۸ محرم	دوشنبہ	غلط	یکشنبہ	۵ جولائی ۱۸۶۳ء
۸	وفات شاہ غلام حیدر خان	۱۲۰۳ھ	۲۲ جمادی الثانیہ	پنجشنبہ	غلط	جمعہ	۲۰ مارچ ۱۷۸۸ء
۹	وفات مولوی قطب الدین صدیقی خوشنویش	۱۲۳۰ھ	۳۰ ربیع الثانی۵	جمعہ	غلط	پنجشنبہ	۸ اپریل ۱۹۱۱ء

(۱) مؤلف نے حضرت ممدوح کی وفات کا قطعۂ تاریخ یہ درج کیا ہے:

سوئے ملک جاوداں رحلت نمود شاہ عبد الہادی والا مقام
آں محبِ خاصہ پروردگار بے تعلق بود از خلق و عوام
روز جمعہ چار میں از ماہ صوم بود کامد از در ایزد پیام
سالِ تاریخش بجستم از خرد تابود از یادگار ہر کرام
گفت ہاتف با دل و ذوقِ سلیم رفت ہادی رابع ماہ صیام

ظاہر ہے کہ یہ قطعہ حضرت ممدوح کی عین وفات پر لکھا گیا تھا لیکن مؤلف کی مستند تقویم اس کی تکذیب کرتی ہے۔

۲ مؤلف نے مطابقت میں ۱۸۱۳ء غلط لکھا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب موصوف کی تاریخ ولادت درج کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ ”یکم محرم ۱۱۶۴ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۷۴۷ء یہ بھی صحیح نہیں، صحیح ۱۹ نومبر ۱۷۵۰ء ہے۔

۳ مؤلف نے ”تذکرۃ الکرام“ میں ۱۶ جولائی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اب مؤلف اس جدول کو دیکھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کریں کہ جو رائے انہوں نے مؤرخین کے حق میں ظاہر کی تھی وہ خود ان کے بارے میں کس حد تک صحیح ہے؟

بات یہ ہے کہ مؤلف چونکہ بقول باباجی "بلند پایہ تحقیق و ریسرچ" کے عادی ہیں اس لئے وہ اکثر چھوٹی موٹی باتوں کو درخود اعتناء نہیں سمجھتے، یہی وجہ ہے کہ اس تقویم کے معاملہ میں اتنی ذرا سی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ مختلف ممالک میں مطلع کے اختلاف سے دن اور تاریخ کا فرق ایک قدرتی امر ہے، ہر عامی بھی یہ بات جانتا ہے کہ چاند ایک جگہ مہینہ کی انتیسویں تاریخ کو نظر آتا اور دوسری جگہ تیس کو اور اسی لئے مختلف ملکوں میں تاریخ کے لحاظ سے ایک دن یا دو دن کا فرق ہو جانا معمولی بات ہے، چنانچہ اس سال ۱۳۸۰ھ میں بھی یہی ہوا کہ عید اور بقر عید دونوں موقعوں پر مکہ معظمہ اور پاکستان میں دو دن کا فرق رہا، پاکستان اور ہندوستان میں عید بروز یکشنبہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۱ء کو مؤلف کی مستند تقویم کے مطابق منائی گئی اور مکہ معظمہ میں بروز جمعہ ۱۷ مارچ کو، چنانچہ "سعودی سفارت خانہ" نے عید سے ایک دن پہلے کراچی میں جو اعلان کیا تھا وہ روزنامہ "انجام" کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:

"سعودی عرب میں جمعہ کو عید ہوئی

کراچی ۱۸ مارچ (اسٹاف رپورٹر) آج یہاں سعودی عرب کے شاہی سفارت خانہ نے اعلان کیا ہے کہ سعودی عرب میں ماہ شوال کا چاند جمعرات ۱۶ مارچ کو نظر آ گیا تھا، لہٰذا سعودی عرب میں جمعہ کے دن عید منائی گئی۔" (روزنامہ انجام کراچی "عید ایڈیشن" بروز پیر، ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء)

ہ "تذکرۃ الکرام" میں ۱۴ جنوری مرقوم ہے جو ممکن ہے کاتب کی غلطی ہو۔

۵ یہ واضح رہے کہ مؤلف کی مستند تقویم میں جب سے سنہ ہجری جاری ہوا کبھی ماہ ربیع الثانی کی ۳۰ تاریخ نہیں ہوئی، یہ ظاہر ہے کہ مولوی قطب الدین کی وفات مؤلف کے عالم شباب میں ان کے وطن ہی میں ہوئی ہے، اس لئے اس بارے میں ان سے زیادہ صحیح معلومات اور کس کو ہو سکتی ہیں، تاہم ان کی مستند تقویم اس سلسلہ میں ان کا ساتھ نہیں دیتی۔

اگرچہ عید کے موقع پر اس سال پاکستان میں "محکمہ موسمیات" اور ریڈیو کے اعلان کی وجہ سے بڑی گڑبڑ رہی اور بعض لوگوں نے ایک دن پہلے ہی شنبہ ۱۸ مارچ کو عید کر لی بلکہ عید کی سرکاری تقریبات بھی اسی روز ہوئیں، لیکن جمہور مسلمین نے چونکہ مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہ آیا تھا اس لئے علماء کے اعلان کے مطابق اتوار ہی کو عید منائی اس سال اتوار کی عید کراچی کے بچے بچے کو یاد رہے گی۔

اسی طرح ذی الحجہ کا چاند اس سال حجاز مقدس میں یکشنبہ ہی کو (بتاریخ ۱۴ مئی ۱۹۶۱ء) نظر آ گیا تھا، چنانچہ وہاں غُرّہ ذی الحجہ بروز دوشنبہ ۱۵ مئی کو اور حج بروز سہ شنبہ ۲۳ مئی کو اور بقر عید روزِ چہار شنبہ ۲۴ مئی کو ہوئی۔ چنانچہ اخبار "جنگ" کی اطلاع کے مطابق "سعودی سفارت خانہ" کا بیان اس بارے میں حسب ذیل ہے:

"اتوار کو سعودی عرب میں چاند دیکھ لیا گیا

۲۳ مئی کو عرفات میں وقوف ادا کی جائیں گے۔[۹۷]

کراچی مئی (اسٹاف رپورٹر) سعودی عرب کے سفارت خانہ نے اعلان کیا ہے کہ سعودی عرب میں ذی الحجہ کا چاند اتوار کو نظر آ گیا، چنانچہ مئی کو ذی الحجہ کی پہلی تاریخ تھی اس حساب سے منگل مئی کو عرفات پر وقوف ادا کئے جائیں گے۔"

(روزنامہ "جنگ" کراچی ج ۲۵ نمبر ۱۳۷، جمعہ ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

لیکن پاکستان میں چونکہ ۱۵ مئی بروز دوشنبہ کے بجائے ۱۷ مئی بروز چہار شنبہ کو ذی الحجہ کی پہلی تاریخ تھی، اس لئے یہاں 9 ذی الحجہ کو جو عرفہ کا دن ہے، ۲۳ مئی یوم سہ شنبہ کے بجائے ۲۵ مئی یوم پنجشنبہ تھا اور بقر عید کے دن ۲۴ مئی یوم چہار شنبہ کی

97۔ خبر اس طرح شائع کی گئی ہے کہ وہ چیستان بن گئی ہے، 9 ذی الحجہ کو جو حج کا دن ہے عرفات میں ٹھہرنے کو وقوف کہتے ہیں، یہ حج کا نہایت اہم رکن ہے، اس خبر کو اس طرح لکھنا چاہیئے تھا "23 مئی کو عرفات میں وقوف ہو گا۔"

بجائے مؤلف کی مستند تقویم کے مطابق ۲۶ مئی یوم جمعہ تھا۔ مؤلف کی مستند تقویم بھی عجب تقویم ہے کہ ہمیشہ پاکستانیوں کا ساتھ دیتی ہے اور عربوں کی مخالفت کرتی ہے۔

غرض عید اور بقر عید دونوں موقعوں پر حجازِ مقدس اور پاکستان میں اس سال دو دن کا فرق رہا۔ یہی دو دن کا فرق ہے جو مؤلف نے اپنی جدول میں دکھایا ہے اور اس قدرتی فرق کی بنا پر مؤرخین کے خلاف ایک طوفان اُٹھایا ہے۔ اس تقویم میں جو دو دن کا فرق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن میں نکلتا ہے وہی دو دن کا فرق اس سال حج کے دن میں نکلتا ہے۔ ۶۱ھ میں اس تقویم کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بجائے جمعہ کے بدھ کو ہوئی تھی اور اس سال حج بجائے جمعرات کے منگل کو ہوا اور بقر عید بجائے جمعہ کے بدھ کو ہوئی۔

اب آپ ہی سوچیے کہ اگر مؤلف سا کوئی بے لاگ محقق جو ریاضی اور جغرافیہ دونوں میں یکتائے زمانہ ہو اور بات بات میں بلند پایہ تحقیق کا خوگر ہو اس مستند تقویم کے حوالہ سے ایک جدول تیار کرے اور پھر یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ حجاز کے جتنے مؤرخین حال نے اپنی اپنی تصانیف میں اس سال کے واقعات کو سلسلہ وار بقیدِ دن اور تاریخ لکھا ہے وہ سب غلط ہے اور جن لوگوں نے اپنے اپنے سفر ناموں میں حج کی روئیداد، وہاں کے دن اور تاریخوں کے مطابق لکھی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ سال ۱۳۸۰ھ میں حج منگل کے دن ہوا وہ محض جھوٹ ہے کیونکہ "مستند تقویم" میں جو جرمن مستشرق کی تقویم کی مدد سے مرتب کی گئی ہے اور ان بیان کردہ دنوں میں قطعاً مطابقت نہیں ہے اور کسی ایک دن یا تاریخ کے بیان کرنے میں سہواً غلطی ہو جاتی جب بھی تاویل کی گنجائش ممکن نہ تھی لیکن یہاں تو کیفیت ہے کہ جتنی تاریخیں اور دن یہ لوگ بیان کرتے ہیں باہم مطابق نہیں، نہ تاریخ دن سے اور نہ دن تاریخ سے، کمزور سے کمزور یاد داشت کا کوئی شخص بھی ایسی فاش غلطیوں اور غلط بیانیوں کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا اور جب دن اور تاریخیں تک بھی صحیح صحیح بیان نہ ہوئی ہوں تو دوسرے تمام حالات و

واقعات جو ان لوگوں نے بیان کئے ہیں جن سے ان کے سفر ناموں کے اوراق پُر ہیں وہ کیونکر قابلِ وثوق و لائقِ یقین ہو سکتے ہیں" اور پھر باباجی جیسے کوئی بزرگ یہ بلند پایہ تحقیق سن کر بے اختیار پھڑک اُٹھیں اور واہ واہ کرنے لگیں کہ جو کچھ فرمایا بجا اور حق ہے اور آپ کی بلند پایہ تحقیق و ریسرچ کو ایک پابند رسوم و اوہام حاجی کیا سمجھ سکتا ہے" تو پھر اس بے لاگ ریسرچ کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

اسی طرح یہ موٹی سی بات ان کی سمجھ میں بالکل نہ آئی کہ یہ مستند و کار آمد تقویم جس میں ۱ھ سے لیکر ۱۵۰۰ھ تک ہجری اور عیسوی سنون کی مطابقت دکھائی گئی ہے، اس میں اس پورے پندرہ سو سال کی طویل مدت میں سوائے ماہ ذی الحجہ کے کوئی ایک مہینہ ایسا نہیں ملتا کہ جو کبھی انیتس دن کا ہوا ہو اور کبھی تیس کا، بلکہ اس تقویم میں محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان، ذی القعدہ یہ چھ مہینے ہمیشہ تیس دن کے شمار کئے گئے ہیں اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الاخریٰ، شعبان، شوال یہ پانچ مہینے ہمیشہ انیتس دن کے۔

اب مؤلف جن کا سن شریف اسّی کے قریب ہے ذرا اپنے حافظہ پر زور ڈال کر بتائیں کہ جن مہینوں کو ان کی مستند تقویم میں ہمیشہ تیس دن کا شمار کیا گیا ہے وہ ان کی یاد میں کبھی انیتس دن کے یا جن کو ہمیشہ انیتس دن کا بیان کیا گیا ہے کبھی تیس دن کے بھی ہوئے ہیں اور مہینوں کے متعلق اگر ان کا حافظہ کام نہ کرے تو کم از کم ماہ رمضان ہی کے بارے میں سوچیں کہ کبھی انہوں نے رمضان انیتس دن کے بھی کئے ہیں یا نہیں، یا ان کا عمل عمر بھر جرمن مستشرق کی اسی مستند تقویم پر رہا ہے کہ ہمیشہ روزے پورے تیس ہی دن کے رکھے اور کبھی رمضان کی ۲۹ تاریخ کو چاند دیکھ کر مسلمانوں نے روزے پورے تیس ہی دن کے رکھے اور کبھی رمضان کی ۲۹ تاریخ کو چاند دیکھ کر مسلمانوں کے ساتھ عید نہیں منائی۔

بہر حال اتنی معمولی سی بات مؤلف کی سمجھ میں نہ آئی جو مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ تاریخ ہجری میں مہینوں کا شمار رؤیتِ ہلال سے ہے نہ کہ منجموں کے حساب و شمار سے، اس لئے ظاہر ہے کہ تمام مسلمان مؤرخین واقعات کی تفصیلات بتاتے وقت اسی دن اور تاریخ کا ذکر کریں گے جو رؤیت ہلال کے حساب سے اس وقت ان کے یہاں ہو گی، اور یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اختلاف مطالع کے اعتبار سے چاند دیکھنے میں مختلف ملکوں کے اندر ایک دو دن کا فرق ہو جانا معمولی بات ہے، اس لئے ایک دو دن کے معمولی فرق کی بنا پر مورخین کی تکذیب کرنا کسی دانشمند کے لئے زیبا نہیں۔

رویئت ہلال سے تعین اوقات

رؤیتِ ہلال سے تعین اوقات کی تعلیم خود قرآن عظیم میں موجود ہے ارشاد ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

آپ سے لوگ نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے مقررہ اوقات ہیں۔

معلوم ہوا کہ معاملاتِ دنیویہ ہوں یا حساباتِ شرعیہ میں دنوں، مہینوں اور سالوں کی تاریخوں کا حساب رؤیتِ ہلال سے ہو گا، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی تفسیر "بحر موّاج" آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"معنی آنست بگو ماہ ہای تو از بدائع مخلوقات است، مر مردمان را علاماتِ اوقات است کہ بدان تقدیر مناسب ہای حلول دینھا و مدت عمرہا و عدتِ زنان، مدت حمل و اوضاعِ ایشان و ماہِ رمضان کہ ماہِ صیام است و ماہِ عید کہ از شعائرِ اسلام است و حولانِ حول کہ شرط وجوب زکوٰۃ است و مانند آن بدانند، و اقامتِ وظائف دنیا و دین و معرفتِ شھور و سنین بجا آوردن و محافظت کردن توانند و علامتِ وقتِ حج و زیارتِ بیت حرام کہ از معظمات ارکانِ اسلام است دو ماہِ شوال و ذی القعدہ دہ

روز ذی الحجہ از غرہ شوال یعنی از عید فطر تا عید اضحیٰ، دوروی اعمالِ حج از سنن وواجبات وفرائض مودی شود۔"[۹۸]

ترجمہ: معنی یہ ہیں کہ آپ فرمایئے ماہ ہائے نو نرالی مخلوقات میں سے ہیں یہ لوگوں کے لئے اوقات کی نشانیاں ہیں کہ جن کے ذریعہ وہ قرضوں کی معیاد کے مناسب اندازے عمروں کی مدت، عورتوں کی عدت، اور ان کے خاص حالات (حیض و نفاس وغیرہ) اور حمل کی مدت، اور ماہ رمضان کہ جو روزوں کا مہینہ ہے اور ماہ عید کہ جو شعائر اسلام میں سے ہے اور سال کا تمام ہونا کہ جو زکوۃ واجب ہونے کے لئے مشروط ہے اور اسی طرح کی اور چیزیں معلوم کرتے ہیں، اور دین و دنیا کے کاروبار کا چلانا اور مہینوں اور سالوں کا پہچاننا اور ان کی نگہداشت کرنا ان ہی کے بدولت ان کے لئے ممکن ہوتا ہے نیز یہ حج و زیارت بیت اللہ کے وقت کی علامت ہیں جو اسلام کے بڑے ارکان میں سے ہے یعنی شوال اور ذیقعدہ کے دو مہینے اور ذی الحجہ کے دس دن کی جو غرّہ شوال یعنی عید فطر سے لے کر عید قربان تک کا زمانہ ہے کہ اسی زمانہ میں حج کے اعمال اور اس کے سنن وواجبات وفرائض ادا کئے جاتے ہیں۔

اگرچہ مواقیت کے عموم میں حج بھی آجاتا ہے لیکن خاص طور پر اس کو دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں نے حساب شمسی کے مطابق حج کرنا شروع

98۔ تفسیر بحر موّاج، ۲۰۹/۱، طبع نول کشور ۱۲۹۷ھ اس کتاب کے قلمی نسخے ہند و پاک کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، یہ نہایت عمدہ تفسیر ہے اور ہندوستان کے علمی کارناموں میں ایک شاندار کارنامہ ہے۔ کاش کوئی علمی ادارہ اس اہم تفسیر کو شائع کرنے پر آمادہ ہو جاتا اور مطبع نولکشور میں اس کی صرف پہلی جلد چھپی ہے اور وہ بھی اغلاط سے مملو ہے۔ پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

کر دیا تھا اور وہ حساب شمسی سے مطابقت کی غرض سے نسئ (لوند) سے کام لے کر قمری مہینوں میں اَدل بدل کر دیا کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ حج کے بارے میں بھی انہیں رؤیت ہلال سے حساب لگانے کا پابند بنایا، علماء نے تصریح کی ہے کہ رؤیتِ ہلال کا اہتمام وانضباط فرض کفایہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تمام کاروبار میں ماہ و سال اور دن اور تاریخ کی تعین کے لئے ہمیشہ رؤیتِ ہلال کا اعتبار کیا ہے، موجودہ زمانہ میں جو ہمارے ملک میں سنہ عیسوی شمسی رائج ہے یہ انگریزوں کے منحوس دور کی بڑی یادگار ہے اور عام مسلمانوں کا بلاضرورت سنہ ہجری قمری اسلامی کو چھوڑ کر سنہ شمسی مسیحی انگریزی کا اختیار کر لینا بڑے افسوس کی بات ہے۔

امت مسلمہ کے تمام فرقوں کا باستثناء شیعہ اسماعیلیہ اس پر اتفاق ہے کہ تمام احکام شرعیہ کا دارومدار رؤیت ہلال پر ہے نہ کہ حرکت قمر کے حساب و شمار پر، چنانچہ علامہ مؤرخ مقریزی اپنی مشہور کتاب ''المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار'' میں لکھتے ہیں:

وقد عرفت أن شهور تاريخ الهجرة قمرية، وأيام كل سنة منها عدتها ثلثمائة وأربعة وخمسون يوماً، وخمس وسدس يوم، وجميع الأحكام الشرعية مبنية على رؤية الهلال عند جميع فرق الإسلام ما عدا الشيعة، فإن الأحكام مبنية عندهم على عمل شهور السنة بالحساب على ما ستراه في ذكر القاهرة وخلفائها۔

ثم لما احتاج منجمو الإسلام إلى استخراج من لا بد منه من معرفة الأهلة، وسمت القبلة، وغير ذلك بنوا أزياجهم على التاريخ العربي، وجعلوا شهور السنة العربية شهراً كاملاً، وشهراً ناقصاً، وابتدأوا بالمحرم اقتداء بالصحابة رضي الله عنهم، فجعلوا المحرم ثلاثين يوماً ، وجمادى الأولى ثلاثين

يوماً، وجمادى الآخرة تسعة وعشرين يوماً، ورجب ثلاثين يوماً، وشعبان تسعة وعشرين يوماً، ورمضان ثلاثين يوماً، وشوالاً تسعة وعشرين يوماً، وذا القعدة ثلاثين يوماً، وذا الحجة تسعة وعشرين يوماً، وزادوا من أجل كسر اليوم الذي هو خمس وسدس يوماً في ذي الحجة إذا صار هذا الكسر أكثر من نصف يوم، فيكون شهر ذي الحجة في تلك السنة ثلاثين يوماً، ويسمون تلك السنة كبيسة، ويصير عددها ثلثمائة وخمسة وخمسين يوماً، ويجتمع في كل ثلاثين من الكبس أحد عشر يوماً، والله أعلم.

اور تم جان چکے ہو کہ تاریخ ہجرت کے مہینے قمری ہیں، اور اس کے ہر سال کے ایام کی تعداد تین سو چون دن اور ایک خُمس (۱/۵) اور ایک سُدُس (۱/۶) دن ہے اور سارے اسلامی فرقوں کے نزدیک تمام احکام شرعیہ چاند کے دیکھنے ہی پر موقوف ہیں، سوائے شیعہ (باطنیہ) کے کہ ان کے یہاں احکام شرعیہ کا دار و مدار سال کے ان مہینوں پر ہے جو حساب سے بنتے ہیں جیسا کہ قاہرہ اور وہاں کے خلفاء کے تذکرہ میں تم دیکھو گے۔

پھر جب منجمینِ اسلام کو ضروری چیزوں کے دریافت کرنے کی حاجت پیش آئی جیسے ہلالوں کا معلوم کرنا یا سمتِ قبلہ وغیرہ کا پتہ چلانا تو انہوں نے اپنی زیچوں (تقویموں) کی بنا تاریخ عربی پر رکھی اور عربی سال کے مہینے اس طرح قرار دیئے کہ ایک مہینہ کامل (یعنی تیس دن کا) اور ایک مہینہ ناقص (یعنی اُنتیس دن کا) اور سال کی ابتداء صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی اقتداء میں محرم سے رکھی، چنانچہ محرم کو تیس دن کا قرار دیا اور صفر کو انتیس دن کا اور ربیع الاول کو تیس دن کا اور ربیع الآخر کو انتیس دن کا اور جمادی الاولیٰ کو تیس دن کا اور جمادی الآخرہ کو انتیس

دن کا اور رجب کو تیس دن اور شعبان کو انیتس دن کا اور رمضان کو
تیس دن کا اور شوال کو انیتس دن کا اور ذی القعدہ کو تیس دن کا اور ذی
الحجہ کو انیتس دن کا اور ایک دن کی اس کسر کی بنا پر کہ جو ایک خُمس
(۱/۵) اور ایک سُدُس (۱/۶) کی وجہ سے ہوتی ہے ذی الحجہ میں ایک
دن کا اضافہ کیا بایں طور کہ جب یہ کسر نصف دن سے زیادہ ہو جائے تو
اس سال کو سالِ کبیسہ کہتے ہیں اور یہ سال تین سو پچپن دن کا ہوتا ہے
اور ہر تیس سال میں کبیسہ کے
جملہ دن گیارہ ہوتے ہیں، واللہ اعلم۔[۹۹]

منجموں کے اصول پر تقویم سازی کا طریقہ

اس تفصیل سے ناظرین نے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ منجمین نے جس اصول پر اپنی تقویم کو مرتب کیا ہے وہ اور ہے اور مسلمانوں میں جس اصول پر مہینوں کا شمار ہے وہ اور ہے۔ اسلامی شریعت کے اعتبار سے سال کا ہر مہینہ ایک رؤیت ہلال سے شروع ہو کر دوسری رؤیت ہلال پر ختم ہو جاتا ہے لیکن منجموں کے یہاں قمر کے بارہ اور دن کی مجموعی مدت کو جو تین سو چوّن دن اور ایک خُمس اور ایک سدس دن پر مشتمل ہے بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ان کے بارہ مہینے بناتے ہیں اور چونکہ اس مدت کی تقسیم بارہ مساوی حصوں پر بغیر کسر پڑے نہیں ہو سکتی اس لئے اس کسر کو دور کرنے کے لئے انہیں پورے تیس سال کا حساب لگانا پڑتا ہے اور پھر تیس سال کے مجموعۂ ایام کو حسب قاعدہ سابقہ اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ پہلا مہینہ ہمیشہ تیس کا شمار کرتے ہیں اور دوسرا ہمیشہ انیتس کا، البتہ سال کبیسہ میں ذی الحجہ کو بھی تیس ہی دن کا مانتے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل ابو ریحان بیرونی کے الفاظ میں حسب

99۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور عنوان ''تاریخ العرب'' (ص ۳۰۶،۳۰۵)

ذیل ہیں، وہ لکھتے ہیں:

وأما تاريخ الهجرة في الإسلام فإنا إذا أردناه قسمنا أيامه المحصلة على سنة القمر الوسطى وهى ثلاث مائة وأربعة و خمسون يومًا و خُمُس وسُدُس بأن نضربها في ثلاثين، وهو أقل عدد له خمس و سدس و نقسم المجتمع على عشرة آلاف وست مائة واحد و ثلاثين و هو مضروب ثلاث مائة و أربعة وخمسين في ثلاثين مضافاً إلى ما اجتمع أحد عشر التي هي مجموع خمسها وسدسها فما خرج فسنون تامة قمرية وما بقي مجموع خمسها وسدسها فما خرج فسنون تامة قمرية وما بقى فأيام مضروبة في ثلاثين فإذا قسمناها على ثلاثين عاد القسيم أياماً فنأخذ منها لشهر ثلاثين يوماً ولشهر تسعة وعشرين، ونبدأ من المحرم، وما بقي لم يتم شهرًا فهو ما مضى من ذلک الشهر، وعلى هذا يعمل في استخراج التواريخ في الزيجات فإن سلک فيه طرق مختلفة فهى راجعة إلى معنى واحد. فأما على رؤية الهلال فيمكن أن يتوالى فيه شهران ناقصان وثلاثة أشهر تامة، ويمكن أن تزيد سنة القمر على المقدار المذكور وتنقص منه بسبب اختلاف الحركة.

(الآثار الباقية عن القرون الخالية ص142)

اور اسلامی تاریخِ ہجرت جب ہمیں مطلوب ہو تو اس تاریخ کے ''ایام محصلہ''[100] کو قمر کے سنہ وسطیٰ پر جو کہ تین سو چوّن دن اور ایک خمس اور ایک سدس دن کا ہوتا ہے ہم تقسیم کردیں گے، بایں طور کہ

100۔ ''ایام محصلہ'' سے مراد آغاز تاریخ سے لیکر یومِ مطلوب تک دنوں کی مجموعی تعداد ہے۔

اس سالِ قمری کو تیس میں ضرب دیں گے کیونکہ تیس ہی سب سے چھوٹا عدد ہے جس میں خمس بھی ہے اور سدس بھی، اور پھر ان ایام محصلہ کو دس ہزار چھ سو اکتیس کے مجموعہ پر جو (تین سو چوّن کو تیس میں ضرب دینے سے حاصل ہوتے ہیں مع ان گیارہ دنوں کے جو تیس خمس اور تیس سدس کا مجموعہ ہیں) تقسیم کریں گے اب جو خارجِ قسمت ہو گا وہ مکمل قمری سال ہوں گے اور جو باقی بچے گا وہ دن ہوں گے کہ جو تیس میں ضرب دینے سے حاصل ہوئے تھے۔ سو جب ہم نے ان کو تیس پر تقسیم کر دیا تو تقسیم سے دن بن گئے اب ایک ماہ کے لئے تیس دن لیں گے اور دوسرے ماہ کے لئے انیتس، اور محرم سے شروع کریں گے، اور ما بقی پورا مہینہ نہیں بنتا تو وہ اس مہینہ کا گزرا ہوا حصہ ہے۔ زیچوں (تقویموں) میں تو تاریخوں کے نکالنے کے لئے اسی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے اور گو اس سلسلہ میں مختلف طریقے استعمال میں لائے جائیں، تاہم سب کا مرجع اسی ایک اصول کی طرف ہے لیکن رؤیت ہلال پر یہ ممکن ہے کہ دو مہینے مسلسل انیتس انیتس دن کے ہوں اور تین مہینے مسلسل تیس تیس دن کے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حرکتِ قمر کے اختلاف کے باعث سالِ قمری مقدار مذکور سے زائد یا کم ہو جائے۔

ابوریحان بیرونی علمِ ہیئت و ریاضی کا مانا ہوا امام ہے، اس کی تصریح آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ تقویم کا حساب نہ تو رؤیت ہلال کے حساب سے موافق ہے اور نہ قمر کی حقیقی حرکت کے مطابق، بلکہ اس حساب میں تیس سال کے مجموعہ ایام کو بغیر اس کے کہ ان میں رؤیت ہلال کا لحاظ رکھا جائے یا قمر کی حقیقی حرکت کو دیکھا جائے، محض اپنی سہولت کی خاطر فرضی طور پر اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ ہر طاق مہینہ ہمیشہ تیس کا مانا جائے گا اور ہر جفت مہینہ ہمیشہ انیتس کا بجز ذی الحجہ کے کہ وہ سالِ کبیسہ میں باوجود

جفت ہونے کے تیس ہی دن کا شمار ہوگا اور اس طرح ہر تیس سال میں انیس سال بسیطہ تین سو چوّن دن کے ہوں گے اور گیارہ سال کبیسہ تین سو پچپن دن کے۔

شریعت میں منجمین کے حساب کا کیوں اعتبار نہیں؟

ابو ریحان کی اس تفصیل سے شریعت مطہرہ کی یہ حکمت بھی معلوم ہوئی کہ اس نے کیوں ماہ و سال کے بارے میں منجمین و اہل تقویم کے حساب کا اعتبار نہ کیا بلکہ اس کے بجائے رؤیتِ ہلال کو مدار تاریخ ٹھہرایا اور آنحضرت ﷺ نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ:

جعل الله الأهلة مواقيت فإذا رأيتموه فصوموا و إذا رأيتموه فأفطروا فإن غم عليكم فعدوا ثلاثين يوماً.[۱۰۱]

اللہ تعالیٰ نے ہلالوں کو لوگوں کے لئے اوقات کی تعیین کا ذریعہ بنایا ہے، لہٰذا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور جو مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن گن لو۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے وہ حقائق سے قطع نظر کر کے منجموں کے فرضی حساب کا کیوں پابند ہوتا، دین اسلام میں اوقاتِ عبادات کی بنا ان حقائق ثابتہ پر رکھی گئی ہے جن کے معلوم کرنے میں عام خاص سب برابر ہیں، اسلام کا قانون عدل و مساوات اس بات کا سرے سے روادار نہیں کہ عبادات کی بجا

101۔ یہ حدیث ''مصنف عبدالرزاق'' میں اس اسناد کے ساتھ منقول ہے: عن عبد العزيز بن أبي رواد عن نافع عن ابن عمر رضى الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ (ملاحظہ ہو ''تفسیر ابن کثیر'' ۲۵۵/۱) اور محدث حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب ''المستدرک علی الصحیحین'' میں اس کو روایت کر کے لکھتے ہیں ''صحیح الاسناد'' یہ بھی واضح رہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ''تلخیص المستدرک'' میں حاکم کی تصحیح کو بلا چوں وچرا تسلیم کر لیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ''المستدرک'' اور اس کی تفصیل تلخیص ۱/۴۲۳ طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن)

آوری تو سب پر یکساں فرض ہو مگر ان کے اوقات کا معلوم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ ہو بلکہ وہ خاص منجمین اور موقتین کا حصہ ہو، یہی حکمت ہے جس کی بنا پر شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اوقاتِ نماز کا تعین آفتاب کی گردش سے متعلق کیا ہے اور سال و ماہ و روز کی تعین رؤیت ہلال سے، ورنہ اگر ہماری شریعت میں بھی دوسرے مذاہب کی طرح شمسی حساب کا اعتبار ہوتا یا قمری سال کی بنا رؤیت ہلال کے بجائے تقویم پر رکھ دی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ساری امت اپنے فرائض مذہبی کی بجاآوری میں منجمین و مؤقتین کی محتاج ہو کر رہ جاتی جو ان کو حساب لگا لگا کر ان کے اوقاتِ عبادات کو بتایا کرتے اور عید، بقر عید، روزہ اور حج وغیرہ کے ایام کا پہلے سے تعین کر دیا کرتے اور اس طرح مذہبی ارکان کی ادائیگی کی اجارہ داری ان کے طبقہ کے لئے مخصوص ہو کر اسلام میں برہمنیت اور پاپائیت کا ایک سلسلہ چل پڑتا، جس کے لئے اسلام میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تقویم کا حساب فرضی ہے

ہم نے تقویم کے حساب کو جو فرضی کہا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام اجرامِ سماوی میں چونکہ آفتاب و ماہتاب سب سے زیادہ نمایاں ہیں اس لئے دنیا کے تمام لوگوں نے ماہ و سال کا شمار ان ہی دونوں کی گردش پر رکھا ہے، بایں طور کہ شمس کی نسبت سے قمر کے ایک دورِ وضعی کو قمری ماہ بنا لیا، یعنی شمس کے ساتھ جو قمر کی ایک وضع معین اور صورتِ خاص ہو مثلاً اجتماع یا ہلال یا استقبال اس کو ماہ قمری کا مبدا مانا اور دوبارہ اسی وضع معین اور صورتِ خاص پر قمر کے آجانے کو اس کا منتہا اور ان دونوں اجتماعوں یا دونوں ہلالوں یا دونوں استقبالوں کے درمیانی زمانہ کو ماہ قمری سے موسوم کیا جیسا کہ ہماری شریعت میں ہر ایک ہلال سے ماہ کا خواہ وہ تیس دن میں تمام ہو یا انتیس دن میں ایک ماہ شمار کیا ہے اور پھر اسی طرح بارہ قمری مہینوں کو ایک سال کہنے لگے، اور

شمس کی ایک گردش کو یعنی منطقۃ البروج کے ایک نقطہ معینہ مثلاً اول برج حمل سے جدا ہو کر دوبارہ اسی نقطہ پر آفتاب کے آجانے کو سالِ شمسی قرار دیا اور چونکہ آفتاب کی گردش بارہ برجوں پر منقسم ہے اس لئے ہر برج کے طے کرنے میں آفتاب کو جو عرصہ لگتا ہے اس کو ماہِ شمسی بنایا، پھر منجموں نے تقویم کو بنانے کے لئے اپنی سہولت کی خاطر ہر ماہ و سال کی خواہ وہ قمری ہوں یا شمسی دو قسمیں بنائیں، ایک حقیقی، دوسرے اصطلاحی جس کو وسطی بھی کہا جاتا ہے، حقیقی وہ ہے جس میں شمس و قمر کی گردش کا پورا پورا لحاظ ہو اور ان کی وضع خاص اور برج کی تقسیم اور حرکت کے اعتبار سے مدت کی تعیین ہو۔ چنانچہ مثلاً ماہ حقیقی قمری وہ ہے کہ جس میں دونوں ہلالوں کے درمیانی زمانہ میں ایک ساعت یا ایک دقیقہ کی بھی کمی بیشی نہ ہو جیسا کہ ہماری شریعت میں زیادہ کا شمار اسی طرح ہے اور سال حقیقی قمری وہ ہے کہ جو بارہ ماہ ہائے حقیقی قمری سے ذرا کم و بیش نہ جیسا کہ ہماری شریعت میں ہے، اسی طرح ماہ حقیقی شمسی وہ ہے کہ جس کا زمانہ آفتاب کے ایک برجِ معین میں رہنے کے بالکل برابر ہو اور سال شمسی حقیقی وہ مدت ہے جو آفتاب کے ایک مکمل دورہ کے عین مطابق ہو، اور ماہ اصطلاحی وہ ہے کہ جس میں شمس و قمر کی گردش کا لحاظ نہ ہو بلکہ ہر مہینہ کے لئے ایامِ معینہ کی ایک تعداد مقرر کر دی جائے مثلاً کسی مہینہ کو انیتس کا اور کسی کو تیس کا اور کسی کو اکتیس کا مقرر کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ مہینہ کی یہ مقدار کبھی ماہ حقیقی سے زیادہ ہو گی اور کبھی کم، اور جو سال ان بارہ ماہ ہائے اصطلاحی سے مرکب ہو وہ سالِ
اصطلاحی کہلاتا ہے۔[۱۰۲]

اس تفصیل کے بعد اب آپ ابوالفضل کا یہ بیان پڑھیے:

102۔ اس ساری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زیچ بہادر خانی" مؤلف مولوی غلام حسین جونپوری۔ ص ۳۶ طبع بنارس ۱۲۵۷ء۔

اہل حساب رؤیت را از نظر انداز ختہ ماہِ قمری را بر دو گونہ ساختہ اند، حقیقی و آں از ہنگام دوریِ ماہ از وضع معین بآفتاب چون اجتماع یا استقبال یا جز آن تا باز بداں رسد، و اصطلاحی چون حرکات، قمر مختلف باشد ضبط آن دشوار و، ہمچنان مشکلہا، پس بحرکت وسطے قرار دادند و لختی کار آسان شد۔ [۱۰۳]

اور اہل حساب نے رؤیت کو نظر انداز کر کے ماہ قمری کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وضع معین جیسے (ایک برج میں دونوں کے اجتماع یا بالکل مقابل برجوں میں) دونوں کے آمنے سامنے ہونے یا کسی اور وضع معین سے دور ہو کر پھر اسی وضع معین پر آجانے کا نام ہے۔ دوسرے اصطلاحی چونکہ چاند کی گردش مختلف ہوا کرتی ہے اور اس کا پوری طرح حساب کرنا اور اس کی شکلوں کو محفوظ رکھنا دشوار ہے اس لئے حرکتِ وسطی سے حساب لگایا اور کچھ کام آسان ہو گیا۔

اس کے بعد ابوالفضل نے زیچ بنانے کا وہی قاعدہ بنایا ہے جو مقریزی اور بیرونی کے بیانات ابھی آپ کی نظر سے گذرا۔

اب ظاہر ہے کہ اہل حساب نے جب اپنی تقویموں میں رؤیت کو نظر انداز کیا اور ماہ و سالِ حقیقی کو سرے سے چھوڑ دیا اور شمس و قمر کی حقیقی گردش کا خیال نہ کیا تو ان کا حساب فرضی نہ ہوا تو کیا ہوا۔ ارباب تقویم کے اس حساب کی حقیقت اتنی ہے کہ تیس سال میں قمر کے تیس دور پورے ہو جاتے ہیں اور ان تیس سالوں میں انیس سال تین سو چون دن کے ہوتے ہیں اور گیارہ سال تین سو پچپن دن کے لیکن ان میں کونسا قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوگا اور کونسا ۳۵۵ دن کا، اس کی تعیین ان کے بس کی بات نہیں اور یہ جو زیچ نگاروں نے ان گیارہ سالوں کی اس طرح تعیین کی ہے کہ:

103۔ ''آئین اکبری''، ص ۲۳۰ طبع دہلی ۱۲۷۲ھ بہ تصحیح سرسید احمد خان۔

"ودر ہر سی سال یازدہ بار ذی الحجہ را سی روز گیرند ایں سالہا را کبیسہ نامند و آن سالہاے، ۵، ۲، ۱۰، ۱۳، ۱۵، ۱۸، ۲۱، ۲۴، ۲۶، ۲۹، است"[104]

سو محض فرضی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ان ہی سالوں کے ایام ۳۵۵ دن کے ہوں جیسا کہ ذی الحجہ کا ان سالوں میں تیس دن کا ہونا قطعاً ضروری نہیں، عین ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی سال ۳۵۴ دن کا ہو اور بقیہ انیس میں سے کوئی ۳۵۵ کا جس طرح کہ تقویم میں جن مہینوں کو تیس دن کا بتایا ہے ان کا تیس ہی دن کا ہونا یا جن کو انیتس دن کا بتایا ہے ان کا انیتس ہی دن کا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی لئے امامِ فن بیرونی نے تقویم سازی کا اصول بتاتے ہوئے آخر میں تصریح کر دی ہے کہ:

"رؤیت ہلال کے اعتبار سے ممکن ہے دو ماہ مسلسل انیتس انیتس دن کے ہوں اور تین ماہ مسلسل تیس تیس دن کے اور بالکل ممکن ہے کہ حرکت قمر کے اختلاف کے باعث سالِ قمری مقدار مذکور سے (جو تقویم میں قرار دی گئی ہے) زائد یا کم ہو جائے۔"

تقویم کا حساب حقیقی جب ہوتا ہے کہ چاند کی حقیقی حرکات کا انضباط منجمین کے لئے آسان ہوتا، حالانکہ ابوالفضل کا یہ اعتراف ابھی آپ کی نظر سے گذرا کہ "حرکات قمر مختلف باشد ضبط آں دشوار و ہمچناں مشکلہا" (آئین اکبری ص ۲۲۰) ابوالفضل کے اعتراف عجز کی وجہ بیرونی سے سنیئے جو اپنی مشہور کتاب "الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ" میں "شیعہ اسماعیلیہ" کے حساب تقویمی کا محاسبہ کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہے:۔

ويبتدؤن بالشهر من عند رؤية الهلال وكذلك شرع في الإسلام كما قال الله تعالى «يسئلونك عن الأهلة قل هي مواقيت للناس والحج».

104۔ "زیچ بہادر خانی" ص ۵۰ طبع بنارس ۱۲۶۶ھ۔

ثم منذ سنين نبتت نابتة ونجمت ناجمة ونبتت فرقة جاهلية فنظروا إلى أخذهم بالتأويل وولوعهم بسب الآخذين بالظاهر بزعمهم إلى اليهود والنصارى فإذن لهم جداول وحسابات يستخرجون بها شهورهم ويعرفون منها صيامهم والمسلمون مضطرون إلى رؤية الهلال وتفقد ما إكتساه القمر من النور واشترك بين نصفه المرئي ونصفه المستور ووجدوهم شاكين في ذلك مختلفين فيه مقلدين بعضهم بعضاً بعد استفراغهم أقصى الوسع في تأمل مواضعه.

ثم رجعوا إلى أصحاب علم الهيئة فألفوا زيجاتهم وكتبهم مفتتحه بمعرفة أوائل ما يراد من شهور العرب بصنوف الحسابات وأنواع الجداول فظنوا إنها معمولة لرؤية الأهلة وأخذوا بعضها ونسبوه إلى جعفر الصادق رضى الله عنه وزعموا أنه من أسرار النبوه.

وتلك الحسابات مبنية على حركات الوسطى دون المرئية أعنى المعدلة ومعمولة على أن سنة القمر ثلاثمائة وأربعة وخمسون يوماً وسدس (كذا) وإن ستة أشهر من السنة تامة وستة ناقصة وأن كل ناقص منها تال لتام على ما عمل عليه في الزيجات وذكر في الكتب المنسوبة إلى عللها فلما قصدوا إستخراج أول الصوم وأول الفطر بها خرجت قبل الواجب بيوم في أغلب الأحوال ...قالوا وإن شهر رمضان لا ينقص من ثلاثين.

فأما أصحاب الهيئة ومن تأمل الحال بعناية شديدة فإنهم يعلمون أن رؤية الهلال غير مطردة على سنن واحد لاختلاف حركة القمر المرئية بطيئة مرة وسريعة أخرى

وقربه من الأرض وبعده وصعوده فى الشمال والجنوب وهبوطه فيهما وحدوث كل واحد من هذة الأحوال له في كل نقطة من فلك البروج ثم بعد ذلك لما يعرض من سرعة غروب بعض القطع من فلك البروج وبطء بعض وتغير ذلك على إختلاف عروض البلدان واختلاف الأهويه إما بالإضافة إلى البلاد الصافية الهواء بالطبع والكدورة المختلطة بالبخارات دائماً والمغبرة فى الأغلب وإما بالإضافة إلى الأزمنة إذ غلظ فى بعضها ورق فى بعض وتفاوت قوى بصر الناظرين إليه فى الحدّة والكلال وإن ذلك كله على اختلاف بصنوف الاقترانات كائنة في كل أول شهري رمضان وشوال على أشكال غير معدودة وأحوال غير محدودة فيكون لذلك شهر رمضان ناقصاً مرة وتاماً مرة أخرى وأن ذلك كله يتفنن بتزايد عروض البلدان وتناقصها فيكون الشهر تاماً في البلدان الشمالية مثلاً وناقصاً هو بعينه في البلدان الجنوبية منها وبالعكس ثم لا يجري ذلك فيها على نظم واحد بل يتفق فيها أيضاً حالة واحدة بعينها لشهر واحد مرارا متوالية وغير متوالية .

فلو صح عملهم مثلاً بتلك الجداول والحسابات واتفق مع رؤية الهلال أو تقدمه يوماً واحداً كما أصلوا لاحتاجوا إلى إفرادها لكل عرض على أن اختلاف الرؤية ليس متولداً من جهة العروض فقط لكن لاختلاف أطوال البلدان فيها أوفر نصيباً لأنه ربما لم يُر في بعض البلاد ورأى فيما كان أقرب منه إلى المغرب وربما اتفق ذلك فيهما جميعاً وذلك مما يحوج أيضا إلى إفراد الحساب والجداول لكل واحد من

أجزاء الطول فإذن لا يمكن ما ذكروه من تمام شهر رمضان أبداً ووقوع أوله وآخره في جميع المعمور من الأرض متفقاً كما يخرجه الجدول الذي يستعملونه.

(ص ۶۴ تا ۶۶ طبع لیپزک 1923ء)

اور عرب مہینے کی ابتداء رؤیت ہلال سے کرتے ہیں اور اسی طرح اسلام میں مشروع ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لوگ آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اوقات مقررہ ہیں۔"

پھر چند سال سے ایک نئی پود اگ آئی ہے اور ایک نمایاں جماعت نمودار ہوئی ہے اور ایک جاہلی فرقہ ابھرا ہے جو اپنے خیال میں ظاہر پر عمل کرنے والوں کے سبب سے تاویل کو اختیار کرتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہیں ان لوگوں نے یہود و نصاریٰ کو دیکھا کہ ان کے پاس تو گوشوارے اور حسابات موجود ہیں جن سے وہ اپنے مہینوں کو نکال لیتے ہیں اور اپنے روزوں کو معلوم کر لیتے ہیں مگر مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ رؤیت ہلال پر مجبور ہیں اور چاند میں روشنی آجانے کے اور فکر میں لگے رہتے ہیں کہ قمر کے نصف مرئی اور نصف مستور میں کس قدر اشتراک نور ہوا ہے اور پھر باوجود اس بات کے کہ وہ اپنی پوری کوشش چاند کے مقامات پر غور کرنے اور اس کے مغارب و مواقع کے ڈھونڈنے میں صرف کر دیتے ہیں پھر بھی ان میں شک اور اختلاف رہتا ہے اور ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں۔

آخر انہوں نے اصحاب علم ہیئت کی طرف رجوع کیا جنہوں نے اپنی زیچوں اور اپنی کتابوں کو طرح طرح کے حسابات اور مختلف گوشواروں کے ساتھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ ان کے آغاز ہی میں عربی مہینوں کے اوائل کی معرفت کا بیان ہے، لہٰذا انہوں نے یوں

سمجھا کہ یہ زیچیں رؤیت ہلال کے لئے بنائی گئی ہیں، چنانچہ انہوں نے ان میں سے بعض حسابات اور گوشواروں کو لیکر حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا اور یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ بھی اسرار نبوت میں سے ایک راز ہے، حالانکہ یہ سب حسابات شمس و قمر کی حرکات وسطی (یعنی حرکات اصطلاحی غیر حقیقی) پر مبنی ہیں نہ حرکات مرئیہ پر جو کہ حقیقی ہیں، نیز یہ زیچیں اسی اصول پر بنائی گئی ہیں کہ سالِ قمری تین سو چون دن اور ایک خمس اور ایک سدس دن کا ہوتا ہے اور سال کے چھ مہینے کامل (تیس دن کے) اور چھ مہینے ناقص (یعنی ۲۹ دن کے) ہوتے ہیں اور ہر ناقص مہینہ کامل کے معًا بعد ہوتا ہے جیسا کہ زیچوں میں معمول ہے اور ان کتابوں میں مذکور ہے جو علل زیچ کی طرف منسوب ہیں (یعنی جن میں زیچ تیار کرنے کے وجوہ بیان ہوتے ہیں۔)

پھر جب اس جدید فرقہ نے اول رمضان یا عید کو معلوم کرنا چاہا تو اکثر حالات میں واجب ہونے سے ایک دن پہلے کا دن نکلا.... یہ فرقہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ ماہ رمضان تیس دن سے کم نہیں ہوتا۔

لیکن اصحاب ہیئت اور جن لوگوں نے پوری توجہ کے ساتھ معاملہ پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ رؤیتِ ہلال ہمیشہ ایک طریقہ پر ممکن نہیں کیونکہ قمری حرکت مرئیہ کبھی آہستہ ہوتی ہے اور کبھی تیز اور کبھی وہ زمین سے قریب ہوتا ہے اور کبھی دور، اور کبھی وہ شمال و جنوب میں حالت صعود میں ہوتا ہے اور کبھی حالتِ ہبوط میں اور یہ سب حالات فلک البروج کے ایک ایک نقطہ پر اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان سب پر مزید یہ کہ فلک البروج کے بعض قطعے جلدی غروب ہو جاتے ہیں اور بعض دیر میں اور عرض البلد کے اعتبار سے بھی اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور ہوائوں کے اختلاف سے بھی کہ بعض ملکوں کی ہوا بالطبع صاف ہوتی اور بعض میں ہمیشہ بخارات کے اختلاف کی وجہ سے

کدورت رہتی ہے اور بعض کی فضا اکثر غبار آلود رہتی ہے، نیز موسم کے لحاظ سے بھی ہواؤں میں اختلاف ہوتا ہے کہ کسی موسم میں اس میں کثافت آجاتی ہے اور کسی موسم میں اس میں رقت رہتی ہے نیز دیکھنے والوں کی نگاہ کی قوتوں میں بھی تیزی اور درماندگی کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے اور قمر کے یہ سب مختلف احوال اور طرح طرح کے قرانات ہر ماہ رمضان و شوال کی ابتداء میں بے شمار اشکال اور غیر محدود احوال پر ہوتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ماہ رمضان انیتس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا اور یہ سب حالات عرض البلد کے گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے مختلف طور پر ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ کبھی شمالی ملکوں میں ایک مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے اور وہی مہینہ جنوبی ممالک میں انیتس کا اور کبھی اس کے بالکل برعکس، پھر یہ بھی ہمیشہ ایک نظم پر نہیں چلتا بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مہینہ بارہا مسلسل یا غیر مسلسل ایک ہی حالت پر چلتا رہتا ہے تو اب بطور مثال ان گوشواروں اور حسابات کے لحاظ سے ان کا عملِ صحیح بھی ہو اور وہ رؤیتِ ہلال سے متفق ہو جائے یا ان کے اصول پر ایک دن پہلے بنے تب بھی ان کے لئے ضروری ہے کہ ہر عرض البلد کے لئے ایک علیحدہ نقشہ بنائیں اگرچہ رؤیت ہلال میں اختلاف محض عرض البلد ہی کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ طول البلد کو بھی اس اختلاف میں بہت بڑا دخل ہے، کیونکہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ہے کہ بعض بلاد میں چاند نظر نہیں آتا اور جو ممالک اس سے مغرب میں قریب ہوتے ہیں وہاں نظر آتا ہے اور کبھی دونوں جگہ دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور اس بنا پر ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ طول البلد کے ہر جزء کے لئے مستقل حسابات اور نقشے تیار کریں غرض ایسی صورت میں جو یہ فرقۂ جدیدہ اس امر کا مدعی ہے کہ رمضان کا مہینہ ہمیشہ تیس ہی دن کا ہوتا ہے اور تمام معمورہ ارض میں اس کا اول و آخر ہمیشہ یکساں ہی ہوتا ہے جیسا کہ

اُن کا وہ گوشوارہ بتاتا ہے جس کو یہ استعمال میں لاتے ہیں، وہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔

اور آگے چل کر اسی کتاب میں جہاں ہجری قمری مہینوں کے اوائل کو معلوم کرنے کا قاعدہ بیان کیا ہے یہ بھی لکھا ہے کہ:

فأما رؤية الهلال ففي تحقيقه من الطول والصعوبة ما يحتاج معه إلى أعمال صبعة وجداول كثيرة ويكتفي بما في زيج محمد بن جابر البتانى وزيج حبش الحاسب فليقصد هما إن احتاج إليهما. (196)

لیکن (ریاضی کے اصول پر) رؤیت ہلال کی تحقیق میں وہ طول اور دشواری ہے کہ اس کے لئے سخت اعمال اور بہت سے گوشواروں کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ محمد بن جابر بتانی کی زیچ اور حبش حاسب کی زیچ میں ہے اس پر اکتفا کیا جائے اور ان دونوں کی ضرورت پڑے تو ان کی طرف مراجعت کی جائے۔

اور پھر اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ باطنی فرقے نے جو تشیع اہل بیت کا مدعی ہے اسی قاعدہ مذکور کو عمل میں لاکر ایک حساب پیش کیا ہے جس کے بارے میں اس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ وہ اسرار نبوت میں سے ہے، حالانکہ یہ سارا حساب اسی قاعدہ پر مبنی ہے۔ البیرونی نے صاف صاف اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ روئیت ہلال کے بارے میں اثبات یا نفی میں کوئی قطعی اور حتمی حکم لگانا اہل فن کی استطاعت سے خارج ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

ووجدت بعض روسائهم أخذ الجدول المجرد الذي وضعه حبش في زيجه لتصحيح التاريخ المستعمل في حساب الكواكب ... واقتفى أثر القوم بوضع كتاب طعن فيه على طالبي الهلال بالرؤية وسبهم وغيرهم باستغناء اليهود

والنصارى عن طلب الهلال للصيام وإوائل الشهور بما عندهم من الجداول واشتغال المسلمين بالمتشابه من الأحوال ولو جاوز موضع الجدول المجرد من زيج حبش حتى انتهى إلى أعمال أصحاب الهيئة في رؤية الهلال ووقف على كيفياتها وعلى حقائق ما عليه اليهود والنصارىٰ لعلم أن الذي ذهب

إليه أهل الكتاب هى الشبه بعينها وعسى الواقف على ما قدمنا يحقق ذلک على أن علماء الهيئة مجمعون على أن المقادير المفروضة في أواخر أعمال رؤية الهلال هى أبعاد لم يوقف عليها إلا بالتجربة وللمناظر أحوال هندسية يتفاوت لأجلها المحسوس بالصر في العظم والصغر وفي الأحوال الفلكية ما إذا تأملها متأمل منصف لم يستطع بث الحكم على وجوب رؤية الهلال أو امتناعلها وخاصة حين يقع قريباً من نهاية ذلک البعد المفروض.(ص197، 198)

اور میں نے اس جماعت کے ایک سر برآوردہ شخص کو دیکھا کہ اس نے مجرد اس گوشوارہ کو لیکر جو حبش نے اپنی زیچ میں اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ کواکب کے حساب میں جو تاریخ مستعمل ہوتی ہے اس کی تصحیح کی جائے.... اپنی قوم کے قدم بقدم چلتے ہوئے ایک کتاب تصنیف کی جس میں رؤیت ہلال کے تلاش کرنے والوں پر طعن و تشنیع کی، ان کو برا بھلا کہا اور عار دلائی کہ یہود و نصاریٰ کو تو اپنے روزوں کے لئے اور مہینوں کی پہلی تاریخ معلوم کرنے کے لئے رؤیت ہلال کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ان کے پاس اس کے گوشوارے موجود ہیں اور اہل اسلام مشتبہ حالات میں پڑے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ شخص حبش کی زیچ میں اس مجرد جدول کے مقام سے آگے بڑھ کر

ذرا اس مقام تک آتا کہ جہاں رؤیت ہلال کے بارے میں اصحاب ہیئت کے اعمال کا ذکر ہے اور ان اعمال کی کیفیات پر اور ان حقائق پر مطلع ہوتا ہے جن پر یہود و نصاریٰ کا عمل ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہود و نصاریٰ جس طرف گئے ہیں شبہ دراصل وہی ہے اور امید ہے کہ جو شخص سابق میں ہماری بیان کردہ تفصیلات سے واقف ہوگا وہ ہماری اس بات کی تصدیق کرے گا علاوہ ازیں علماء ہیئت اس بات پر متفق ہیں کہ جو مقداریں اعمال رویت ہلال کے اواخر میں فرض کی گئی ہیں وہ ایسے ابعاد ہیں جن پر صرف تجربہ سے واقفیت حاصل کی گئی ہے، حالانکہ دیکھنے میں علم ہندسہ کے اعتبار سے ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن کی بناپر جو چیز آنکھوں سے محسوس ہوتی ہے اس میں بڑائی اور چھوٹائی کے لحاظ سے فرق ہوتا رہتا ہے، نیز فلکی حالات میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے جس کی بناپر اگر کوئی غور کرنے والا مُنصف مزاج غور و تامل سے کام لے تو رویت ہلال کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتا خاص طور پر جبکہ چاند اس بعد مفروض کی انتہا کے قریب ہو۔

ملاحظہ فرمایئے یہ ہے بیرونی کی تصریح کہ کوئی صاحب فن جو انصاف سے بہرہ ور ہو اور غور و تامل سے پوری طرح کام لیتا ہو وہ ہرگز یہ نہیں کرسکتا کہ رؤیت ہلال کے متعلق نفی یا اثبات میں کوئی قطعی یا حتمی حکم لگادے بیرونی نے یہ دعویٰ علم و فضل کی روشنی میں کیا ہے اور اس کے وجوہ و دلائل کی تفصیل ابھی آپ کی نظر سے گذر چکی ہے۔ آج ریاضی کا فن بڑی ترقی کر گیا ہے تاہم ابھی تک بیرونی کے اس دعویٰ کی علمی تردید نہ کی جاسکی۔ چنانچہ اب تک رؤیت ہلال کی کوئی ایسی صحیح تقویم دنیا کے سامنے مرتب ہو کر نہیں آئی جس میں غلطی کا شائبہ نہ ہو۔

ہمارا محکمۂ موسمیات جس طرح آئے دن یہاں کے موسم اور باد و باراں کے متعلق پہلے سے اعلان کرتا رہتا ہے اسی طرح رؤیت ہلال کے بارے میں بھی اس کی پیشن گوئیاں برابر صادر ہوتی رہتی ہیں[۱۰۵] لیکن وہ جس محتاط انداز میں اعلان کرتا ہے وہ خود جزم ویقین کی نفی کے لئے کافی ہے، چنانچہ مثال کے طور پر ۱۳۸۰ھ میں عید اور بقر عید کے چاند کے متعلق ہمارے محکمۂ موسمیات نے جو پیشنگوئی کی تھی وہ ناظرین کی معلومات کے لئے روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''عید کا چاند مارچ کو نظر آئے گا۔(جلی عنوان)

کراچی ۱۴ مارچ (اسٹاف رپورٹر) پاکستان کے محکمۂ موسمیات نے اعلان کیا ہے کہ پورے ملک میں خاص کر مغربی پاکستان میں چاند ۱۷ مارچ ۶۱ء کو نظر آنے کے ''قوی امکانات'' ہیں۔ (روزنامہ جنگ، کراچی ۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء، ص ۶ کالم: ۱)

''ذی الحجہ کا ہلال، مئی کو نظر آئے گا۔(جلی عنوان)

کراچی ۱۰ مئی (اسٹاف رپورٹر) ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ میں کہا گیا ہے کہ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ کا ہلال ۱۶ مئی کو نظر آئے گا، تاہم ۱۵ مئی ۶۱ء کو بھی اس کے نظر آنے کا کچھ امکان ہے، جبکہ ڈھاکہ (۶ بجکر ۵۸ منٹ مشرقی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) کراچی (۷ بجکر ۲۸ منٹ، مغربی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) اور راولپنڈی (بجکر منٹ مغربی پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم) میں مغرب کے وقت یہ علی الترتیب ۱۲ منٹ، ۱۵

105۔ ان پیشنگوئیوں کی صحت وعدم صحت کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، دنیا جہان کو اس کی خبر ہے، ساری دنیا کا عالمی ریکارڈ آپ کو بتادے گا کہ ہر جگہ کے محکمۂ موسمیات کی پیشنگوئیوں کا اوسط فی صد کیا رہتا ہے۔ آپ خود بھی زحمت فرمائیں تو ہر سال محکمۂ موسمیات کی پیشنگوئیوں کا جائزہ لیکر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی صحت کا اوسط فیصد کیا رہتا ہے۔

منٹ اور ۱۰ امنٹ افق سے اوپر رہے گا۔

۱۵ مئی کو یہ ہلال اس صورت میں نظر آسکتا ہے جب مغرب کے وقت افق کے قریب سورج غروب ہونے کے مقام سے بائیں جانب تقریباً ۵ ڈگری پر دیکھنے کے حالات بہت اچھے ہوں۔'' (روزنامہ جنگ، کراچی مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۶۱ء، ص ۶، کالم:۱)

ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں اگر علم و فن کی روشنی میں رؤیت ہلال کے بارے میں بآسانی کوئی فیصلہ حتمی صورت میں کیا جاسکتا ہے تو ہمارا ''محکمۂ موسمیات'' ہلال ذی الحجہ کے متعلق یہ مذبذب بات کیوں کرتا اور ہلال عید کی پیشین گوئی کرتے وقت ''قوی امکانات'' کے الفاظ کیوں استعمال کرتا جو سرے سے جزم و یقین کے منافی ہیں۔ معلوم ہوا بات وہی ہے جو بیرونی کہتا ہے کہ ''جو شخص منصف مزاج ہو اور غور و تامل سے کام لے وہ کبھی رویتِ ہلال کے بارے میں قطعی اور حتمی حکم نہیں لگائے گا۔'' چنانچہ ہلال عید کے بارے میں رؤیت کے ''قوی امکانات'' کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ روزنامہ ''انجام'' کراچی کا اسٹاف رپورٹر ۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء کے کوائف بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

''محکمۂ موسمیات نے آج بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کل شام عید کا چاند نظر آگیا تھا اس لئے آج عید تھی۔ محکمہ کے بیان کے مطابق عید کا چاند دیکھنے کے لئے شہر کے مختلف علاقوں میں رصد گاہیں قائم کی گئی تھیں، ہائوسنگ سوسائٹی کی رصد گاہ سے اطلاع ملی تھی کہ وہاں دوربینوں سے چاند نظر آگیا ہے۔''

(روزنامہ ''انجام'' کراچی عید ایڈیشن، ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء، ص ۷ کالم ۲)

یہ ہے ''قوی امکانات'' کے بارے میں خود ''محکمۂ موسمیات'' کی شہادت ہے کہ شہر کے مختلف علاقوں کی رصد گاہوں میں سے صرف ایک ہائوسنگ سوسائٹی کی رصد گاہ سے چاند نظر آیا اور وہ بھی دوربین کی مدد سے حالانکہ حکم شرعی سے قطع نظر

خود علم ہیئت میں بھی آغاز ماہِ قمری کے لئے رؤیت ہلال میں طبیعی رؤیت کا اعتبار ہے نہ رؤیت ارادی کا، یعنی اس رؤیت کا اعتبار ہے جو قدرتی طور پر عام آنکھوں سے محسوس ہو نہ کہ اس رؤیت کا جو غیر طبعی طور پر آلات رصدیہ کی مدد سے حاصل ہو، چنانچہ "زیچ بہادر خانی" کے "باب ہفتم در رؤیت ہلال" میں مرقوم ہے:

"مراد از رویت رویت طبیعی است نہ ارادی کہ بتوسط منظارہ ہائی جیدہ بہ بیند چہ دریں حالت ہلال قبل ازانکہ بحد رویت رسیدہ باشد دیدہ می شود۔" (ص ۵۵۶ طبع بنارس ۱۸۵۸ء)

ترجمہ: رویتِ ہلال سیء مراد طبعی رویت ہے نہ کہ رویت ارادی کہ اعلیٰ قسم کی دوربینوں کے ذریعے ہلال کو دیکھا جائے کیونکہ اس حالت میں تو ہلال کو اس کے حد رویت پر پہنچنے سے قبل بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے محکمۂ موسمیات کو اس مرتبہ نہ جانے کیوں اس غیر طبیعی رؤیت کی صحت پر بڑا اصرار رہا، حالانکہ پیشین گوئی کے الفاظ میں جزم ویقین کا ذرا سا شائبہ تک نہ تھا۔ علماء اور عوام تو ظاہر ہے کہ "محکمۂ موسمیات" کے اس اعلان کو کس طرح صحیح تسلیم کر سکتے تھے جبکہ مطلع صاف ہونے کے باوجود رؤیتِ عامہ نہیں ہوئی اور جم غفیر کو چاند نظر نہیں آیا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ خود ارباب فن نے بھی "محکمۂ موسمیات" کے بیان کو صحیح باور نہیں کیا چنانچہ روزنامہ "انجام" کراچی کی حسب ذیل خبر ملاحظہ ہو:

"عید کے چاند کے متعلق محکمۂ موسمیات کو پنجاب یونیورسٹی کی رصد گاہ کا چیلنج۔ (جلی عنوان)

لاہور ۲۰ مارچ (اے۔ پ، پ) پنجاب یونیورسٹی کی رصد گاہ نے آج "محکمۂ موسمیات" کے ڈائریکٹر کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا ہے کہ چاند اگر اعشاریہ ۷ یا اعشاریہ ۸ دن کا ہو تو مطلع کی عام حالت میں اسے آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک انٹرویو میں رصد گاہ کے حکام نے بتایا ہے کہ

جمعہ کی شام کو محض آنکھ سے چاند دیکھنا بہت مشکل تھا، کہا جاتا ہے کہ جمعہ کی شام کو کراچی میں ۱۸ منٹ تک چاند دیکھا گیا لیکن یہ بیان بھی بالکل غلط ہے اس لئے کہ نیا چاند کبھی بھی اتنی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، نہ ہی اتنا روشن ہو سکتا ہے کہ اسے انسانی آنکھ دیکھ سکے۔"

(روزنامہ انجام کراچی مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء ص:۱، کالم ۵)

یہ ہے اہل ہیئت واصحاب نجوم کی اس درماندگی اور بیچارگی کی روئیداد جو اُنہیں قمر کی صرف ایک حالت یعنی رؤیت ہلال کے انضباط میں پیش آتی ہے[106] اور ظاہر ہے

106۔ یہ واضح رہے کہ ہماری بحث اس سلسلے میں جو کچھ ہے وہ خالص فنی نقطۂ نگاہ سے ہے، یعنی اب تک علم ہیئت وریاضی میں اتنی ترقی نہ ہو سکی کہ رؤیت ہلال کی کوئی صحیح تقویم بن سکے، اس لئے کسی خود ساختہ فرضی اصطلاحی تقویم کی بناپر مؤرخین اسلام کے بیان کردہ دنوں کی صحت سے انکار کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔ رہا شرعی حیثیت سے آغاز ماہ وسال کا مسئلہ تو یاد رہے کہ شریعتِ مطہرہ نے ثبوت ہلال کا دارومدار یا رؤیت پر رکھا ہے یا شہادت پر مگر منجمین وموقتین کے حساب وکتاب کا سرے سے اس سلسلے میں اعتبار نہیں کیا ہے۔ علمی اصطلاح میں ہم اس کو الغاء کہیں گے نہ کہ ابطال، الغاء اور ابطال میں بڑا فرق ہے۔ "الغاء" کہتے ہیں کسی چیز کے کالعدم قرار دینے کو اور "ابطال" کے معنی ہیں اس کی تکذیب کرنے اور اس کو غلط بتانے کے۔ اب خوب سمجھ لیجئے کہ شرع نے ہلال کے بارے میں اہل ہیئت کے فیصلہ کا "الغاء" کیا ہے۔
یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے اس لئے ان کے کسی اعلان سے شرعاً مہینے کے ثبوت یا عدم ثبوت پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو گا لیکن ان کے حساب وکتاب کا ابطال نہیں کیا ہے یعنی نہ اس کی تکذیب کی ہے اور نہ اس کو غلط بتایا ہے اس لئے بالفرض علم ہیئت اتنی ترقی کر لے کہ رؤیت ہلال کی صحیح تقویم بن جائے اور جو پیشین گوئی بھی اس بارے میں کی جائے وہ حرف بحرف صحیح نکلے تو اس سے حکم شرعی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ شریعت کا موضوع ریاضی یا ہیئت کے کسی نظریہ کی تصدیق یا تکذیب نہیں اہل علم جانتے ہیں کہ متعدد امور کا شریعت نے الغاء کیا ہے لیکن ان کا ابطال نہیں کیا مثلاً اندھیری رات میں جبکہ سمت قبلہ مشتبہ ہو ایک شخص بغیر تحری کئے اور اپنی اٹکل کو کام میں=

=لائے، جانب قبلہ نماز ادا کرتا ہے تو شرعاً اس کی یہ نماز (اگرچہ واقع میں وہ جانب قبلہ ہی ادا کی گئی ہے لیکن) کالعدم ہے کیونکہ شریعت نے تو ایسے موقعہ پر اسے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیکر پہلے قبلہ کا رُخ متعین کر لے اور جس طرف اس کا دل گواہی دے کہ ادھر قبلہ ہے اسی سمت نماز ادا کرے اور اس صورت میں اگر سمت قبلہ کی تعیین میں اس سے خطا بھی ہو تب بھی اس کی نماز صحیح ہے لیکن بغیر سوچے سمجھے اگر قبلہ کی بالکل صحیح سمت بھی اس نے نماز ادا کی تو وہ ناقابل اعتبار ہے۔ اسی طرح سب جانتے ہیں کہ خود خلیفہ یا قاضی اگر کسی شخص کو اپنے سامنے زنا یا چوری یا کسی اور حد کا ارتکاب کرتے دیکھے تو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر (جب تک کہ اس شخص کے خلاف ثبوت جرم کی پوری شہادت فراہم نہ ہو) اس پر حد جاری نہیں کر سکتا لیکن صرف شہادت کے پیش ہونے کی صورت میں (گو امیر یا قاضی کو ارتکاب جرم کا سرے سے کچھ علم نہ ہو) حد کا جاری کرنا اس پر فرض ہے، حالانکہ اکثر حالات میں مشاہدہ سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے اور شہادت سے علم ظنی، ان دونوں مسئلوں سے آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ "الغاء" و "ابطال" میں کتنا فرق ہے پہلی صورت میں شریعت نے قبلہ کی صحیح سمت میں جو نماز بغیر تحری ادا کی جائے اس کا "الغاء" کیا ہے یعنی اس کو کالعدم قرار دیا ہے مگر اس کے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کا "ابطال" نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ اس نے جانب قبلہ نماز ادا نہیں کی، اسی طرح دوسری صورت میں قاضی یا امیر کے مشاہدہ کا ابطال نہیں کیا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا غلط دیکھا بلکہ اس کا "الغاء" کیا ہے کہ یہ مشاہدہ اجراء حدود کے بارے میں کالعدم ہے۔

ہماری اس تقریر سے وہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو مصر کے مشہور صحافی سید رشید رضا کو رؤیت ہلال کے مسئلہ میں پیش آیا ہے، ان کے شبہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک یہ کہ شہادت سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہے اور حساب سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے، لہٰذا مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں جب شہادت پر اعتبار کر لیا جاتا ہے تو پھر تقویم پر کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ جبکہ تقویم کی بنیاد علم ریاضی پر ہے، اس میں اولاً تو یہی غلط ہے کہ ریاضی کے اصول پر ہلال کی کوئی صحیح تقویم بن سکتی ہے اور بالفرض بن بھی جائے تو اس کی بنا پر حکم شرعی میں ترمیم کی کیا ضرورت ہے جبکہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات نے سرے سے موقتین کے حساب و کتاب کو کالعدم قرار دیدیا ہے۔ ہم نے یہاں وہ مثال بھی پیش کر دی ہے جہاں شرع میں علم ظنی کا اعتبار ہے اور=

کہ جب رؤیت ہلال کا صحیح انضباط ان کے بس میں نہیں تو پھر وہ اپنی تقویم کا حساب رؤیت ہلال پر کس طرح رکھ سکتے تھے ناچار اُن کو حقیقی قمری ماہ و سال کے بجائے تقویم کا حساب اپنے فرض کردہ اصطلاحی قمری ماہ و سال سے کرنا پڑا جس کی بنا پر ان کی تقویم کے حساب میں اور ماہِ ہلالی حقیقی کے حساب میں ایک دو دن کا فرق ہو جانا روزمرہ کی بات ہے، چنانچہ عصر حاضر کے مشہور مراکشی موقت سید محمد عبداللہ اپنی مشہور کتاب ''مجموعۃ الیواقیت العصریہ'' میں لکھتے ہیں:

ثم اعلم أيضاً قد يوافق أول الشهر بالحساب أوله بالهلال وقد يتقدم الحساب عن الهلال وقد تتوالى أربعة أشهر ثلاثون ثلاثون يوماً، وثلاثة أشهر تسعة وعشرون يوماً بالهلال ولا يتوالى أكثر من ذلك. وأما بالحساب فدائماً شهر ثلاثون وشهر تسعة وعشرون لا تتغير.

(ص 194 طبع مصر 1349ھ)

پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کبھی مہینہ کی پہلی تاریخ جو حساب کی رُو سے ہوتی ہے وہی ہلال کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے اور

=علم قطعی کو کالعدم قرار دیا ہے، غور فرمایئے اگر قاضی یا امیر مملکت کو اپنے ذاتی علم و مشاہدہ کی بنا پر اقامتِ حُدود کا حق دیدیا جاتا تو پھر اس کی کیا ذمہ داری تھی کہ کل کو قاضی صاحب یا امیر مملکت جس سے خفا ہوتے اس کو محض اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر سنگسار نہ کرادیتے، ایک بے چارہ ناکردہ گناہ لاکھ چِلاتا اور سر پیٹتا کہ میں بالکل بے قصور ہوں مگر قاضی یہی کہہ کر اس کا خاتمہ کرتے کہ کمبخت میں نے تو خود تجھے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے، اسی طرح جب شریعتِ مقدسہ نے عامۃ المسلمین کو صیام و افطار کا حق رؤیتِ ہلال کی بنا پر دیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بغیر ہلال کو دیکھے یا اس کی رؤیت کی شہادت سے گزرے، محض اپنے حساب و کتاب کی بنا پر اس حق کو ان سے چھین لے اور اپنے اعلان کے مطابق اُنہیں صیام و افطار پر مجبور کرے۔

کبھی حساب میں مہینہ ہلال سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہلال کے لحاظ سے مسلسل چار ماہ تیس تیس دن کے اور تین ماہ انیتس انیتس دن کے ہو جاتے ہیں مگر یہ تسلسل اس سے زیادہ نہیں رہتا۔ لیکن حساب کے اعتبار سے ہمیشہ ایک ماہ تیس دن کا ہوتا ہے اور دوسرا انیتس کا اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

بہر حال تقویم کا حساب اصطلاحی ماہ و سال پر مبنی ہے اور مسلمانوں کا حساب حقیقی ماہ و سال پر ہر دن اور ہر تاریخ میں ان دونوں کا مطابق ہونا کس طرح ممکن ہے لہٰذا در صورت اختلاف بجائے اس کے کہ تقویم سے مؤرخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچا جائے علم و دانش کا تقاضہ یہ ہے کہ خود مؤرخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں سے درست کیا جائے کیونکہ مؤرخین اسلام نے اپنی تصانیف میں ہر دن کی ہی تاریخ لکھی ہے جو رؤیت ہلال کے لحاظ سے اس روز ان کے یہاں تھی اور یہی تاریخ حقیقی تاریخ ہے اور اسی کا شرع میں بہ نصِ قرآنی اعتبار ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ مؤلف چونکہ بے لاگ محقق ہیں اور وہ تحقیق میں کسی ایک فریق کی جانب داری کیا کرتے ہیں اس لئے اس بارے میں انہیں تمام مسلمانوں کے علی الرغم صرف ''شیعہ اسماعیلیہ'' ہی سے اتفاق ہوا کہ مہینوں کا شمار کلیۃً حساب سے ہو گا نہ رؤیت ہلال سے۔

تاریخوں کے دن معلوم کرنے کے فارمولے پر بحث

پھر مؤلف نے یہاں ایک کمال اور کیا ہے، وہ یہ کہ بجائے اس کے کہ ہجری تاریخ سے حساب لگا کر ان ساتوں مذکورہ تاریخوں کے دن معین کرتے (جن کی تعیین ہر صورت میں اصطلاحی سال و ماہ کے لحاظ سے ہو سکتی ہے اور اس کا سال و ماہ حقیقی

اسلامی سے مطابق ہونا ضروری نہیں) کیا یہ ہے کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دل محمد کے حساب سے لیکر شمسی تاریخ سے دنوں کے معلوم کرنے کا ایک قاعدہ کلیہ درج کر دیا ہے، حالانکہ تاریخوں کے دن معلوم کرنے کے فارمولے پر بحث میں اپنی حساب دانی کا مظاہرہ ہی کرنا تھا تو اہل ریاضی نے جو قواعد تاریخ ہجری کے دن معلوم کرنے کے لئے لکھے ہیں ان میں سے کسی قاعدہ کا ذکر فرماتے۔ خیر۔

شعر فہمی عالمِ بالا معلوم شد

ارشاد ہوتا ہے:

"جیسا تفصیلاً عرض ہوا ابو مخنف ہی تنہا اس قسم کی تقریباً نوے فیصد روایتوں کا راوی ہے، اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعات خروج کے سلسلہ میں جو تاریخیں اور دن اپنی روایتوں میں تصریحاً بیان کئے ہیں اور مؤرخین نے بلا کسی استثناء کے محض روایت پرستی سے آنکھ بند کر کے نقل در نقل کیا ہے، ان کی حالت اور کیفیت یہ ہے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں تفصیلاً بیان ہو چکا کہ مکہ سے روانگی کی تاریخ اور دن جو ابو مخنف کی روایت سے بیان ہوئے ہیں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے، تاریخ صحیح ہے تو دن غلط، دن صحیح ہے تو تاریخ غلط، یہی کیفیت دوسری تاریخوں کی بھی ہے، مثالیں پیش کرنے سے پہلے زمانۂ ماضی کے سنین ہجری و عیسوی کی تاریخوں کے دن صحت کیساتھ معلوم کرنے کا فارمولا جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں آیا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اگر کسی مستند تقویم اور جنتری سے بھی مدد نہ لی جائے تو معمولی استعداد کا شخص اور طالب علم بھی حساب لگا کر تاریخ کے مطلوبہ دن صحت کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے۔ ۱۷۵۲ھ سے قبل کی تمام تاریخوں کے دن معلوم کرنے کے لئے یہ کلیہ کام میں لایا جاتا ہے، س+ل+د+و، یعنی جس سنہ کی کسی تاریخ کا

دن معلوم کرنا ہو اس سے ایک سال پہلے کے سنہ کو "س" سے ظاہر کیا گیا ہے "ل" لوند (لیپ ائیر) کے ان سالوں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے جو اس سنہ سے قبل تک آئے ہوں "د" سے مراد سال رواں کے پہلے دن سے تاریخ زیر بحث تک کے دنوں کی تعداد ہے، دنوں کو ہفتہ کے دن سے شمار کیا جاتا ہے۔ مثال: کربلا کا واقعہ ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو پیش آیا (تمام مؤرخین نے یہی تاریخ اور سال ۱۰ محرم ۶۰ھ کی مطابقت میں بیان کیا ہے اور یہی تقویم اور فارمولہ کے اعتبار سے بھی بلا شک و شبہ صحیح ہے) کلیہ میں س+ل+اور دال کی جگہ بالترتیب ۶۷۹اور ۲۸۴، ۱۲۹ادرج کر کے ان کے مجموعہ کو (۷) پر تقسیم کرنے سے خارج قسمت ۱۶۱ ۱، اور باقی ۵ آتا ہے، سنیچر سے ۵ دن آگے چہار شنبہ کا دن ہوتا ہے یہی ۱۰ ۱اکتوبر ۶۸۰ء مطابق ۱۰ محرم ۶۱ھ کا دن ہے، یعنی بدھ کا دن۔

(ملاحظہ ہونیوار تھمیٹک دل محمد ایم۔اے) روایتوں میں جمعہ کا جو دن بیان ہوا ہے وہ غلط ہے۔

واضح رہے کہ عیسوی تقویم میں گریگوری سیز دہم کی اصلاح سے قبل ہر صدی کو لوند کا سال سمجھا جاتا تھا لیکن اب جو صدی (۴۰۰) پر پوری تقسیم ہو جائے وہی لوند کا سال خیال کیا جاتا ہے۔"

("خلافت معاویہ ویزید" ص۱۸۹، ۱۹۰طبع دوم وص ۲۳۰تا۲۳۲طبع سوم)

ملاحظہ فرمایئے دعویٰ تو یہ ہے کہ:

"زمانہ ماضی کے سنین ہجری و عیسوی کی تاریخوں کے دن صحت کیساتھ معلوم کرنے کا فارمولا جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں آیا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔"

لیکن جو فارمولا پیش کیا وہ صرف سن عیسوی کے دنوں کے معلوم کرنے کا ہے اس کو سنہ ہجری کے دن معلوم کرنے سے کیا تعلق؟ حالانکہ اصل بحث سنہ ہجری کے

دنوں کی تعیین ہی کی ہے اور اگر مؤلف کو سنہ عیسوی ہی سے حساب لگانے میں آسانی تھی تو ان کو یہ چاہئے تھا کہ اس فارمولے کو پیش کرنے سے پہلے سن ہجری و عیسوی کی تطبیق کا کوئی فارمولا ذکر کرتے تاکہ جب اس فارمولے کی رو سے تاریخ ہجری و عیسوی کی صحیح تطبیق ہو جاتی تو پھر مذکورہ فارمولے کے مطابق اس تاریخ عیسوی کے دن کی تعیین کی جاتی، مگر مؤلف نے اس سلسلہ میں اس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ جس کی حد نہیں۔ فرماتے ہیں:

> "کربلا کا واقعہ ۱۰/ اکتوبر ۶۸۰ء کو پیش آیا، تمام مؤرخین نے یہی تاریخ اور سال ۱۰/ محرم ۶۰ھ[107] کی مطابقت میں بیان کیا ہے اور یہی تقویم اور فارمولے کے اعتبار سے بلاشک وشبہ صحیح ہے۔"
>
> (ص ۱۹۰ طبع دوم وص ۲۳۱ طبع سوم)

حالانکہ تمام مؤرخین در کنار قدیم مؤرخین میں سے ایک شخص کا نام بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جاسکتا بلکہ مؤلف خود صرف ابو مخنف کی تصریح بھی اس مطابقت کے بارے میں پیش نہیں کر سکتے جس کو وہ ان تاریخوں اور دنوں کا اصل راوی قرار دیتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس دور کے مصنف نے کسی تقویم کو دیکھ کر ۱۰/ محرم ۶۱ھ کی مطابقت میں مذکورہ عیسوی تاریخ نقل کر دی ہو لیکن ہم پہلے بتا چکے کہ تقویم کا دارومدار فرضی اصطلاحی ماہ وسال پر ہے اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ تقویم میں جس روز سے قمری مہینہ شروع ہو رہا ہے رؤیت ہلال کے حساب سے بھی اسی روز شروع ہو۔

سنہ عیسوی میں اصلاحات کا بیان

پھر یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس سنہ عیسوی کا مؤلف نے یہ

107۔ دونوں طباعتوں میں ۶۰ھ ہی درج ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

فارمولا نقل کیا ہے اس کا وہ ماہ و سال خود حقیقی نہیں بلکہ فرضی اصطلاحی ہے اور اسی لئے اس میں بارہا تعدیلات و تصحیحات ہوتی رہی ہیں، حالانکہ حساب صحیح حقیقی میں کبھی کسی تعدیل و تصحیح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گریگوری سیز دہم کی اصلاح کا ذکر تو خود مؤلف نے بھی کیا ہے۔

سنہ عیسوی کی پہلی اصلاح اور اس کی شمسی تنظیم

موجودہ سنہ عیسوی دراصل رومی سنہ ہے جس کی اصلاح سب سے پہلے جولیس قیصر کے زمانہ میں ہوئی تھی، قیصر مذکورہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ۴۵ سال قبل ۷۰۹ رومی میں اسکندریہ سے مصر کے مشہور فلکی سوسی جینس (Sosi genes) کو اس غرض سے طلب کیا تھا کہ سال شمسی کو مرتب و منظم کردے، چنانچہ اس نے اولاً اعتدال ربیعی کا دن رصد سے معلوم کیا تو اس کے حساب سے ۲۵/مارچ کا دن نکلا، پھر فلکی مذکور نے حسب ذیل نقشہ کے مطابق قیصر کے لئے سنہ شمسی کو مرتب کردیا۔

تعداد ایام	رومی مہینوں کے نام	مہینوں کے موجودہ نام
۳۱	جانواریوس	جنوری
۲۹ اور سال کبیسہ میں ۳۰	فبرواریوس	فروری
۳۱	مارتیوس	مارچ
۳۰	اپریلیس	اپریل
۳۰	مایوس	مئی
۳۰	یونیوس	جون
۳۰	کینتلیس	جولائی
۳۰	سیلستیلس	اگست

۳۰	ستنبر	ستمبر
۳۰	اکتوبر	اکتوبر
۳۰	نومبر	نومبر
۳۱	دسمبر	دسمبر

فلکی مذکور نے ماہ فروری کے بارے میں یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ وہ سال تک مسلسل ۲۹ دن کا ہوا کرے گا اور ہر چوتھے سال ۳۰ دن کا شمار کیا جائے گا جولیس قیصر نے اس اصلاح کی یادگار میں ماہ کینتلیس (مطابق ماہ تموز) کا نام بدل کر اپنے نام کی نسبت سے اس کا نام ''جولائی'' کر دیا۔

ضمیمہ

بحث تقویم کے ضمن میں اس امر کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ سنہ عیسوی کے بیشتر مہینوں کے نام مختلف رومی دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے لئے گئے ہیں اور یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ ایک جداگانہ نظام تقویم کے حامل ہونے کے باوجود ہم لوگ اپنی روزمرہ تحریروں میں ایسے مہینوں کا عام استعمال کرتے ہیں جو افسانوی قسم کے باطل دیوتاؤں کی طرف منسوب ہیں۔ حسب تصریح جوہری[108] طنطاوی ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

مہینے کے نام	وجہ تسمیہ
جنوری	یہ یانوس سے ماخوذ ہے۔ یانوس ایک افسانوی دیوتا کا نام ہے، رومی لوگ اس کے آگے پیچھے دو چہرے بناتے تھے جن سے وہ سامنے اور پیچھے دونوں جانب دیکھتا تھا۔

108۔ الجواہر للطنطاوی ص ۹۸ مطبوعہ مصر

فروری — یہ نام فبروا نامی ایک دیوی سے ماخوذ ہے جسے اہل روم کے یہاں طہارت کی دیوی کا مقام حاصل تھا۔

مارچ — یہ مارس سے ماخوذ ہے جو رومیوں کے نزدیک جنگ کا دیوتا تھا۔

اپریل — یہ نام ابیریری کے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ رومی میں کسی چیز کے پھوٹنے یا کھلنے کے ہوتے ہیں۔ اس مہینے کا یہ نام اس مناسبت سے تجویز کیا گیا کہ اس میں پھول کھلتے ہیں۔

مئی — یہیا سے ماخوذ ہے جو افسانوی شیطان اٹلس کی بیٹیوں میں سے ایک کا نام ہے۔

جون — یہ نام یونون سے ماخوذ ہے جو دیویوں کے سردار جیوپٹر کی بیوی تھی۔

جولائی — جولیانی تقویم کے بانی جولیس قیصر کی یادگار کے طور پر اس مہینے کا نام ”جولائی“ رکھ دیا گیا۔

اگست — رومیوں کے پہلے بادشاہ اور جولیس قیصر کے جانشین اغطس کی یادگار کے طور پر اس مہینے کا نام ”اگست“ رکھ دیا گیا۔

ستمبر — اس کے معنیٰ ہیں ”ساتواں مہینہ“ جبکہ قدیم اصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔

اکتوبر — اس کے معنیٰ ہیں ”آٹھواں مہینہ“ جبکہ قدیم اصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔

نومبر — اس کے معنیٰ ہیں ”نواں مہینہ“ جبکہ قدیم اصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔

دسمبر — اس کے معنیٰ ہیں ”دسواں مہینہ“ جبکہ قدیم اصول کے مطابق مارچ کو سال کا پہلا مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔

سنہ عیسوی میں دوسری تبدیلی

بعد کو جب شاہ اگستس [109] نے اس کی گدی سنبھالی تو چونکہ یہ بڑا مغرور و خود پرست بادشاہ تھا اور جیسا کہ بیرونی کا بیان ہے سب سے پہلے "قیصر" کا لقب بھی اسی نے اختیار کیا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ بیرونی نے یہ لکھی ہے کہ "قیصر" کے معنی فرنگی زبان میں اس چیز کے آتے ہیں جس کو چاک کر کے نکالا گیا ہو، چونکہ اس کی ماں دردِ زہ میں مر گئی تھی اور اس کو شکم مادر سے چاک کر کے نکالا گیا تھا اس لئے اس کا لقب ہی "قیصر" پڑ گیا، اگستس از راہِ تکبر اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اندامِ نہانی کے راستہ باہر نہیں آیا [110]۔ بہر حال جب یہ تخت نشین ہوا تو اس کی آتشِ حسد نے جوش مارا اور اسے خیال ہوا کہ جولیس کے نام کو تو اس اصلاح کی بدولت بقائے دوام حاصل ہوا کہ ماہ "جولائی" ہر سال اس کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے، آخر میں اس سلسلہ میں اپنی یادگار کیوں نہ چھوڑوں؟

اس خیال سے اس نے بھی ماہ "سکستیلس" کو جو جولائی کے بعد آتا ہے اپنے نام پر "اگست" سے موسوم کر دیا اور چونکہ یہ مہینہ ماہ "آب" کے مطابق تھا جس کے تیس دن ہوتے ہیں اس لئے اس کے تکبر نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جو مہینہ اس کے پیش رو کے نام سے منسوب ہے وہ تو اکتیس دن کا ہو اور جو مہینہ خود اس کے نام پر موسوم ہو وہ تیس دن کا اس لئے اس نے اس سنہ میں بمقتضائے "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" یہ اصلاح کی کہ ماہ اگست کو بھی بجائے تیس کے اکتیس ہی کا قرار دیدیا اور ماہ فروری کے بارے میں جو

109۔ الجواہر للطنطاوی ج ۵ ص ۹۸ مطبوعہ مصر۔

110۔ "اگست" کے معنی حسن و فقی بک نے مقدس کے لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو "الآثار الباقیہ" ص ۲۹۔

تین سال تک انیتس کا اور ہر چوتھے سال تیس دن کا شمار کیا جاتا تھا، قاعدہ وضع کیا کہ آئندہ سے یہ ایک دن کم کر کے تین سال تک اٹھائیس دن کا اور ہر چوتھے سال انیتس دن کا شمار ہوا کرے گا۔ جولائی اور اگست کے پیہم ۳۱، ۳۱ دن کے ہونے کی اصلی حکمت یہ ہے یہ تقویم "تقویم جولیس" سے موسوم ہے۔

سنہ عیسوی میں تیسری اصلاح

پھر ۱۰۷۹ء رومی یعنی ۳۷۰ جولیسی مطابق ۳۲۵ عیسوی میلادی میں شہر ازنیق میں جو اناطولیہ کے مضافات میں واقع ہے، پوپ پادریوں کی ایک روحانی مجلس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ عیسائیوں کی عیدوں اور ان کے مقدس دنوں کی تعیین کی جائے، چنانچہ اس مجلس نے تاریخ عیسوی کا مبدأ حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت کو قرار دیا۔ ارکان مجلس کی رائے میں حضرت عیسی علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت ۲۶/ دسمبر کو ہوئی تھی، اس لئے یکم جنوری سے سنہ عیسوی میلادی کا آغاز قرار دیا گیا۔ اس مجلس نے "تقویم جولیس" کو جوں کا توں برقرار رکھا بجز اس کے "اعتدال ربیعی" کا دن بجائے ۲۵/ مارچ کے اب سے ۲۱/ مارچ مقرر کر دیا گیا کیونکہ سوسی جینس فلکی نے جب جولیس قیصر کے زمانہ میں رصد سے "اعتدال ربیعی" کا وقت معلوم کیا تھا تو وہ ۲۵/ مارچ کے مطابق تھا لیکن اب ۳۷۰ برس گذر جانے کے بعد جب ازنیقی مجلس نے رصد سے اس کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اب تک چار دن کا فرق پڑ چکا ہے اور اب "اعتدال ربیعی" کا دن بجائے ۲۵/ مارچ کے ۲۱/ مارچ ہو گیا ہے کیونکہ آفتاب اول برجِ حمل میں اسی تاریخ کو داخل ہوتا ہے۔

بہر حال ان پادریوں نے یہ اصلاح کر کے اپنی عیدوں، تہواروں اور مقدس دنوں کا تعین اسی اصلاح یافتہ سنہ کے اعتبار سے کر لیا لیکن سارے ارکانِ مجلس میں سے کسی کو اتنا خیال نہیں آیا کہ "اعتدال ربیعی" میں یہ چار دن کا فرق ۳۷۰ سال کے

عرصہ میں کیسے پڑ گیا اور آئندہ اس کی کیا صورت ہو کہ پھر یہ فرق نہ پڑنے پائے، مگر انہوں نے اتنی ہی اصلاح ضروری سمجھی اور مدت تک مذہبی دنوں کے تعین کے سلسلہ میں اسی طریقہ کار پر عمل درآمد ہوتا رہا۔

سنہ عیسوی کا استعمال کب سے شروع ہوا؟

پھر ۵۲۸ء تاریخ میلادی کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ تمام مسیحی اقوام میں سنہ عیسوی کا عام رواج ہو گیا جو بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے ''تقویم جولیس'' کے مطابق سولہویں صدی کے اخیر تک رائج رہا۔ [۱۱۱]

سنہ عیسوی میں چوتھی اصلاح

پھر سولہویں صدی عیسوی کے اخیر میں پوپ گریگوری سیزدہم نے اس حساب میں یہ اصلاح کی کہ ''تقویم جولیس'' میں سے دس دن اور گھٹا دیئے، چنانچہ اس نے

111۔ فارسی زبان کے کسی شاعر نے انگریزی مہینوں اور سال کبیسہ (لوند کے سال) کے معلوم کرنے کے قاعدہ کو اس طرح نظم کر دیا ہے:

جنوری و فروری و مارچ و اپریل و مئی	جون، جولائی، اگست و نیز سپتمبر بدان
ہست اکتوبر نومبر ہم دسمبر آخرین	از شہور سال انگریزی بسان رومیان
پس بود اپریل و جون و نیز سپتمبر دگر	شد نومبر ایں ہمہ سی روزہ باشد درمیان
فروری دو کم بود لیکن بسال چار میں	یک برین افزا کبیسہ بست ونہ گردد عیان
ہفت باقی سی و یک روز است گر قسمت کنی	سالہائے عیسوی بر چار تا اے مہربان
بر نیاید کسر گر سال کبیسہ شد ہمیں	ور بر آید پس بہ ترک کسر کن تقسیم آن
گر یکے ماند ز سال بے کبیسہ اول آں	در دو دوم درسہ سوم سال باشد بیگمان

یوم پنجشنبہ ۴/اکتوبر ۱۵۸۲ء کے بعد والے جمعہ کی تاریخ ۵/اکتوبر قرار دی اور یہ قاعدہ بنایا کہ ۱۷۰۰ء، ۱۸۰۰ءاور ۱۹۰۰ء میں کبیسہ کا دن ضم نہ کیا جائے اور آئندہ سے ہر تین سال ۳۶۵دن کے معمولی سال شمار کئے جائیں اور ہر چوتھا سال ۳۶۶دن کا سال کبیسہ مانا جائے۔

اس اصلاح کا سبب یہ تھا کہ شمس کی حرکتِ دوری حقیقت میں وہ نہ تھی جو جولیس کی تقویم میں مقرر کی گئی تھی یعنی دور شمسی کی مدت (۲۵۰۵ر ۳۶۵دن) نہ تھی بلکہ (۲۴۲۲۱۶ر ۳۶۵دن) تھی اور اسی غلطی کا یہ نتیجہ تھا کہ جس طرح سابق میں "تقویم جولیس" کے حساب سے "اعتدال ربیعی" کا دن ۲۵/مارچ کے بجائے ۲۱/ مارچ ہو گیا تھا اب بجائے ۲۱/ مارچ کے ۱۱/ مارچ ہو گیا تھا، چنانچہ جب یہ نکتہ پوپ صاحب پر کھلا اور مجبوراً ان کو اس حساب میں سے دس دن کم کر کے اپنے ایام مذہبی کی تعیین کرنی پڑی۔ جب سے آج تک پوپ صاحب کی اسی اصلاح کے مطابق عملدرآمد چلا آرہا ہے، آگے اللہ جانے اور کیا اصلاح کرنی پڑے۔

تقویم گریگوری اور مسیحی اقوام

پوپ گریگوری کی مذکورہ تصحیحات کو سب سے پہلے فرانس میں سند قبول عطا کی گئی، چنانچہ وہاں کے شاہ ہنری سوم کے حکم سے یکشنبہ ۹/دسمبر کے بعد جو دوشنبہ آیا اس روز بجائے دسمبر کی ۱۰/ تاریخ کے ۲۰/ تاریخ قرار دی گئی، اور اس وقت سے لیکر ۲۲/ ستمبر ۱۷۹۲ء تک فرانس میں اسی تاریخ پر عمل ہوتا رہا، پھر ۲۲/ ستمبر ۱۷۹۲ء سے حکومتِ فرانس نے اپنے سنہ میں یہ تبدیلی کر دی کہ آغاز سال شمس کے نقطۂ "اعتدال خریفی" پر آجانے سے قرار دیا اور سال کے سب مہینے تیس تیس دن کے کر دیئے پھر اختتام سال پر معمولی سالوں میں ۵دن اور سال کبیسہ میں چھ دن کا اضافہ مقرر کیا تا کہ سالِ شمس کی

تکمیل ہوسکے، ۱۸۰۵ء کے اختتام تک حکومتِ فرانس اسی حساب پر عامل رہی پھر ۱/ جنوری ۱۸۰۶ء سے گریگوری کی تقویم پر حسبِ سابق عمل شروع ہوگیا۔

لیکن حکومت انگلستان ۱۷۵۱ء تک "تقویم جولیس" پر ہی عمل کرتی رہی بعد کو جارج دوم کے زمانے میں اس کے عہدِ حکومت کے چوبیسویں سال حسب قرارداد پارلیمنٹ اس تقویم کو ترک کر کے گریگوری کی تقویم کو قبول کیا گیا، چنانچہ ۲/ ستمبر ۱۷۵۲ء یوم چہار شنبہ کے بعد یوم پنجشنبہ کو بجائے ۳/ ستمبر کے ۱۴/ ستمبر تاریخ قرار دی گئی، اس سے پہلے چار سو سال انگریزوں کا مالی سال ۲۵/مارچ سے شروع ہوتا تھا۔ اب ۱۷۵۳ء سے سال کا پہلا دن یکم جنوری کو قرار دیا گیا۔[112]

روس میں سال کا آغاز ستمبر کی پہلی تاریخ سے ہوتا تھا۔ ۱۶۹۹ء میں قیصر روس بطرس کبیر نے یہ حکم دیا کہ روس میں بھی یورپ کی طرح سال کا آغاز یکم جنوری سے قرار دیا جائے۔ قیصر روس بطرس مذکور نے آغاز سال کا دن تو بدلوا دیا لیکن اس سے اتنا نہ ہوسکا کہ "تقویم جولیس" کو ہٹا کر گریگوری کی تقویم کو نافذ کر دیتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک روس اور یونان کا عملدرآمد اسی غلط تقویم پر ہوتا رہا تاآنکہ روس میں انقلاب آیا، زار کی حکومت کا تختہ الٹا اور کمیونزم کا راج ہوگیا۔

بعد ازاں یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو روس اور یوگوسلاویہ کے چرچ نے سنہ عیسوی کے شمار کے لئے جولیس کے حساب کو بدل کر گریگوری کے حساب کو اختیار کر لیا۔

غرض گریگوری سیز دہم نے اوائل مارچ ۱۵۸۱ء میں سنہ عیسوی کی اصلاح کا حکم دیا۔ چنانچہ مجلس از نیقی کے وقت انعقاد سے لیکر اب تک یعنی ۳۲۵ء سے لیکر ۱۵۸۲ء تک تقریباً دس دن کا فرق جو ۱۲۵۷ سال میں ہوگیا تھا اس کو درست کرنے کی غرض

112۔ اس ساری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تقویم المنہاج القویم" از حسن وفقی بک ص ۱۱۰/ طبع مطبع سلفیہ قاہرہ ۱۳۴۵ھ

سے جمعہ ۱۵۸۲ء کو اکتوبر کی ۵/تاریخ کے بجائے ۱۵/تاریخ شمار کی گئی اور اس روز سے کیتھولک فرقہ نے جس کی حکومتیں فرانس، اٹلی، اسپین اور پرتگال میں قائم تھیں اسی تاریخ پر عمل شروع کردیا، لیکن پروٹسٹنٹ نے اس اصلاح کو ۱۷۰۰ء سے پہلے قبول نہ کیا اور انگریزوں نے تو اس کو ۱۷۵۲ء میں اپنے یہاں نافذ کیا ہے۔ سب سے اخیر میں اس اصلاح کو آرتھوڈکس فرقہ نے قبول کیا جس کے پیرو روس اور یوگوسلاویہ اور دیگر ریاستہائے بلقان میں ہیں اور اب تو سارے یورپ میں یہی تاریخ مروج ہے۔[۱۱۳]

مگر ہمارے بے لاگ محقق کا یہ حال ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے تمام پیش رو کیتھولک، پروٹسٹنٹ، آرتھوڈکس آزاد اور بے لاگ محققین و مستشرقین نے جولیس کے غلط حساب کو چھوڑ دیا مگر یہ اس کو صرف اس لئے کہ ایک جرمن مستشرق ایڈورڈ ماہلے کی تقویم اسی جولیس کے غلط حساب پر مبنی ہے اس کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور دل محمد کے حساب سے اس کی تائید و تصدیق کے لئے وہ فارمولا پیش کر رہے ہیں جو غیر سیاسی غلط حساب پر مبنی ہے، چنانچہ اس قاعدہ کلیہ میں ہر صدی کو اسی غلط حساب کے مطابق لوند کا سال مانا گیا ہے اور اسی لئے مؤلف نے چھ سو نا سی سال میں ایک سو نہتر لوند کے سال مانے ہیں اور چونکہ جولیس کی غلط تقویم میں یکم جنوری کو شنبہ تھا مؤلف نے بھی اپنا حساب شنبہ ہی سے شروع کیا ہے، ورنہ گریگوری کے حساب میں سال عیسوی کا آغاز دوشنبے سے ہوتا ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہی دو دن کا فرق جو جولیس کی غلط تقویم اور گریگوری کی تقویم

113۔ یہ واضح رہے کہ انگریزوں کو تو اپنے سنہ مروجہ کی غلطی ۱۷۵۲ء میں معلوم ہوئی مگر ہندوستان کے مسلمانوں نے اس غلطی کی نشاندہی ان کی اصلاح سے ۳۳ سال پہلے ۱۷۱۹ء ہی میں کر دی تھی۔ ملاحظہ ہو ''زیچ بہادر خانی'' باب ہفتم در معرفتِ تاریخ عیسوی۔ از مولوی غلام حسین جونپوری۔ طبع بنارس ۱۸۵۸ء۔

میں ہے مؤلف واقعہ کربلا میں ثابت کر رہے ہیں، اب اس کورانہ تقلید کا کہاں تک ماتم کیا جائے، افسوس ہے کہ مؤلف کو اپنے پیش روؤں کی روش کا بھی اس باب میں پتہ نہیں، ما ہلے نام دیکھا اور مرمٹے، حالانکہ اس غلط حساب کے اعتبار سے ''اعتدال ربیعی'' میں سال ہجرت تک دو دن اور تقریباً ثلث دن کا فرق پڑ چکا تھا اور ۶۱ء میں تو یہ فرق اس سے بھی زیادہ ہو کر تین دن کے قریب جا پہنچا تھا پھر جو تقویم اپنی جگہ پر خود دو تین دن حساب صحیح سے آگے بڑھ چکی ہو اسکو سامنے رکھ کر صرف دو دن کی بنا پر واقعہ کربلا جیسے مہتم بالشان واقعہ کی صحت کو چیلنج کرنا کتنی بڑی نادانی ہے۔

یہ ہے اس سنہ عیسوی کا تاریخی جائزہ جس پر ساری ہی مسیحی دنیا کا دارومدار ہے۔ مقام عبرت ہے کہ اتنی بڑی قوم برسوں نہیں صدیوں تک اپنے مقدس دنوں، عیدوں، تہواروں اور روزوں کے ایام کو گم کئے رہی اور خود اپنے اقرار کے مطابق ۱۵۸۲ء تک صحیح دنوں کی تعیین نہ کر سکی بلکہ اپنی تمام عبادات مذہبی کو اسی غلط حساب کے مطابق ادا کرتی چلی آئی، یہیں سے اس امر کا اندازہ بھی لگا لیجئے کہ جس قوم نے اپنے مقدس دنوں کو گم کر دیا وہ اپنے انبیاء کی مقدس تعلیم کو کس طرح محفوظ رکھتی؟ تمام عیسائی دنیا کا اپنے اصلی دنوں کو گم کر دینا اسی ضلال واِضلال کا ایک نمونہ ہے جس کے متعلق قرآن عظیم میں یوں ارشاد ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ.

اے اہل کتاب! اپنے دین کی بات میں ناحق کا مبالغہ مت کرو اور ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو جو پہلے گمراہ ہو چکے اور بہتوں کو گمراہ کر گئے اور سیدھی راہ سے بہک گئے۔

ظاہر ہے کہ جس طرح تثلیث کا عقیدہ عیسائیوں نے غیر قوموں سے لیا ہے اسی طرح اس سنہ کا استعمال بھی انہوں نے دوسروں سے ہی سیکھا ہے۔ جولیس سیزر ایک

کافر بت پرست تھا جس کی تقویم کو مجلس از نیقی نے بجنسہ بحال رکھا صرف اعتدال ربیعی کے دن کو بجائے ۲۵ کے ۲۱ مارچ کر دیا اور اس تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں تک عیسائی دنیا اپنے اصلی ایام مقدسہ کو نہ پا سکی۔

خلافت علی رضی اللہ عنہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے باب میں عباسی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ:

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد جب سبائی لیڈر مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کرنی چاہی۔ آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے منع کیا اور متنبہ کیا کہ اگر ان سبائی بلوائیوں سے آپ کا تعلق رہا تو خون عثمان کا الزام آپ پر لگ جائے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا تھا واللہ! اگر آپ آج ان لوگوں کے ساتھ بیعت خلافت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو کل لوگ خون عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام آپ پر لگا دیں گے۔ مگر افسوس حضرت موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا اور بیعت لے لی۔ یہ بیعت چونکہ باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ جیسے محبوب خلیفۂ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی، نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا تھا اور نہ قصاص کے لئے اڑ جانے کا کوئی امکان باقی رہا تھا، کیونکہ یہی باغی اور قاتل اور اس گروہ کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا مبایعین کے گروہ میں نہ صرف شامل بلکہ سیاست وقت پر اثر انداز رہے، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کرنے سے گریز کیا، اس لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی۔"

(ص ۲، ۱ص ۵۲ چوتھا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ)

مؤلف کی عبارت صاف اور واضح ہے۔ ناظرین خط کشیدہ عبارت پر دوبارہ غور فرمائیں۔ مؤلف کے نزدیک:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبائی بلوائیوں سے تعلق تھا اور یہ تعلق اس درجہ گہرا اور مضبوط تھا کہ آپ نے سبائی لیڈر مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں کے مقابلہ میں اپنے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تک کا ذرا پاس ولحاظ نہ کیا اور ان کے عاقلانہ مشورہ کو قبول نہ فرمایا۔

افسوس مؤلف نے یہ نہ بتایا کہ سبائی کون لوگ تھے، ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصلی حیثیت جو مؤلف کی نظر میں ہے سب کو واضح ہو جاتی۔ سنئے حافظ ذہبی رحمہ اللہ "میزان الاعتدال" میں لکھتے ہیں:

عبدالله بن سبا من غلاة الزنادقة ضال مضل.

عبداللہ بن سبا غالی زندیقوں (بے دینوں) میں سے ہے، خود بھی گمراہ تھا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا تھا۔

سبائیہ کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ "لسان المیزان" میں فرماتے ہیں:

وله اتباع يقال لهم سبائية معتقدون الهية علي بن أبي طالب.

(عبداللہ بن سبا) کے پیرو بھی ہیں جن کو "سبائیہ" کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خدا ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

ذرا غور فرمایئے! ایسی جماعت جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتی ہے اس کا لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کرنا چاہتا ہے، آپ کے عمزاد بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس سے منع کرتے ہیں مگر

آپ ان کے عاقلانہ مشورہ کو اس باب میں قبول نہیں کرتے، سبائی گروہ کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا نہ صرف یہ کہ مبایعین میں شامل بلکہ سیاست وقت پر اثر انداز ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بیعت باغیوں اور قاتلوں کی تائید و اصرار سے ہوتی ہے اور یہ خلافت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ جیسے محبوب خلیفۂ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی خلافت سے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو گریز کرنا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ بقول مؤلف ایسا ہی ہوا اور بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی۔

اب ناظرین خود اپنے دل میں سوچ لیں کہ جو شخص اس طرح سر بر آرائے مسند خلافت ہو اس کی کار گزاری کیا ہونا چاہیے؟۔ عباسی صاحب سے اس کی تفصیل سنیے:

۱۔ قاتلین (عثمان رضی اللہ عنہ) سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا (ص ۲) اور یہ واضح رہے کہ ترک واجب کا ارتکاب حرام ہے۔ (ص ۲)

۲۔ (الف) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نہ کوئی جہاد ہوا، (ب) نہ کوئی ملک و شہر فتح ہوا، (ج) نہ ملت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی۔ (د) آپس ہی میں تلواریں چلتی رہیں۔ (ص ۴)

۳۔ الاشتر وغیرہ تقریریں کر کے لوگوں کو اہل شام کے مقابلہ میں چلنے کی ترغیب و تحریص کر رہے تھے کہ بنی قزارہ کا ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا "کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے شامی بھائیوں کے مقابلہ میں جائیں اور انہیں قتل کریں جس طرح تم ہمیں اور برادران بصرہ کے قتل کرنے کے لئے لے گئے تھے، نہیں واللہ ہم یہ ہرگز نہیں کریں گے۔" الاشتر نے یہ سن کر اپنے لوگوں سے کہا ذرا لینا اس کی خبر وہ شخص جان بچانے بھاگا لوگ اس کے پیچھے دوڑے، لات گھونسوں سے مار ڈالا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ہوئی آپ تشریف لائے اور پوچھا کس نے مارا؟ کہا گیا ہمدان قبیلہ کے لوگوں

نے، اس پر آپ نے فرمایا" یہ جاہلیت کے تعصب کا قتیل ہے، معلوم نہیں قاتل کون ہے، اس کی دیت بیت المال مسلمین سے ادا ہو۔" (ص۹،۸)

۴۔ عباسی صاحب کے نزدیک اپنے مخالفوں پر تلوار اُٹھانے میں جیسا اعتراض حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آتا ہے ویسا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر امیر المؤمنین یزید پر نہیں آتا، فرماتے ہیں:

> "اب اگر بالفرض یہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے مؤقف سے رجوع نہیں کیا تھا، یعنی بیعت یزید پر آمادگی کا اظہار نہیں کیا تھا تب بھی دینی زاویہ نگاہ سے امیر المؤمنین (یزید) پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، بلکہ اس سے پہلے جو واقعات گزر چکے ہیں ان کی روشنی میں ایسا اعتراض بھی حکومت پر عائد نہیں ہوتا جیسا کہ مثلاً حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر، بیعت مکمل نہیں ہوئی تھی، امت کی بہت بڑی اکثریت ان کی بیعت میں داخل نہیں تھی۔ ان کے خلاف جو حضرات کھڑے ہوئے تھے وہ بڑی جمعیت رکھتے تھے، ان کے قبضے میں تین ملک تھے اور لاکھوں انسانوں کی حمایت انہیں حاصل تھی پھر ایسا خلیفہ جسے جمہور کی حمایت حاصل نہ ہو جب شرعاً اس کا مجاز ہے کہ اپنے مخالفوں کے خلاف تلوار اٹھائے تو امیر یزید جو متفق علیہ تھے جن کا پرچم تمام عالم اسلام پر لہراتا تھا، جن کی بیعت میں سیکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نیز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت محمد رحمہ اللہ (الحنفیہ) جیسی مقتدر و مقدس ہستیاں داخل تھیں وہ اس کے مجاز کیوں نہیں کہ اپنے خلاف خروج کرنے والوں کا مقابلہ کریں، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تلوار اگر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ زوجہ مطہرہ وحبیبہ رسول اللہ صلوات اللہ علیہا کے خلاف بے نیام ہو سکتی ہے اور اس پر تیر برسائے جا سکتے ہیں جس میں تمام امت کی ماں تشریف فرما ہو، اور ماں

بھی وہ جو حجت دینیہ کے تحت میدان میں آئی ہو تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف تلوار کیوں نہیں اٹھائی جا سکتی۔" (ص ۱۸۰)

ایسی خلافت کا جو حشر ہونا چاہیے تھا اس کی تفصیل بھی خود ان ہی کی زبان سے سنیئے۔ ارشاد ہے:

۱۔ سبائیوں کی من مانی حرکات دیکھ کر کہ جو چاہتے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کرا لیتے ہیں ان کے بعض عزیز قریب بھی بیزار ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برادر بزرگ حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہوں نے اس صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ ان کے بھائی کے گرد و پیش جو لوگ سبائی پارٹی کے ہیں وہ ملت کا بیڑا غرق کئے بغیر نہ رہیں گے۔" (ص ۸،۷)

"حضرت عقیل رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سگے بڑے بھائی بزرگ خاندان تھے وہ اپنے بھائیوں سے علیحدہ ہو کر ان کے مد مقابل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ولی الدم و طالب قصاص تھے چلے گئے اور صفین کے میدان میں ان کے کیمپ میں موجود رہے، انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ وفاداری اسی میں سمجھی تھی کہ ان کی سیاست پر جو لوگ مستولی ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔" (ص ؟؟؟)

۲۔ "خدائے بزرگ و برتر کو ملت اسلام کی بہتری مقصود تھی اور امت کو تباہی سے بچانا تھا کہ بالآخر مصلحین کی مساعی جمیلہ سے خون عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مسئلہ ثالثی کے سپرد ہو گیا۔" (ص ۱۲)

"مسئلہ ایسا صاف اور سادہ تھا کہ کوئی ثالث بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے خلیفۂ راشد کو ظلماً قتل کیا، نظام خلافت کی بے حرمتی کا ارتکاب کیا، سیاست ملّیہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی مستولی رہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ثالثی کے تقرر کے

ساتھ ہی اس کا بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ منصب خلافت پر قائم نہیں رہ سکتے۔" (ص ۱۴)

"ثالثوں نے اتفاق رائے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب خلافت سے معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد سے مشورہ پر منحصر کیا اور یہ قرار دیا کہ جب تک انتخاب خلیفہ کی کارروائی مکمل نہ ہو فریقین اپنے اپنے مقبوضہ علاقہ پر قائم رہیں لیکن صفین کی واپسی کے بعد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ہی پارٹی کے ایک گروہ سے قتال و جدال میں الجھ گئے تا آنکہ ان ہی میں سے ایک بدبخت خارجی عبد الرحمن ملجم نے حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کو زہر آلود خنجر سے مجروح کر دیا، زخم ایسا کاری لگا کہ تین روز بعد وفات پا گئے، خوارج سے ان کے جھگڑے نہ ہوتے اور نہ یہ سانحہ پیش آتا تو امت کے مشورے سے نئے خلیفہ کا انتخاب ہوتا اور تاریخی واقعات کا رخ دوسرا ہو جاتا۔" (ص ۱۳، ۱۲)

ایسی خلافت جس کا عباسی صاحب نے یہ نقشہ کھینچا ہے اور کوئی ہوتا تو اس پر حکومت متمردہ کا فتویٰ لگاتا مگر عباسی صاحب نے کمال فراخدلی سے اس کو صرف ملک عضوض قرار دینے پر اکتفا کی ہے، فرماتے ہیں:

"حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا زمانہ اخوت، مساوات اور یک جہتی کا مثالی زمانہ تھا، بالفاظ دیگر خلافت خاصہ علی منہاج النبوۃ کا زمانہ ...... اس زمانہ کی برکات خلیفہ سوئم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی عہد خلافت تک باقی رہیں، اس خلافت کے اواخر میں سبائی منافقین کی سازش سے جو فتنہ اٹھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ سوئم مظلومانہ شہید کر دیے گئے، سبائی سازشوں کا مقصد پورا ہو گیا کہ جماعت مسلمین میں یوں پہلی مرتبہ تفرقہ پڑ گیا، اگرچہ متعدد صحابہ متحارب فریقین میں مصالحت کے ساعی رہے تاہم جیسا ابتدائی

اوراق میں مختصراً بیان ہوا باہم خانہ جنگیوں سے انتظام خلافت صحیح طور سے قائم نہ ہو سکا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مقتل عثمان رضی اللہ عنہ سے فتنہ رونما ہونے کے بارے میں احادیث متواترہ بالمعنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس وقت خلافت علی منہاج نبوت منقطع ہو جائے گی اور ملک عضوض ظاہر ہوگا۔ (ص ۳۳۷)

یہ واضح رہے کہ عباسی صاحب کے نزدیک "ملک عضوض" کا مصداق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عہد خلافت ہے، ورنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ حکومت کے بارے میں تو ان کے الفاظ یہ ہیں:

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بعد صلح بیعت کر لی اتحاد المسلمین کی پھر وہی کیفیت رونما ہوئی جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مبارک زمانہ میں تھی، اس خوشی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے اس سال کا نام ہی "عام الجماعہ" رکھا، یعنی جماعت مسلمین کے اتحاد و اتفاق کا سال۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد تقریباً بیس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہے اور بے نظیر حسن تدبیر سے تمام فتنہ پرورانہ سرگرمیوں کو دور کر کے ہر خطۂ مملکت میں امن و امان بحال کیا.... چنانچہ امت کے داخلی اور خارجی تمام تعمیری کام جو پچھلے چار پانچ برس کی "طوائف الملوکی" سے رُکے پڑے تھے اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تیزی سے شروع کئے، ہر طرف خوشی اور مرفہ حالی کی لہریں دوڑ گئیں، امیر المؤمنین کا اصول حکمرانی، حلم و کرم، عدل و انصاف، جود و سخا تھا۔" (ص ۳۳۸، ۳۳۹)

عباسی صاحب کے نزدیک نہ صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بلکہ یزید کا شمار بھی خلفاء راشدین ہی میں ہے، ان کے الفاظ ہیں:

> ”جن اشخاص کو خود حضور سرور کائنات ﷺ نے پسند اور منتخب فرمایا ہو ان میں جو فرد بھی زمام خلافت ہاتھ میں لے یقیناً وہ خلیفۂ راشد ہے اور اس کی خلافت خلافتِ راشدہ ہے، پھر آپ ہی کی پیشین گوئی کے اعتبار سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند امیر یزید بارہ خلیفوں کے زمرہ میں شامل ہیں۔“(ص۳۴۹)

عباسی صاحب نے عرض مؤلف طبع دوئم میں ایک فاطمی عالم صاحب کے خلاف جنہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بادشاہ کہہ دیا تھا، بڑی لے دے کی ہے، فرماتے ہیں:

> ان صاحب کی جرات کا یہ عالم ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کو ہیچ قرار دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ امیر المومنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد ہونے کی بجائے ”ملک عضوض“ کے بانی ہیں۔“(ص۳۶)

عباسی صاحب نے اپنے خیال میں بڑی تحقیق سے کام لیا ہے، تاہم وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مسئلہ حل نہ کر سکے کیونکہ اگر بقول ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے یا نہیں؟ اگر وہ خلیفہ نہ تھے تو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی ذمہ داری شرعاً ان پر کس طرح عائد ہو سکتی ہے اور پھر خلافت سے ان کی معزولی کا کیا مطلب ہے؟ اگر وہ خلیفہ تھے تو ان کے لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہونے کے کیا معنی؟ کیا ایسا شخص بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق ہے جس کی بیعت مکمل نہ ہوئی ہو؟۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں انتخاب کے لئے کوشاں تھے؟

مؤلف نے کتاب کا آغاز حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مسئلہ خلافت سے کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ حتی المقدور جس قدر مواد بھی انہیں حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کے خلاف مل سکے اسے یکجا کر دیا جائے، تاہم بعض چیزیں پھر بھی ان سے رہ گئیں جن کو انہوں نے موقع بہ موقع اثنائے کتاب میں ٹانکنے کی کوشش کی ہے، منجملہ ان کے ایک یہ نیا انکشاف بھی ہے جو فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کرتے ہوئے ان پر منکشف ہوا، فرماتے ہیں:

> "ان کی سیاسی زندگی بے داغ تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں انتخاب خلافت کے لئے کوشاں تھے، اپنے فرزند کو ساتھ لے گئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس کی جو قرابت آپ سے ہے اس کے اعتبار سے میرے حق میں رائے دیجئے۔ (ص ۲۰۰)

عباسی صاحب نے اس واقعہ کو اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ "حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی بے داغ تھی" لیکن اس سے جہاں ایک طرف حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی بے داغ ثابت ہوتی ہے دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہوس حکمرانی اور طمع خلافت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہدہ کے حصول کے لئے اس وقت بھی کوشاں تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اب ظاہر ہے کہ جب اس وقت بھی یہ اس کوشش سے باز نہ رہ سکے تو پھر شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد تو کیا کچھ نہ کیا ہو گا؟۔ مؤلف کا منشا بھی اس واقعہ کے ذکر کرنے سے ناظرین کو یہی تاثر دینا ہے سوء

اتفاق سے مؤلف کو دو سو صفحے سیاہ کرنے کے بعد یہ شگوفہ ہاتھ آیا ورنہ اگر آغاز کتاب ہی میں یہ بات ہاتھ لگ جاتی تو نہ معلوم کیا گل کھلاتے، افسوس ہے کہ فاضل مؤلف نے اس کے ثبوت میں کوئی مستند یا غیر مستند حوالہ بھی نہیں دیا، شاید ان کے نزدیک یہ واقعہ اس قدر قطعی ہو کہ اس کے لئے انہوں نے کسی حوالہ کی ضرورت نہ سمجھی،[114] مگر ہمیں تو حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی "منہاج السنۃ" کے مطالعہ سے یہ پتہ چلا کہ دراصل یہ روافض کا ادعا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ طالب خلافت تھے اب معلوم ہوا کہ عباسی صاحب بھی اس بارے میں روافض ہی کے ہمزبان ہیں، ملاحظہ فرمایئے ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

إنه قد جعل المسلمين بعد نبيهم أربعة أصناف وهذا من أعظم الكذب فإنه لم يكن في الصحابة المعروفين أحد من هذه الأصناف الأربعة فضلاً عن أن لا يكون فيهم أحد إلا من هذه الأصناف إما طالب للأمر بغير حق كأبي بكر في زعمه وإما طالب للأمر بحق كعلي في زعمه وهذا كذب على علي رضي الله عنه وعلى أبي بكر رضي الله عنه فلا علي طلب الأمر لنفسه قبل قتل عثمان ولا أبو بكر طلب الأمر لنفسه فضلاً عن أن يكون طلبه بغير حق وجعل القسمين الآخرين إما مقلداً لأجل الدنيا وإما مقلداً لقصوره في النظر. (ج1 ص151)

اس مصنف رافضی (حسین بن مطہر علی) نے آنحضرت ﷺ کے بعد مسلمانوں کی چار قسمیں بنائی ہیں اور یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے کیونکہ جو لوگ صحابہ کی حیثیت سے معروف ہیں ان میں سے کوئی ایک

114۔ حوالہ کے ساتھ اسناد صحیح کے نقل کرنے کی بھی ضرورت ہے، کسی شیعہ یا غیر معروف راوی کی روایت اس باب میں معتبر نہیں ہے۔

بھی ان چار قسموں میں داخل نہ تھا یہ بات تو کجا کہ جو بھی تھا ان ہی چار قسموں میں داخل تھا۔ (۱) یا تو ناحق امارت کا طالب جیسے کہ اس کے زعم باطل میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ (۲) یا حق کی بنا پر طالب امارت جیسے کہ اس کے زعم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی جھوٹ ہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر بھی، کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لئے امارت کی خواہش کی اور نہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے لئے اس کا مطالبہ کیا، یہ بات الگ رہی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مطالبہ ناحق تھا اور دوسری دو تو اس رافضی نے ان لوگوں کی قرار دی ہیں کہ (۳) جو یا تو طلب دنیا کے لئے دوسروں کے پیرو بن گئے تھے (۴) یا قصور نظر کی بنا پر غیروں کے مقلد۔

غور فرمائیں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس قسم کے اظہار خیال کو "من أعظم الکذب" بتایا ہے اور صاف لکھا ہے کہ:

وهذا كذب على علي رضي الله عنه... فلا علي طلب الأمر لنفسه قبل قتل عثمان.

(یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محض جھوٹ ہے) کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ سے قبل کبھی اپنے لئے امارت کا مطالبہ نہیں کیا۔

اور مؤلف کے یہ الفاظ ہیں: "حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں انتخاب خلافت کے لئے کوشاں تھے۔" (ص ۲۰۰)

مؤلف ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے انکشاف حقیقت کے بڑے معترف ہیں، فرماتے ہیں:

"البتہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ متوفی ۷۲۸ھ نے "منہاج السنۃ" میں کہ وہ کتب تاریخ میں شامل نہیں حضرت معاویہ رضی اللہ

عنہ و یزید کی سیرۃ کے بعض امور کی بابت انکشاف حقیقت کیا ہے۔“
(عرض مؤلف)

اب معلوم نہیں مؤلف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے انکشافِ حقیقت کو صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید ہی کے بارے میں قابل قبول سمجھتے ہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی۔

اس افسانہ کو پڑھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) جیسی جلیل القدر شخصیت کو جو باتفاق اہل سنت تمام امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) میں باستثنائے حضرات ابی بکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) افضل ترین امتی ہیں اپنے زندگی بھر کے کارناموں میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس کی بناپر وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اپنے حق میں رائے طلب کرتے، لے دے کر ایک چیز جو ملی وہ اپنے بیٹے کی قرابت تھی اور وہ بھی اتنی دور رس کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی اور عباسی صاحب کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بھی ادا پسند آئی ورنہ اگر خدانخواستہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں رائے دے دیتے تو ان کی سیاسی زندگی داغدار ہو جاتی، معلوم ہوا یہ انتخاب خلافت کا مسئلہ سب سیاسی بکھیڑا ہے اس کی شرعی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے مقابلہ میں انتخاب خلافت کے لئے کوشاں ہونا تو بڑی بات ہے انہوں نے تو شہادت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بعد بھی اس کے حصول کے لئے کوئی کوشش نہ کی، ہاں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بارے میں آپ سے اصرار کیا تو مجبوراً محض دینی ضرورتوں کے تقاضے کے پیش نظر نہ کسی ذاتی لالچ یا منفعت کی بناپر آپ کو زمام خلافت سنبھالنی پڑی، چنانچہ امام طبری رحمہ اللہ نے بسند حسن خود ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

ولّوني ولولا خشية على الدين لم أجبهم. (تاريخ طبري3/ 505)

لوگوں نے مجھے خلیفہ بنادیا اور اگر دینی ذمہ داری کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کو قبول نہ کرتا۔

اس روایت کو امام طبری رحمہ اللہ نے اپنے شیخ زیاد بن ایوب رحمہ اللہ کے نوشتہ سے نقل کیا ہے جس کی سند حسب ذیل ہے:

"حدثنا مصعب بن سلام التميمي قال حدثنا محمد بن سوقة عن عاصم بن كليب الجرمي عن أبيه" ان سب حضرات کو تقریب میں یا ثقہ لکھا ہے یا صدوق اور اہل علم جانتے ہیں کہ ایسے رواۃ کی روایت حسن سے کم درجہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو "فتح الباری" (ج ۱۳، ص ۴۸) میں بلا تنقید نقل کیا ہے، کیونکہ وہ مقدمہ کتاب میں تصریح کر چکے ہیں کہ وہ حسن و صحیح کے علاوہ اور روایات بغیر تنقید نہیں لائیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت اور سبائی پارٹی

مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز "بسم اللہ" کے بعد اس جلی عنوان سے کیا ہے "اموی خلافت کا پس منظر" اس سے بعد ذیلی عنوان ہے "حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت اور سبائی پارٹی" پھر صفحہ قرطاس پر اس طرح خامہ فرسا ہوتے ہیں کہ:

"حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد جب سبائی لیڈر مالک الاشتر [۱۱۵] اور اس کے ساتھیوں نے حضرت علی

115۔ مالک اشتر نخعی مشہور شجاعان عرب میں سے ہیں، اپنے قبیلہ کے سردار تھے، ان کا شمار "مخضرمین" میں سے ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے عہد جاہلیت و اسلام دونوں کو پایا لیکن شرف

رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کرنی چاہی آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن العباس رضی اللہ عنہما نے منع کیا اور متنبہ کیا کہ اگر ان سبائی بلوائیوں سے آپ کا تعلق رہا تو خون عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام آپ پر لگ جائے گا، ابن عباس نے کہا تھا:

صحابیت سے محروم رہے۔ حافظ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات تابعین میں کیا ہے، معرکہ یرموک میں شریک تھے، بڑی بہادری سے لڑے ان کی ایک آنکھ اسی معرکہ میں اللہ کی راہ میں کام آئی، مقام ''جابیہ'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور خطبہ میں حاضر تھے جو خاص امراء لشکر کے لئے دیا گیا تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص جرنیلوں میں سے تھے، معرکہ جمل و صفین میں بڑے کارہائے نمایاں کیے اور خوب داد شجاعت حاصل کی، جو قصور اہل شام کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جناب میں تھا وہی قصور ان کا بھی تھا۔ کوفہ سے اپنے زیر اثر ایک جماعت کو لے کر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر یورش کرنے آئے تھے۔ تاہم بسند صحیح ان سے ثابت ہے کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے قتل کے روادار نہ تھے (ملاحظہ ہو ''فتح الباری'' ج ۱۳ ص ۴۸) طبع مصریہ اور ''انساب الاشراف بلاذری'' ج ۵ ص ۹۶ طبع یونیورسٹی پریس یروشلم ۱۹۳۶ء)

بس ان کا یہی قصور ہے جس کی بنا پر مؤلف نے ان کو سبائی لیڈر کا لقب عطا کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ سبائی زندیق تھے اور سبائیوں کا لیڈر عبداللہ بن سبا مشہور یہودی منافق تھا، نہ کہ مالک الاشتر، تمام کتب رجال میں ان کی توثیق مذکور ہے، ''خلاصۂ حزرمی'' میں ہے: ''وثقه العجلي''، (یعنی محدث عجلی نے ان کی توثیق کی ہے) جنگ صفین کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کو مصر پر امیر بنا کر بھیجا تھا، راستہ میں ایک دیہاتی نے ان کی دعوت کی اور شہد میں زہر ملا کر دیدیا جس سے ان کا کام تمام ہو گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

إن علياً نعاه إلى قومه وأثنى عليه ثناءً حسناً.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود ان کی قوم کو ان کے مرنے کی اطلاع دی اور ان کی بڑی تعریف کی۔

والله لئن نهضت مع هؤلاء اليوم ليحملنك الناس دم عثمان غداً. (طبري ٥/ 160 طبع مصريه)

واللہ اگر آپ آج ان لوگوں کے ساتھ بیعت خلافت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو کل لوگ خون عثمان کا الزام آپ پر لگادیں گے۔

مگر افسوس حضرت موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا اور بیعت لے لی۔" (ص۸و۲)

مؤلف نے اپنی مورخانہ ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اس کا بالکل اظہار نہیں فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عام مسلمانوں میں سے بھی کسی صحابی یا تابعی نے بیعت کی تھی، ان کو تو تاریخ کے اوراق میں حضرت ممدوح سے بیعت کے سلسلہ میں صرف سبائی لیڈر مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں کی بیعت کا ذکر مل سکا ہے اور وہ اس طرح کہ آپ کے چچیرے بھائی نے آپ کو منع کیا اور متنبہ کیا کہ اگر سبائی بلوائیوں سے آپ کا تعلق رہا تو خونِ عثمان کا الزام آپ پر لگ جائے گا، مگر آپ نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا اور بیعت لے لی، سبحان اللہ کیا تحقیق ہے۔

فلک گفت احسن ملک گفت بہ

دلیل میں طبری کا حوالہ حاضر ہے، "تاریخ طبری" کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں روایت اس تفصیل کے ساتھ درج ہے:

حدثني الحارث عن ابن سعد عن الواقدي قال حدثني ابن أبي سبرة عن عبدالمجيد بن سهيل عن عبيدالله بن عبدالله بن عتبة عن ابن عباس قال دعاني عثمان فاستعملني على الحج فخرجت إلى مكة فأقمت للناس الحج وقرأت عليهم كتاب عثمان إليهم ثم قدمت المدينة وقد بويع لعلي فأتيته في داره فوجدت المغيرة بن شعبة مستخليا به فحبسني حتى خرج من عنده فقلت ماذا قال لك هذا؟ فقال قال لي قبل مرته

هذه: أرسل إلى عبدالله بن عامر وإلى معاوية وإلى عمال عثمان بعهودهم تقرهم على أعمالهم ويبايعون لك الناس فإنهم يهدئون البلاد ويسكنون الناس فأبيت ذلك عليه يومئذ وقلت والله لو كان ساعة من نهار لاجتهدت فيها رأيي ولا وليت هؤلاء ولا مثلهم يولى، قال ثم انصرف من عندي وأنا أعرف فيه أنه يرى أني مخطئ ثم عاد إلي الآن فقال إني أشرت عليك أول مرة بالذي أشرت عليك وخالفتني فيه ثم رأيت بعد ذلك رأياً وأنا أرى أن تصنع الذي رأيت فتنزعهم وتستعين بمن تثق به فقد كفى الله وهم أهون شوكة مما كان، قال ابن عباس فقلت لعلي أما المرة الأولى فقد نصحك وأما المرة الآخرة فقد غشك قال له علي ولم نصحني قال ابن عباس لأنك تعلم أن معاوية وأصحابه أهل دنيا فمتى تثبتهم لا يبالوا بمن ولي هذا الأمر ومتى تعزلهم يقولوا أخذ هذا الأمر بغير شو ری

وهو قتل صاحبنا ويؤلبون عليك فينتقض عليك أهل الشام وأهل العراق مع أني لا آمن طلحة والزبير أن يكرا عليك فقال علي أما ما ذكرت من إقرارهم فوالله ما أشك أن ذلك خير في عاجل الدنيا لإصلاحها، وأما الذي يلزمني من الحق والمعرفة بعمال عثمان فوالله لا أولى منهم أحدا أبدا فإن أقبلوا فذلك خير لهم وإن أدبروا بذلت لهم السيف قال ابن عباس فأطعني وادخل دارك والحق بمالك بينبع وأغلق بابك عليك فإن العرب تجول جولة وتضطرب ولا تجد غيرك فإنك والله لئن نهضت مع هؤلاء اليوم ليحملنك الناس دم عثمان

غداً فأبى علي فقال لابن عباس سر إلى الشام فقد وليتكها فقال ابن عباس ما هذا برأي، معاوية رجل من بني أمية وهو ابن عم عثمان وعامله على الشام ولست آمن أن يضرب عنقي لعثمان أو أدنى ما هو صانع أن يحبسني فيتحكم علي فقال له علي ولم قال لقرابة ما بيني وبينك وإن كل ما حمل عليك حمل علي ولكن اكتب إلى معاوية فَمَنِّه وعده فأبى علي وقال والله لا كان هذا أبداً.

مجھ سے حارث نے ابن سعد کے حوالہ سے بیان کیا اس نے واقدی سے نقل کیا کہ مجھ سے ابن ابی سبرہ نے عبدالحمید بن سہیل کے واسطہ سے بیان کیا وہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے راوی ہیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت موصوف نے یوں فرمایا کہ مجھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلا کر امیر حج مقرر کیا چنانچہ میں مکہ معظمہ کو روانہ ہو گیا اور لوگوں کو حج کرایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جو مکتوب لوگوں کے نام تھا اس کو پڑھ کر انہیں سنایا پھر مدینہ منورہ کو واپس ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت لی جا چکی تھی پس میں بھی حضرت موصوف کی خدمت میں ان کے در دولت پر حاضر ہوا تو مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) کو ان کے ساتھ خلوت میں مصروف گفتگو پایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے روک لیا اور جب تک مغیرہ (رضی اللہ عنہ) ان کے پاس سے اٹھ کر نہ چلے گئے اس وقت تک بٹھائے رکھا، میں نے دریافت کیا کہ یہ آپ سے کیا کہہ چلے؟ فرمانے لگے کہ اس سے پہلی دفعہ آئے تھے تو مجھ سے یوں کہہ گئے تھے کہ آپ عبداللہ بن عامر، معاویہ اور دیگر عمالِ عثمانی کیلئے پروانہ تقرری بھیج دیجئے اور ان کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال رکھئے یہ لوگ شہروں میں گڑبڑ نہ ہونے دیں گے اور لوگوں کو

پر سکون رکھیں گے، میں نے اسی روز ان کی اس بات سے انکار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ واللہ دن کی ایک گھڑی بھی ہو تو اس امر میں اپنے اجتہاد رائے سے کام لوں گا اور ان میں سے کسی کا تقرر نہیں کروں گا اور نہ ان جیسے لوگوں کا تقرر کیا جاسکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ پھر یہ میرے پاس سے اٹھ کر چلے تو میں ان کے متعلق سمجھ رہا تھا کہ یہ مجھے اپنے خیال میں غلطی پر سمجھ رہے ہیں، پھر اب جو دوبارہ آئے تو کہنے لگے کہ میں نے پہلی بار جو آپ کو مشورہ دیا تھا وہ تو دیا ہی تھا اور آپ نے میری بات نہ مانی تھی، پھر بعد کو میری بھی اور رائے ہوگئی اور اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ وہی کیجئے جو آپ کی رائے تھی، آپ ان سب کو معزول کر دیجئے اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد ہے ان سے مدد لیجئے کیونکہ اللہ نے سب کام سنبھال لیا ہے اور پہلے سے ان کی شوکت میں بہت کمی آئی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے عرض کیا کہ پہلی بار تو انہوں نے آپ کی خیر خواہی کی تھی اور دوسری بار انہوں نے آپ کے ساتھ ملاوٹ سے کام لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے میری خیر خواہی کس طرح کی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اس طرح کہ آپ جانتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی دنیا دار ہیں اس لئے جب آپ ان کے عہدوں پر ان لوگوں کو برقرار رکھیں گے تو ان کو پرواہ بھی نہ ہوگی کہ یہ خلافت کس کو ملتی ہے اور جو ان کو معزول کر دیں گے تو کہیں گے کہ اس شخص نے خلافت کو بغیر شوریٰ حاصل کیا ہے اور اسی نے ہمارے صاحب (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو قتل کیا ہے اور آپ کے خلاف اجتماع کریں گے پھر اہل شام و اہل عراق آپ سے کٹ جائیں گے اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ آپ سے پلٹ نہ جائیں اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

جواب دیا کہ ان لوگوں کو ان کے عہدوں پر بحال رکھنے کی بابت جو تم نے کہا تو واللہ مجھے بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ بات اس دنیائے ناپائدار کے بنانے کے لئے بہتر ہے لیکن حق کی جو مجھ پر ذمہ داری ہے اور عمال عثمانی کی جو معرفت مجھے حاصل ہے اس کی بنا پر واللہ میں ان میں سے کسی کو بھی والی نہیں بنا سکتا پھر اگر وہ سیدھے سیدھے آجاتے ہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر پشت پھیریں گے تو میں ان کے لئے تلوار سے کام لوں گا۔

ابن عباس نے کہا آپ میرا کہنا مانیں اپنے گھر تشریف رکھیں اور ینبوع میں جو آپ کا مال (زمین) ہے وہاں چلے جائیں اور اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیں کیونکہ عرب پھر پھرا کر اور پریشان ہو کر بھی آپ کے سوا دوسرے کو نہ پائیں گے سو بلاشبہ واللہ اگر آپ آج ان لوگوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو کل کو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون آپ کے سر لگادیں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ملک شام چلے جاؤ میں تمہیں وہاں کا والی بناتا ہوں، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا یہ میری رائے نہیں معاویہ رضی اللہ عنہ خاندانِ بنی امیہ کے ایک فرد ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابن عم اور ان کی طرف سے شام کے گورنر، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتقام میں کہیں میری گردن نہ اُڑادیں یا کم سے کم یہ کریں گے کہ مجھے قید کر کے مجھ پر دباؤ ڈالتے رہیں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا یہ کیوں؟ انہوں نے جواب دیا اس لئے کہ میرے اور آپ کے مابین قرابت ہے اور جو الزام وہ آپ کے سر لگائیں گے وہی میرے سر ڈال دیں گے ہاں آپ معاویہ رضی اللہ عنہ کو نامہ لکھیں ان کو توقعات دلائیں اور وعدے کریں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ واللہ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔

عباسی صاحب کو اس ساری طول طویل داستان میں لے دے کے بس اتنا ہی یاد رہا کہ اگر ان سبائی بلوائیوں سے آپ کا تعلق رہا تو خون عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام آپ پر لگ جائے گا۔

ہم نے ساری داستان نقل کر دی۔ ناظرین اسے بار بار پڑھیں اور کھوج لگائیں کہ اس میں سبائی بلوائیوں کا کہاں کہاں ذکر ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے تعلق پر کس کس جگہ اظہار ہے اور مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں کا کتنی جگہ نام آیا ہے۔

پھر اس میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی صاف تصریح موجود ہے کہ "میں جب حج کر کے مدینہ شریف کو لوٹا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی جا چکی تھی۔"

اور ان کا یہ مکالمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس وقت کا ہے جبکہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر عمال کو ان کے سابقہ عہدوں سے معزول کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اس ارادہ کا اظہار فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بخوشی علیحدہ ہو جائیں تو بہتر ورنہ پھر بزور شمشیر ان کو علیحدہ کرنا ہوگا۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مشورہ دیتے ہیں کہ سردست آپ عزل و نصب کچھ نہ کریں اطمینان سے اپنی جگہ تشریف فرما رہیں، عرب پھر پھرا لیں اور پریشان ہو لیں آپ جیسا آدمی ان کو نہ مل سکے گا، مطلب یہ ہے کہ جب ہلچل ختم ہو جائے اور تمام شہروں میں حالات اعتدال پر آجائیں تو آپ ایسا قدم اٹھائیں ورنہ اگر ابھی آپ ان لوگوں کو ساتھ لیکر جنہوں نے آپ سے بیعت کی ہے ان کو معزول کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو یہ لوگ خون عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام آپ پر لگا دیں گے۔ مؤلف نے "ھؤلآء" کا مشار الیہ سبائیوں کو بنایا جن کا یہاں عبارت میں دور نزدیک کہیں پتہ نہیں اور پھر اس مشورہ کو اس وقت کا قرار دیا جبکہ سبائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت لینا چاہتے

تھے اور "نهضت مع هؤلاء اليوم" کا بڑی جرات کے ساتھ یہ ترجمہ فرمادیا کہ:

"ان لوگوں کے ساتھ بیعت خلافت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔"

خدا جانے یہ بیعت خلافت کس لفظ کا ترجمہ ہے، پھر لطف یہ کہ آپ نے خیر سے اس سلسلہ میں طبری کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ خود بدولت اسی طبری کے متعلق اسی کتاب کے ص ۳۳۳ پر ارقام فرماتے ہیں:

"علامہ ابن جریر طبری جن کا شیعہ ہونا اب مختلف فیہ نہیں رہا۔"

اور عرض مؤلف طبع دوئم کے خاتمہ پر طبری کا اس طرح تعارف کراتے ہیں:

"اور طبری جیسے لوگوں نے اپنے دلوں کی بیماری کو پوشیدہ رکھ کر ان مفتریوں اور کذابوں کا تمام سرمایہ زور، راست کو گمراہ کرنے کے لئے جمع کر دیا۔" (ص ۴۷)

مؤلف کو یہاں تک معلوم تھا تو پھر انہوں نے اس کی اسناد پر نظر کیوں نہ ڈالی، کیا آپ کو یہ نظر نہ آیا کہ اس روایت کا ایک راوی "واقدی" بھی ہے جس کے متعلق ان ہی کا ارشاد ہے کہ:

"تاریخ کا منشا روایات کا انبار لگانا نہیں اور نہ یہ جو طبری، واقدی، مسعودی اور سیوطی نے اختیار کیا۔" (ص ۴۴ "عرض مؤلف" طبع دوئم)

کیا انہوں نے "ابی سبرہ" کو جو "واقدی" کا شیخ ہے اس روایت کے سلسلہ اسناد میں نہیں پایا جس کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "تقریب التہذیب" میں تصریح کی ہے کہ "رموه بالوضع" (محدثین نے اس پر وضع حدیث کا الزام عائد کیا ہے) ہمیں نہیں معلوم مؤلف نے اس روایت کو تحقیق اسناد کے بعد نقل کیا ہے یا بغیر تحقیق، دونوں صورتوں میں یہ فیصلہ خود ان کے ضمیر پر موقوف ہے جو انؔ کو بتائے گا کہ ہم الزام ان (طبری) کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ جرأت ملاحظہ ہو حضرت علی رضی اللہ کے متعلق کس بے باکی سے لکھا ہے کہ:

''افسوس حضرت موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا۔''(ص ۲)

مگر خود اتنا بھی عقل سے کام نہ لیا جو یہ سوچتے کہ ہمارے جد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ عاقلانہ مشورہ دیکر پھر خود اس کے خلاف کیوں کیا کہ ہر وقت حضرت ممدوح کے ساتھ لگے رہے، چنانچہ جنگ جمل میں ان کے مقدمۃ الجیش کے افسر تھے اور معرکہ صفین میں میسرہ کے، آخر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح (بقول مؤلف) خود انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے کیوں گریز نہ کیا اور خیر سے بیعت بھی کر لی تھی تو مسلمانوں کی خونریزی سے تو پرہیز بہر حال ضروری تھا، تعجب ہے کہ مؤلف کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد اتنے کیڑے نظر آگئے مگر ان کے جد امجد (رضی اللہ عنہ) کو خود ان کے ساتھ رہ کر بھی کوئی وجۂ اختلاف نظر نہ آئی اور وہ ہر جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست و بازو ہی بنے رہے، معلوم نہیں مؤلف اپنے جد (رضی اللہ عنہ) کے اس طرز عمل کی کیا توجیہ کرتے ہیں۔ قرابت کی پاسداری میں ایسا کیا گیا تھا یا دینداری کی بنا پر۔

یہ مؤلف کے پہلے حوالہ کا حال ہے اور اس میں انہوں نے عدل و تقویٰ و تحقیق کی جو داد دی ہے آپ کے سامنے ہے۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ مؤلف کو یہ جعلی روایت تو بڑی پسند آئی اور اس پر انہوں نے بقول کسے۔

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستان کے لئے

سبائی لیڈر اور اس کے ساتھیوں کی بیعت کا دلچسپ حاشیہ بھی چڑھایا، مگر خود ان ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت اس سلسلہ میں ''طبری'' میں سب سے اول مذکور تھی اس پر غالباً اس لئے توجہ نہ دی کیونکہ وہ ان کے مطلب کے موافق نہ تھی روایت حسب ذیل ہے:

عن سالم بن ابي الجعد الأشجعي عن محمد بن الحنفية قال: كنت مع أبي حين قتل عثمان رضي الله عنه فقام فدخل منزله، فأتاه أصحاب رسول الله صلى الله عليه و سلم فقالوا: إن هذا الرجل قد قتل ولا بد للناس من إمام ولا نجد اليوم أحداً أحق بهذا الأمر منك لا أقدم سابقة ولا أقرب من رسول الله صلى الله عليه و سلم، فقال: لا تفعلوا فإني أكون وزيراً خير من أكون أميراً، فقالوا: لا والله! ما نحن بفاعلين حتى نبايعك، قال: ففي المسجد فإن بيعتي لا تكون خفياً ولا تكون إلا عن رضا المسلمين، قال سالم بن أبي الجعد فقال عبدالله بن عباس: فلقد كرهت أن يأتي المسجد مخافة أن يشغب عليه، وأبى هو إلا المسجد فلما دخل دخل المهاجرون والأنصار فبايعوه ثم بايعه الناس.

(تاریخ طبری 3/ 450 طبع مطبع الاستقامه قاهره مصر 1357ء

سالم بن ابی الجعد اشجعی رضی اللہ عنہ، محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی زبانی ناقل ہیں کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے ہیں میں اپنے پدر بزرگوار (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ تھا، آپ اٹھ کر مکان میں تشریف لائے تو اصحاب رسول اللہ ﷺ نے آکر یہ کہا کہ یہ صاحب تو شہید ہو گئے اور لوگوں کے لئے کسی امام خلیفہ کا ہونا ضروری ہے آج ہمیں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جو اس وقت خلافت کا آپ سے زیادہ حقدار ہو یا تقدم میں آپ سے بڑھ کر ہو یا حضور ﷺ سے آپ سے زیادہ قرب رکھتا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایسا نہ کرو میرے لئے امیر بننے کے بجائے وزیر بننا بہتر ہے، صحابہ نے کہا اللہ کی قسم ہم کوئی کام اس وقت تک نہ کریں گے جب تک آپ سے بیعت نہ کرلیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر یہ کام

مسجد نبوی میں ہوگا، میری بیعت نہ خفیہ ہوگی اور نہ بغیر مسلمانوں کی رضامندی کے۔ سالم بن ابی الجعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے مجھے ان کا مسجد میں جانا بالکل پسند نہ تھا کہ مبادا ان کے خلاف شور و ہنگامہ نہ ہو جائے، مگر انہوں نے مسجد کے علاوہ کہیں کی حامی نہ بھری پھر جیسے ہی آپ مسجد میں آئے مہاجرین و انصار بھی آگئے اور ان سے بیعت کی پھر عام لوگوں نے بیعت کی۔

معلوم ہوا جن لوگوں نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کرنا چاہی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاً اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے بعد کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار سے مجبور ہوئے، سب سے پہلے آپ سے مہاجرین و انصار نے بیعت کی پھر عام مسلمانوں نے۔ یہ بیعت مسجد نبوی کے اندر مجمع میں ہوئی۔

مدینہ کی موجودہ فضاء کو دیکھتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو شورش پسندوں سے اندیشہ تھا کہ وہ بیعت کے وقت کوئی ہنگامہ نہ کردیں، مگر مؤلف صاحب کی بے لاگ تحقیق میں معاملہ بالکل الٹا ہے جن لوگوں نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنی چاہی وہ سبائی، بلوائی، باغی اور قاتل تھے اور جنہوں نے آپ کی بیعت سے گریز کیا وہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم۔

ببیں تفاوت از کجا است تا بکجا

کیا حضرت علی کی بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی؟

اس کے ثبوت میں ارشاد ہے:

"یہ بیعت چونکہ باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ جیسے محبوب

خلیفہ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی، نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا، نہیں لیا گیا تھا اور نہ قصاص کے لئے جانے کا کوئی امکان باقی رہا تھا، کیونکہ یہی باغی اور قاتل اور اس گروہ کا بانی سبائی عبداللہ بن سبا مبایعین کے گروہ میں نہ صرف شامل بلکہ سیاست وقت پر اثر انداز ہے۔ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کرنے سے گریز کیا، اس لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ایک موقع پر "ازالۃ الخفاء" میں اس امر کا اظہار کرتے ہوئے کہ "آنحضرت ﷺ در بسیارے از احادیث متواترہ مرویہ بطریق متعددہ بیان فرمودند کہ امت بر حضرت مرتضیٰ جمع نہ شود" لکھا ہے کہ:

"خلافت برائی حضرت مرتضی قائم نہ شد زیرا کہ اہل حل و عقد عن اجتہادٍ و نصیحتاً للمسلمین بیعت نہ کردہ۔" (ص ۲۷۹ ج ۲۰، ازالۃ الخفاء طبع اولی)

(ترجمہ): خلافت حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کے لئے قائم نہ ہوئی کیونکہ اہل حل و عقد نے اپنے اجتہاد سے اور مسلمانوں کی نصیحت کی غرض سے ان سے بیعت نہیں کی۔

ان ارباب حل و عقد کو جس میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت شامل تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات سے کوئی مخالفت نہ تھی اور نہ ان کے خلیفہ منتخب ہونے پر کسی قسم کا اعتراض تھا۔ یہ حضرات انتخاب و بیعتِ خلافت میں سبائی گروہ کی دراندازیوں کو مصالح ملیہ کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے امت کی بھاری اکثریت نے بیعت نہیں کی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فإن كثيراً من المسلمين إما النصف وإما أقل أو أكثر لم يبايعوه ولم يبايعه سعد بن أبي وقاص ولا ابن عمر ولا غيرهما. (ص 237 منهاج السنة)

پس مسلمانوں کی کثیر تعداد نے یعنی نصف (امت) یا اس سے کچھ کم یا
کچھ زیادہ نے ان (علی رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی حضرت سعد
بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، (حضرت) ابن عمر رضی اللہ عنہ نے
بیعت نہیں کی اور اس طرح اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔

سبائیوں کی حرکات شنیعہ سے امت میں جو انتشار پیدا ہو گیا تمام عالم اسلام میں خلیفہ شہید کے مظلومانہ قتل سے اک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف سے انتقام انتقام کا نعرہ بلند ہوا یہ صورت حال بہت حد تک سنبھل سکتی تھی اگر قصاص کی تدبیر کی جاتی مگر قصاص نہ لیا گیا، محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"دوم آنکہ قصاص حق است و حضرت مرتضی قادر است بر اخذ
قصاص ذی النورین واخذ آن نمی کند بلکہ مانع آن است و حضرت
مرتضی نیز بخطائی اجتھادی حکم فرمود۔"

(ازالۃ الخفاء ۲/۲۷۹ طبع اولی)

دوسرے یہ کہ قصاص لینا حق اور حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ
اس پر قادر تھے کہ حضرت (عثمان) ذی النورین رضی اللہ عنہ
(کے مظلومانہ قتل کا) قصاص لے سکتے تھے۔ مگر انہوں نے
قصاص نہیں لیا بلکہ مانع ہوئے، حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ نے
بھی خطائے اجتہادی سے کام لیا۔

حضرت موصوف کی یہ خطائے اجتہادی تھی یا بے بسی اور مجبوری، نتیجہ یہ ہوا کہ بخلاف حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم جن کی بیعت پر تمام امت مجتمع تھی، اتحاد و اتفاق تھا کفار کے مقابلہ میں جہادی سرگرمیاں تھیں بڑے بڑے ملک فتح ہوئے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہ کوئی جہاد ہوا، نہ کوئی شہر فتح ہوا، نہ ملت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی، آپس ہی میں تلواریں چلتی رہیں۔ (ص ۳، ۲)

عباسی صاحب کی اس ساری تحریر کا تجزیہ کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی۔ ثبوت یہ کہ ”اکابر صحابہ اور اہل حل و عقد نے آپ کی بیعت کرنے سے گریز کیا“ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ:

۱۔ یہ بیعت باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی۔

۲۔ اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ جیسے محبوب خلیفہ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی۔

۳۔ نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا۔

اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بیعت سے گریز کرنے کی پہلی دو وجہیں جو مؤلف نے ذکر کی ہیں ان کے ثبوت میں وہ کوئی سند نہ پیش کر سکے، ناظرین شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ان عبارات کو جو مؤلف نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں نقل کی ہیں پھر غور سے پڑھیں، ان میں تو ذکر ہے کہ اہل حل و عقد نے یا مسلمانوں کی کثیر تعداد نے بیعت نہ کی لیکن کیوں بیعت نہ کی؟ اس کی کوئی وجہ مذکور نہیں یہ دونوں وجہیں محض ایجاد بندہ ہیں۔[116]

116۔ ناظرین یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ عباسی صاحب جو یہاں بار بار ”سبائی سبائی“ کی رٹ لگا رہے ہیں اس سے ان کا منشا کیا ہے وہ اس گروہ کے بانی مبانی عبداللہ بن سبا اور اس کی سبائی پارٹی کو خوب جانتے ہیں، چنانچہ صفحہ ۵ پر ان کے الفاظ ہیں: ”عبداللہ بن سبا یہودی مفسد جس کو ابن السودا، بھی کہتے ہیں بذات خود مدینہ میں موجود تھا قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا سارا پلان اسی نے بنایا تھا۔“ اور ص ۱۱۸ پر لکھتے ہیں: ”چنانچہ اہل نجران (عیسائی اور یہودی وغیرہ) جن کی آبادی عرصہ تک اس علاقہ میں رہی تھی اور ان ہی میں مشہور مفسد و منافق ابن سباء بھی تھا۔“ اور ص ۳۳۷ پر انہوں نے سبائیوں کا تعارف ”سبائی منافقین“ سے کرایا ہے۔ اب ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ == عباسی صاحب ان کے الفاظ کو بار بار دہرا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا باور کرانا چاہتے ہیں؟

رہی تیسری وجہ یعنی قاتلین سے قصاص نہ لیناوہ بیعت خلافت کے مکمل ہونے کی وجہ تو بن سکتی ہے عدم تکمیل کی نہیں، قصاص تو خود ثبوت تکمیل بیعت ہے کیونکہ قاتل سے قصاص کا لینا خلیفہ کی ذمہ داری ہے، اور خلیفہ جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ اس کی بیعت خلافت مکمل ہو، اب اگر ترکِ قصاص خلیفہ کا جرم ہے تو خلیفہ سے جدال و قتال کرنا طالبین قصاص کا جرم، ورنہ یہ ثابت کیا جائے کہ خلیفہ اگر کسی مقتول کا قصاص نہ لے تو اس کے خلاف بغاوت کر کے جنگ چھیڑ دینا ضروری ہے حالانکہ آپ ہی کا ارشاد ہے کہ:

> ”سوائے ارتداد کے کسی حالت میں بھی ولاۃ الامر کے خلاف خروج کو جائز نہیں کیا گیا۔“(ص ٦٢)

پھر یہ تینوں وجہیں فرع ہیں اس دعوے کے ثبوت کی کہ:

> ”اہل حل وعقد نے جن میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت شامل تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے گریز کیا۔“

حالانکہ یہ دعویٰ سرے سے غلط ہے، خود مؤلف کی تصریح ہے:

> ”حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد ماجد کے مستقر خلافت چھوڑنے کے خلاف تھے، اس وقت تو وہ ان کے ساتھ نہ گئے بعد میں اس مقام ربذہ میں آکر ملے اور والد سے شکایت کی کہ میرا کوئی مشورہ آپ نے نہ مانا بلکہ اس کے خلاف کیا، میں نے عرض کیا تھا“کہ جب تک تمام ولایتوں کے وفود نہ آجائیں اور لوگ وہاں کے بیعت نہ کر لیں اپنی بیعت نہ لیجئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ انتخاب خلیفہ کا حق اہل مدینہ کا ہے۔قات الأمر أمر أهل المدينة (طبری) ان کا اور ان کے ساتھیوں کا یہی موقف تھا کہ مدینہ میں جب بیعتِ خلافت ہو چکی تو اب سب کو اس بیعت میں داخل ہونا چاہیئے پھر مرکز کو مضبوط کر کے داخلی فتنوں کا سد باب ہو سکتا ہے۔“(ص ٢)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ ''انتخاب خلیفہ کا حق اہل مدینہ کا ہے'' مؤلف کو مسلم ہے اور انہوں نے اسی بنیاد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت کی ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

''امیر المومنین عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے متعلق رائے شماری البتہ ہوئی تھی لیکن صرف اہل مدینہ کی باقی عالم اسلام سے قطعاً کچھ دریافت نہیں کیا گیا۔(ص ۳۸ ''عرض مؤلف'' طبع دوئم)

اہل مدینہ کو انتخاب خلیفہ کا حق اس لئے تھا کہ مدینہ طیبہ سابقین اولین کا مرکز تھا اور ارباب حل و عقد وہی تھے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں ابن سعد کے حوالہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ناقل ہیں کہ:

هذا الأمر في أهل بدر ما بقي منهم أحد ثم في أهل أحد ثم في كذا وليس فيها لطليق ولا لمسلمة الفتح شيء. (ج13 ص178)

جب تک اہل بدر میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہے خلافت اس کا حق ہے پھر اہل احد کا فلاں غزوہ والوں کا اور خلافت کے بارے میں کسی طلیق [117] کو یا ان لوگوں کو جو فتح مکہ میں مسلمان ہوئے کسی قسم کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

معلوم ہوا سابقین اولین کی موجودگی میں فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا اور اصحاب بدر و احد کے ہوتے دوسرے لوگ اہل حل و عقد نہیں ہو سکتے۔

اور اتنا تو مولف کو بھی تسلیم ہے:

''حضرت علی کے مدینہ چھوڑ کر کوفہ کو مستقر خلافت بنانے اور اس کے بعد دمشق کو یہ مرتبہ حاصل ہو جانے کے بعد حرمین شریفین کے

117۔ ''طلیق'' وہ نو مسلم قریشی جس نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ نے ازراہ احسان و کرم گستری اس کی جان بخشی فرمائی۔

باشندوں کا اہل حل و عقد ہونے کا وہ امتیازی حق جاتا رہا تھا جو حضرات شیخین (ابو بکر و عمر) رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھا۔" (ص ۳۳)

جب "حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ کو مستقرِ خلافت بنانے تک اہلِ حرمین شریفین کو اہل حل و عقد ہونے کا امتیازی حق حاصل تھا" تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہی اہل مدینہ اگر حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لیں تو ان کی بیعت خلافت مکمل ہو جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کریں تو ان کی بیعت مکمل نہ ہو اسی لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وازادل دلائل ایں مدعا قول حضرت مرتضی است کی چندیں مرہ بطرف اہل شام نوشت کہ امر خلافت مفوض است بمہاجرین وانصار دیگری رادر حل و عقد آن مدخل نہ چوں ایشان بیعت کردند دیگران رامجال خلاف نماند۔" (ازالۃ الخفاء ۱۱۱/۲)

ترجمہ: اور اس مدعا کی سب سے بڑی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے متعدد بار آپ نے اہل شام کو لکھا کہ خلافت کا معاملہ مہاجرین و انصار کے سپرد ہے دوسرے کو اس کے حل و عقد میں کچھ دخل نہیں جب ان حضرات نے بیعت کر لی تو دوسروں کو اختلاف کی مجال نہیں۔

پھر عجیب بات ہے کہ یہاں پر تو مؤلف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اعتراضات کی بھرمار کر دی ہے اور اپنا سارا زور اس امر پر صرف کر دیا ہے کہ ان کی بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی، مگر یزید کی خلافت کو ثابت کرتے وقت دفعتاً ان کا انداز بدل جاتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ سب مطاعن جن کے ثبوت کے لیے صفحے سیاہ کئے گئے تھے ان کی نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتے ہیں اور وہ بے اختیار یہ فرمانے لگتے ہیں کہ:

"شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مبحث پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے

امیر یزید کے خلاف مکہ معظمہ میں محاذ قائم کر لیا تھا اور امیر موصوف کی وفات کے بعد اپنی خلافت کی بیعت بھی لے لی تھی، فرمایا ہے [۱۱۸] کہ ان واقعات کے باوجود امیر یزید اسی طرح جائز خلیفہ اور امام المسلمین تھے جیسے مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے کہ ان کی بیعت سے ایک جماعت نے انکار کیا تھا اور تمام بلاد المسلمین پر تسلط و اقتدار ان کا قائم نہ ہو سکا تھا بایں ہمہ وہ امام المسلمین تھے اسی طرح یزید بھی تھے۔" (ص ۳۳۱)

اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں تک لکھ دیتے ہیں کہ:

"حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے اور صحاح ستہ کی اکثر کتب میں موجود ہے، نیز "ترمذی" میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی حدیثیں مروی ہیں یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ دین اسلام قوت سے رہے گا یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہوں اور وہ سب قریش سے ہوں گے۔" لایزال الإسلام عزیزاً إلی اثنی عشرة خلیفة کلهم من

118۔ محض غلط ہے کہیں نہیں فرمایا، ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے تو الفاظ یہ ہیں:

وأما علماء أهل السنة الذين لهم قول يحكي فليس فيهم من يعتقد أن يزيد وأمثاله من الخلفاء الراشدين والأئمة المهديين كأبي بكر وعمر وعثمان وعلي رضي الله عنهم بل أهل السنة يقولون بالحديث الذي في السنن خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم تصير ملكاً. (منهاج السنة 2/ 339)

وہ علماء اہل سنت جن کا قول قابل نقل سمجھا جاتا ہے ان میں کوئی ایسا نہیں جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ یزید اور اس جیسے لوگ حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی طرح ہیں بلکہ اہلسنت تو اس حدیث کے قائل ہیں جو سنن میں موجود ہے کہ خلافت نبوت تیس سال تک رہے گی پھر ملوکیت آجائے گی۔

قریش" پانچویں امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور چھٹے امیر المؤمنین یزید ہوتے ہیں۔" (ص ۳۴۳)

اب ایک طرف تو مؤلف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو حدیث صحیح سے ثابت کرتے ہیں اور ان کو چوتھا خلیفہ مانتے ہیں اور دوسری طرف یہ فرماتے جاتے ہیں کہ ان کی بیعت باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ جیسے محبوب خلیفہ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کر کے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی اس لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی پھر اس میں نہ کوئی جہاد ہوا، نہ کوئی ملک و شہر فتح ہوا، آپس ہی میں ہماری تلواریں چلتی رہیں اس لئے یہ عقدہ تو مؤلف کا ذہن رسا ہی حل کر سکتا ہے کہ ایسی خلافت جس کے لئے یہ اوصاف ہوں احادیث صحیحہ میں اس کے برحق ہونے کی پیشین گوئی کس طرح آئی۔

پھر کمال یہ ہے کہ مؤلف نے اپنے دعوی کے ثبوت میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی "ازالۃ الخفاء" سے دو عبارتیں اس انداز میں پیش کی ہیں گویا شاہ صاحب موصوف کا یہ ذاتی خیال ہے حالانکہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ دونوں باتیں ان حضرات کے شبہ کے طور پر نقل کی تھیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے میں خطا پر تھے۔

چنانچہ یہ بات کہ "آنحضرت ﷺ در بسیار از احادیث متواترہ مرویہ بطرق متعددہ بیان فرمودند کہ امت بر حضرت مرتضی جمع نشود۔" (ص ۲۷۵) پر مرقوم ہے اور وہ عبارتیں جو مؤلف نے نقل کی ہیں (۲۷۹) پر ہیں۔ مگر مؤلف نے دونوں کا پیوند اس طرح سے لگا دیا ہے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھے کہ دونوں باتیں شاہ صاحبؒ رحمہ اللہ نے اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ "امت بر حضرت مرتضی جمع نشود" پھر مؤلف کو یہ عبارت تو "ازالۃ الخفاء" میں مل گئی کہ "امت بر حضرت مرتضی جمع نشود"، لیکن آنحضرت ﷺ نے جو اس عدم اجتماع پر اپنے دلی افسوس کا

اظہار فرمایا تھا وہ نہ مل سکا، حالانکہ اسی ''ازالۃ الخفاء'' میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ خبر دادند کہ امت بر حضرت مرتضی جمع نشود، تالم خاطر مبارک خود تقریر فرمودند۔''(۱/۱۲۵)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ تخست از خلافت حضرت مرتضی خبر دادند کہ منتظم نشود وازان متالم شدند۔''(ص ۱۵۲)

دونوں جگہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کے ذیل میں ان احادیث کو بھی نقل کیا ہے جس میں امت کے اس طرز عمل پر آنحضرت ﷺ نے اپنے دلی تاسف کا اظہار فرمایا ہے اور حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کو اس ابتلاء میں ''في سلامة من دينك''(کہ تمہارا دین سلامت رہے گا) کی بشارت دی ہے۔ یہ بڑی قساوت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس واقعہ پر تاسف کا اظہار فرمایا ہو اسے مزے لیکر بیان کیا جائے۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شماتت نہیں تو اور کیا ہے۔

''ازالۃ الخفاء'' کے مقصد دوم میں خلفاء اربعہ کے مآثر و مناقت پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں ان حوادث کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے ایام خلافت میں پیش آئے، چنانچہ ترتیب وار اخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان ہے جس کا عنوان ہے ''مآثر أمير المؤمنين وإمام الأشجعين أسد الله الغالب علي ابن أبي طالب رضي الله عنه'' یہ بیان مناقب کتاب کے ۲۵۱ صفحہ سے لیکر ص ۲۷۴ تک پھیلا ہوا ہے پھر اس ضمن میں ان وقائع کی تفصیل شروع ہو جاتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آئے جس کا آغاز ص ۲۷۴ کی اخیر سطر سے ان الفاظ میں ہوتا ہے:

"باید دانست کہ انچہ بر حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ بعد وفات آنحضرت ﷺ گذشت آخر عمر ہمہ آن وقائع آنحضرت ﷺ اخبار فرمودہ بود و باصولی آن حوادث مطلع ساختہ۔"

پھر ہر واقعہ کا ذکر کر کے شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کے متعلق ان روایات و احادیث کو پیش کرتے چلے گئے ہیں جو اس کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، وقائع کی یہ تفصیل ص ۲۷۵ سے شروع ہو کر ص ۲۷۹ تک چلی گئی ہے، پھر شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ہر حادثہ کے حکم پر شرعی بحث کی ہے جو ان الفاظ میں شروع ہوتی ہے:

"باز باید دانست کہ حکم ہر حادثہ ازیں حوادث از لفظ ہمیں احادیث مستنبط می شود، وعلماء اہل سنت بھمان حکم مہتدی شدہ اند، ہر چند ماخذ ایشان غیر مآخذ استنباط از لفظ ایں حدیث بودہ باشد۔
اما آنکہ خلافت مرتضی منعقد شد پس ازیں جہت کہ آنحضرت ﷺ نہی کردند از مفارقت حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ۔"

ترجمہ: پھر جاننا چاہیے کہ ان حوادث میں سے ہر حادثہ کا حکم انہی احادیث کے الفاظ سے نکلتا ہے اور علماء اہل سنت کو اسی حکم کی طرف ہدایت ہوئی ہے اگرچہ ان کا ماخذ اس سلسلہ میں اس حدیث کے لفظ کے علاوہ کچھ اور رہے۔
چنانچہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے منعقد ہو جانے کا حکم اس بنا پر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑنے سے ممانعت فرمائی تھی۔

پھر اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان احادیث کو بیان کیا ہے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مفارقت کی ممانعت آئی ہے اور ان کے حق پر ہونے کا بیان ہے۔ پھر جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ان میں سے ہر ایک کا حکم بھی تفصیل سے لکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"واما آنکه حضرت عائشه و طلحه و زبیر رضی الله عنهم مجتهد مخطی معذور بودند ازان قبیل که "من اجتهد فقد أخطأ فله أجر واحد" پس ازان جهت که متماسک بودند بشبهه هر چند دلیل دیگر ارجح ازوی بود و موجب آن شبه دو چیز است یکی آنکه خلافت برائے حضرت مرتضی منعقد نشد زیرا که اهل حل و عقد عن اجتهاد و نصیحة للمسلمین بیعت نه کرده اند .....

دوم آنکه قصاص حق است و حضرت مرتضی قادر است بر اخذ قصاص ذی النورین واخذ آن نمی کند بلکه مانع آن است، و حضرت مرتضی نیز بخطائے اجتهادی حکم فرمود "أخرج أبو بكر عن أبي البختري، قال: سئل علي عن أهل الجمل، قال: قيل: أمشركون هم؟ قال: من الشرك فروا، قيل: أمنافقون هم؟ قال: إن المنافقين لا يذكرون الله إلا قليلاً، قيل: فما هم؟ قال: إخواننا بغوا علينا، وقال علي: إني لأرجو أن نكون كالذين ، قال الله عزوجل: ''وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ'' حديث له طرق متعددة عند أبي بكر''وا گر خصم قبول نکند این راو رای ایشان راازخطائے اجتهادی نشمارد بلکه از سیئات حساب کند فقدقال الله تعالى ''فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوْا فِيْ سَبِيلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ الله". وقال النبى صلى الله عليه وسلم: لعل الله اطلع أهل بدر، فقال: اعملوا ماشئتم فقد غفرت لكم.

ترجمہ: اور یہ بات کہ حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم سے اجتہاد میں غلطی ہوئی اور وہ معذور تھے اس حدیث کے مطابق جس میں وارد ہے کہ "جس شخص نے اجتہاد کیا اور اس سے اجتہاد میں خطا ہوئی تو اس کو ایک اجر ہے" یہ اس بنا پر کہ ان کو استدلال میں شبہ ہو گیا اگرچہ دوسری دلیل اس سے زیادہ راجح موجود تھی اور

موجب شبہ دو چیز تھی ایک یہ کہ حضرت مرتضیٰ کے لئے خلافت منعقد نہ ہوئی کیونکہ اہل حل و عقد نے اپنے اجتہاد اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی بنا پر ان کی بیعت نہیں کی۔

دوسرے یہ کہ قصاص حق ہے اور حضرت مرتضیٰ حضرت ذی النورین کا قصاص لینے پر قادر ہیں مگر قصاص لیتے نہیں بلکہ اس سے مانع ہیں اور حضرت مرتضی نے بھی خطائے اجتہادی ہی کا حکم لگایا ہے چنانچہ ابو بکر (بن ابی شیبہ) نے ابو البختری سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہل جمل کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ کیا یہ لوگ مشرک ہیں؟ فرمایا شرک سے تو بھاگے ہیں، پھر پوچھا گیا کہ کیا یہ منافق ہیں؟ فرمایا کہ منافق تو اللہ کو بہت تھوڑا یاد کرتے ہیں، اس پر دریافت کیا گیا کہ پھر آخر یہ کیا ہیں؟ فرمایا ہمارے بھائی ہیں جو ہم سے باغی ہو گئے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ مجھے امید ہے کہ ہم سب ان لوگوں میں سے ہوں گے کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (ہم نے ان کے دلوں میں جو کینہ تھا نکال دیا اب یہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہیں) یہ وہ روایت ہے جس کو ابو بکر (بن ابی شیبہ) نے متعدد طرق سے نقل کیا ہے اور اگر مخالف اس بات کو باور نہ کرے اور ان لوگوں کی رائے کو خطائے اجتہادی نہ مانے بلکہ گناہ شمار کر لے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو ایذا دی گئی انہوں نے جنگ کی اور وہ قتل کئے گئے میں ضرور ان کے گناہوں کو معاف کروں گا اور ان کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ اللہ کا دیا ہوا ثواب ہے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے اہل بدر سے جھانک کر فرما دیا ہو کہ تم جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ابو بکر بن ابی شیبہ کے حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ نقل کئے ہیں جو انہوں نے کوفہ کی جامع مسجد میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے:

"ہماری ماں (أم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) بھی ہماری طرح معرکہ میں آگئی ہیں، خدا کی قسم وہ دنیا و آخرت دونوں میں رسول خدا کی زوجہ ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرح آزمایا ہے کہ ہم ان کا کہنا مانتے ہیں ان (علی) کا۔"

پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ اور ابو بکر و عمر و عثمان و طلحہ و زبیر (رضی اللہ عنہم) یہ سب حضرات "کوہِ حرا" پر تشریف فرما تھے دفعتاً چٹان ہلنے لگی، اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ٹھہر جا تجھ پر نبی یا صدیق یا شہید کے علاوہ اور کون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"بازازیں عزیزان کلمات والہ بررجوع ازیں رائے منقول شدہ۔"

ترجمہ: پھر ان حضرات سے وہ اقوال بھی مروی ہیں جو اس رائے سے ان کے رجوع کرنے کو بتلاتے ہیں۔

چنانچہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں حسب ذیل تفصیل دی ہے:

"ابو بکر (ابن ابی شیبہ) نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتی تھیں کاش میں درخت کی ہری بھری ڈالی ہوتی اور اس معرکہ میں نہ آتی اور بطرق متعددہ مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے روز حضرت زبیر سے فرمایا تھا کہ تمہیں خدا کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کیا تم کو اس دن کا واقعہ یاد ہے جب میں تم سے سرگوشی میں مصروف تھا اتنے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا کہ تم ان سے کیا چپکے چپکے باتیں کر رہے ہو، خدا کی قسم ایک دن وہ آئے گا کہ یہ تم سے برسر جنگ ہوں گے اور تمہارے حق میں ظالم ہوں گے (راوی کا بیان ہے)

کہ یہ سنتے ہی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی سواری کے منہ پر چابک رسید کیا اور میدان سے لوٹ گئے، اس روایت کو ابو بکر (بن ابی شیبہ) اور دوسرے لوگوں نے نقل کیا ہے، پھر ابن جرموز نے معرکہ سے پلٹنے کے بعد آپ کو شہید کر دیا اور ابو بکر نے قیس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ مروان بن الحکم نے جنگ جمل کے دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر تیر چلایا جو آپ کے گھٹنے میں لگا، زخم سے خون جاری ہو کر بہنے لگا اور یہ کیفیت ہو گئی کہ جب تک زخم کو پکڑے رہتے خون بند رہتا جہاں ذرا چھوڑتے پھر سے بہنے لگتا، آخر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو یہ حق تعالیٰ کا بھیجا ہوا تیر ہے، چنانچہ اسی سے آپ کی شہادت واقع ہوئی اور حاکم نے ثور بن مجزاۃ سے روایت کیا ہے کہ میں جنگ جمل کے دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا تو ابھی ان میں زندگی کی آخری رمق باقی تھی انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے فرمایا ہاتھ بڑھاؤ میں تم سے بیعت کرنا چاہتا ہوں، میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا آپ نے مجھ سے بیعت کی اور روح مبارک پرواز کر گئی۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"واما آنکہ معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد مخطی معذور بود پس ازانجہت کہ متمسک بود بشبہہ ہر چند دلیل دیگر در میزان شرع راجح ازان بر آمد مانند آنچہ در قصہ اہل جمل تقریر کردیم بازیادت اشکال و آن آنست کہ معاویہ واہل شام بیعت نکردہ بودند، و میدانستند کہ تمامی خلافت بتسلط و نفاذ حکم است و آن متحقق نشد، باز امر تحکیم آن شبہ را راسخ تر نمود، و در حدیث صحیح آمدہ دعواهما واحدة۔"

ترجمہ: اور یہ مسئلہ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے اجتہاد میں غلطی ہوئی اور وہ معذور تھے یہ اس حیثیت سے ہے کہ ان کو استدلال میں

شبہ ہو گیا تھا ہر چند کے دوسری دلیل میزان شرع میں اس سے زیادہ راجح تھی اسی طرح جیسا کہ اہل جمل کے قصہ میں ہم نے بیان کیا مع مزید اشکال کے جو یہ تھا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام سے بیعت بھی نہ کی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تسلط اور نفاذ حکم سے خلافت کی تکمیل ہوتی ہے اور ایسا ہوا نہیں ہے پھر تحکیم کے معاملہ نے اس شبہ کو اور زیادہ پختہ کر دیا اور صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ان دونوں کا دعوی ایک ہو گا۔ (یعنی دونوں جماعتیں کلمہ گو ہوں گی)

پھر لکھتے ہیں:۔

واما آنکہ اہل حروراء بر باطل بودند و بسمت کفر یا فسوق متسم اعاذنا اللہ من ذلک پس از انجہت کہ احادیث متواترہ در باب حروریہ وارد شدہ است کہ ''یمرقون من الدین مروق السهم من الرمية''۔

ترجمہ: اور یہ بات کہ اہل حروراء (خوارج) باطل پر تھے اور کفر یا فسق کے دھبہ کے داغدار (اللہ ہم کو اس سے بچائے) سو اس لئے کہ حروریہ کے بارے میں احادیث متواترہ آئی ہیں کہ یہ لوگ دین سے ایسے نکل بھاگیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے شاہ ولی اللہ صاحب نے احادیث کی روشنی میں پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو منعقد مانا پھر جن لوگوں نے ان سے جنگ کی تھی ان کے احکام بتائے، یہ تین فریق تھے اہل جمل، اہل صفین اور اہل حروراء ان میں اہل حروراء یعنی خوارج پر حکم لگایا کہ وہ باطل پر تھے اور کفر یا فسق سے ملوث ہوئے۔ بقیہ دو فریق کو مجتہد مخطی کے زمرہ میں شمار کیا اور ان کے شبہات بتائے جن کی بنا پر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر جنگ تھے، پھر اصحاب جمل کے مغفور ہونے کے سلسلہ میں ان کی طرف تین عذر بیان فرمائے کہ اولاً یہ کہ ان حضرات سے اجتہاد میں خطا ہوئی اور خطائے اجتہادی میں بسبب نیک نیتی کے طلب حق کی کوشش کا ایک گونہ اجر ہے۔ ثانیاً

اگر مخالف اس کو ان کی خطائے اجتہادی نہ مانے اور تقصیر ہی قرار دے تو یہ حضرات سابقین اولین میں ہیں، غزوۂ بدر میں جس کو قرآن عظیم نے "یوم الفرقان" (کفر و اسلام کی تفریق کا دن) قرار دیا ہے شریک رہ چکے ہیں، اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان حضرات کی مغفرت پر شہادت دی ہے۔ ثالثاً ان حضرات نے اپنی غلطی سے رجوع بھی کر لیا تھا اور توبہ کے بعد پھر پچھلے کئے پر ملامت نہیں کی جاسکتی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام سے بھی خطائے اجتہادی ہوئی ان کو بھی برا نہیں کہا جاسکتا، حدیث صحیح نے ان کے ایمان کی شہادت دی ہے۔

مؤلف نے اپنی ذہانت سے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو دو شبہ اس فریق کے بیان کئے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ پر تھے خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کے سر تھوپ دیئے اور ان کی عبارت کو اس طرح تحریف کر کے پیش کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ رائے ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ان دو وجہوں سے منعقد نہ ہو سکی تھی، مؤلف کی اس حرکت کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے "حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نیز بخطائے اجتہادی حکم فرمود" کا ترجمہ فرمایا ہے:

"حضرت مرتضیٰ نے بھی خطائے اجتہادی سے کام لیا۔"

اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تک لکھ گئے کہ:

"حضرت موصوف کی یہ خطائے اجتہادی تھی یا بے بسی اور مجبوری۔"

یہ دیدہ ودانستہ تحریف ہے جو اگلی عبارت کے پڑھ لینے سے ہر ابجد خواں پر عیاں ہو جاتی ہے، اس عبارت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

"اور حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی خطائے اجتہادی ہی کا حکم لگایا۔"

یہ ان حضرات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کا بیان ہے

جو جنگ جمل میں آپ کے مد مقابل تھے، ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خطائے اجتہادی کا بیان ہوتا تو عبارت یوں ہوتی:

"وحضرت مرتضیٰ نیز خطائے اجتہادی فرمود"

عبارت کے اس طرح معنی بدل کر حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر خطائے اجتہادی کا حکم لگانا بڑی جسارت ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ جن کے انکشاف حقیقت کا مؤلف کو غایت درجہ اعتراف ہے ("عرض مؤلف" طبع اول ص ۸،۹) اس باب میں مول کے علی الرغم یوں فرماتے ہیں:

ولم يذهب إلى تخطئة علي ذو تحصيل أصلاً.

(احیاء العلوم بحث امامت وخلافت)

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے برسر خطا ہونے کی طرف کوئی پڑھا لکھا کبھی نہیں گیا۔

یہ واضح رہے کہ مؤلف نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس کا پورا نام "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" ہے جس کا ترجمہ ہوتا ہے "خلفاء کی خلافت میں جو خفا ہے اس کو دور کر دینا" کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب حضرات خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے ثبوت میں لکھی گئی ہے اس لئے اس کتاب سے یہ ثابت کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد نہ ہوئی بڑی ستم ظریفی ہے۔ مولف کا مقصد اگر اس کتاب سے حاصل ہوتا تو اس کا نام "إزالة الخلافة عن الخلفاء" ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ "إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء" شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کتاب کے اوائل ہی پر تصریح کر دی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مہاجرین وانصار کے آپ سے مدینہ میں بیعت کر لینے کی بنا پر خلیفہ ہوئے ہیں ان کے الفاظ ہیں:

"بہ بیعت مہاجرین وانصار در مدینہ خلیفہ شدند۔"

اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عبارت جو مؤلف نے یہ کہہ کر پیش کی ہے کہ امت کی بھاری اکثریت نے بیعت نہیں کی خود مؤلف کی تردید کر رہی ہے کیونکہ اس میں تو یہ مذکور ہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے یعنی نصفِ امت یا اس سے کچھ کم زیادہ نے ان کی بیعت نہیں کی۔

جس سے معلوم ہوا کہ اتنے ہی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت بھی کرلی تھی، پھر بھاری اکثریت بیعت نہ کرنے والوں کی کس طرح ہوگئی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو تو بیعت نہ کرنے والوں کی اکثریت کیا پورے نصفا نصف ہونے میں شک ہے، بھاری اکثریت کا تو ذکر ہی کیا ہے، ہاں روافض اس کے مدعی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اکثریت نے نہیں بلکہ اقلیت نے بیعت کی تھی اور اس طرح وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر دنیا طلبی کا الزام عائد کرنا چاہتے ہیں کہ باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق بجانب ہونے اور اپنے لئے امارت کا مطالبہ کرنے کے ان کی اکثریت نے ان سے بیعت نہ کی۔

مؤلف بھی اس بارے میں ان کے ہم زبان ہوگئے روافض کا منشا عام صحابہ (رضی اللہ عنہ) پر طعن تھا اور مؤلف کا خاص حضرت علی (رضی اللہ عنہ) پر، حالانکہ خود ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

قولك إنه طلب الأمر لنفسه بحق له وبايعه الأقلون كذب على علي رضي الله عنه فإنه لم يطلب الأمر لنفسه في خلافة أبي بكر وعمر وعثمان وإنما طلبه لما قتل عثمان وبويع وحينئذ فأكثر الناس كانوا معه لم يكن معه الأقلون.

(منهاج السنة 2/ 168)

تمہارا (مصنف "منہاج الکرامہ" حسین حلی رافضی کو خطاب ہے) یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حق کی بنا پر اپنے لئے امارت کا مطالبہ کیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ ہے کیونکہ حضرات

ابی بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں توانہوں نے
اپنے لئے مطالبہ بھی نہیں کیا ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب
شہید ہوگئے اوران سے بیعت کرلی گئی تو پھر بیشک انہوں نے ایسا کیااور
اس وقت لوگوں کی اکثریت ان کے ساتھ تھی نہ کہ اقلیت۔

مؤلف ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عبارت سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امت کی بھاری اکثریت نے ان کی بیعت نہ کی اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے بلکہ اکثریت ان کے ساتھ تھی نہ کہ اقلیت۔

یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے (جو ایک بھاری اقلیت پر مشتمل تھی) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، بقول مؤلف
:

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ مریض کے بارے میں انجینیر سے، آب
پاشی کے نظام کے سلسلہ میں خانقاہ نشین سے، صحت عامہ کے بارے
میں کمانڈار افواج سے اور عدلیہ کے متعلق تاجر سے مشورہ کرنے والا
شخص عقلمند سمجھا جائے گا یا احمق؟ اگر "أمرهم شورى بينهم" کے یہ
معنی نہیں کہ ہر کس و ناکس سے بات کی جائے وہ اہل ہو یا نہ ہو، تو ظاہر
ہے کہ امور سیاسی میں اصحاب سیاست اور ارباب حل و عقد ہی سے
مشورہ کیا جائے گا اور انہیں کی بات سنی اور مانی جائے گی۔"

(ص ۳۹ "عرض مؤلف" طبع دوم)

جب یہ بات مؤلف کو تسلیم ہے کہ انتخاب خلیفہ کا حق اہل حل و عقد کو ہے نہ ہر کس ناکس کو تو اب مسئلہ صاف ہے، یہ دیکھ لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہل حل و عقد نے بیعت کی تھی یا نہیں، مولف کی معلومات تو اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان سے قاتلوں اور باغیوں اور سبائی بلوائیوں نے بیعت کی تھی لیکن ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصریحات اس بارے میں حسب ذیل ہیں، لکھتے ہیں:

الإمامة عندهم تثبت بموافقة أهل الشوكة عليها ولا يصير الرجل إماماً حتى يوافقه أهل الشوكة عليها الذين يحصل بطاعتهم له مقصود الإمامة.

اہل سنت کے نزدیک ارباب حل وعقد اگر امام بنانے کے موافق ہوں تو امامت ثابت ہو جاتی ہے اور کوئی شخص اس وقت تک امام نہیں بن سکتا جب تک کہ اس سے وہ اہل رائے جن کی اطاعت کرنے سے مقصود امامت حاصل ہوتا ہو موافقت نہ کریں۔

اس تمہید کے بعد ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ولهذا لما بويع علي رضي الله عنه وصار معه شوكة صار إماماً. (منهاج السنة 1/ 141)

اور اسی لئے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کی گئی اور ان کو شوکت مل گئی تو وہ امام (خلیفہ) ہو گئے۔

یہ اہل شوکت وارباب حل وعقد کون تھے؟ وہی سابقین اور مہاجرین وانصار جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر مخالفوں سے جہاد کیا تھا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وأما علي فلا ريب أنه قاتل معه طائفة من السابقين الأولين كسهل بن حنيف و عمار بن ياسر. (منهاج السنة ۴/ 17)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سو اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کی معیت میں سابقین اولین کی ایک جماعت نے جیسے کہ حضرت سہل بن حنیف اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ہیں (باغیوں سے) قتال کیا تھا۔

ایک اور مقام پر علامہ موصوف اسی "منہاج السنہ" میں یہ لکھتے ہیں:

وعلي بايعه كثير من المسلمين وأكثرهم بالمدينة على أنه أمير المؤمنين ولم يبايع طلحة والزبير أحد على ذلك ولا طلب أحد منهما ذلك ولا دعا إلى نفسه فإنهما رضي الله عنهما كانا

أفضل وأجل قدراً من أن يفعلا مثل ذلك وكذلك معاوية لم يبايعه أحد لما مات عثمان على الإمامة ولا حين كان يقاتل علياً بايعه أحد على الإمامة ولا يسمى بأمير المؤمنين ولا سماه أحد بذلك ولا ادعى معاوية ولاية قبل حكم الحكمين وعلي يسمى نفسه أمير المؤمنين في مدة خلافته والمسلمون معه يسمونه أمير المؤمنين.

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جن میں سے اکثر مدینہ طیبہ میں موجود تھے ان کے امیر المومنین ہونے پر بیعت کرلی تھی اور حضرت طلحہ وزبیر (رضی اللہ عنہما) سے کسی نے اس پر بیعت نہ کی کہ ان دونوں حضرات میں سے کسی نے اس کا مطالبہ کیا اور نہ اپنے لئے اس کی دعوت دی اور نہ ان دونوں بزرگوں کی (اللہ ان سے راضی ہو) شان کے یہ لائق تھا کہ وہ ایسا کرتے، اور اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کسی نے بیعت نہ کی بلکہ جس وقت وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر جنگ تھے اس وقت بھی کسی نے ان سے امامت پر بیعت نہیں کی اور نہ خود انہوں نے اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہا نہ کسی اور نے اور نہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے تحکیمین کے فیصلہ سے پہلے دعویٰ امارت کیا، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو اپنی مدت خلافت میں امیر المؤمنین ہی کہتے تھے اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ ساتھ آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

اور یہی ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسی کتاب میں دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں:

وهذا لا يرد على أهل السنة فإنهم يثبتون خلافة الخلفاء كلهم ويستدلون على صحة خلافتهم بالنصوص الدالة عليه ويقولون إنها انعقدت بمبايعة أهل الشوكة لهم وعلي

بايعه أهل الشوكة وإن كانوا لم يجتمعوا عليه كما اجتمعوا على من قبله. لكن لا ريب أنه كان له سلطان وقوة بمبايعة أهل الشوكة له وقد دل النص على أن خلافته خلافة نبوة.

(منهاج السنة 2/ 204)

اور یہ (اعتراض جو روافض وخوارج کے معتقدات پر آتا ہے) اہل سنت پر نہیں آتا کیونکہ وہ سب خلفاء کی خلافت کو مانتے ہیں اور ان کی صحت خلافت پر ان نصوص سے جو ان کی خلافت کو بتلاتے ہیں استدلال لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی خلافت اہل شوکت (ارباب حل وعقد) کے بیعت کر لینے سے منعقد ہوئی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اہل شوکت نے بیعت کر لی تھی اور گو ان سے پہلے خلفاء پر جس طرح لوگ جمع ہوئے تھے ان پر نہ ہو سکے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ارباب حل وعقد کے ان سے بیعت کر لینے کی بنا پر ان کو غلبہ و قوت حاصل تھی اور نص اس بات کو بتلاتا ہے کہ ان کی خلافت خلافت نبوت تھی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت نبوت بتلا رہے ہیں مگر عباسی صاحب ان ہی کے کلام سے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی“ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی تو یہ بتلایا جائے کہ ان کے عہد میں دوسرا جائز خلیفہ کون تھا؟ یا پھر ثابت کیا جائے کہ شرعاً امت کے ذمہ کسی خلیفہ کا نصب کرنا سرے سے غیر ضروری ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وکلام عبدالرحمن بن غنم اشعری فقیہ شام چون ابوہریرہ وابودرداء از نزدیک حضرت مرتضی برگشتند وایشان میانجی بودند میان معاویہ وحضرت مرتضی ومعاویہ

طلب می کرد کہ خلافت بگذار دو شوری گرداند در میان مسلمین" فکان مما قال: لهما عجباً منكما كيف جاز عليكما ما جئتما به تدعوان علياً أن يجعلها شورى وقد علمتما أنه قد بايعه المهاجرون والأنصار وأهل الحجاز والعراق وأن من رضيه خير ممن كرهه ومن بايعه خير ممن لم يبايعه. وأي مدخل لمعاوية في الشورى وهو من الطلقاء[119] الذين لا تجوز لهم الخلافة وهو وأبوه من رؤوس الأحزاب فندما على مسيرهما وتابا منه بين يديه رضي الله تعالى عنهم. أخرجه أبو عمرو في "الاستيعاب". **(ازالۃ الخفاء ص ۱۱)**

اور عبدالرحمن بن غنم اشعری رضی اللہ عنہ فقیہ شام کی وہ گفتگو جو انہوں نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہما سے اس وقت کی تھی جبکہ وہ حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کے پاس سے واپس ہوئے تھے یہ دونوں حضرات حضرت معاویہ و حضرت مرتضی رضی اللہ عنہما کے درمیان بطور قاصد تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو کر انتخاب کا معاملہ شوری کے سپرد کریں۔ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے جو کہا تھا وہ یہ ہے کہ آپ دونوں حضرات پر تعجب ہے۔ اس پیام کا پہنچانا آپ نے اپنے لئے کیسے روا رکھا آپ علی (رضی اللہ عنہ) کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ شوریٰ کے سپرد کر دیں حالانکہ آپ دونوں صاحبان کو معلوم ہے کہ ان سے مہاجرین و انصار اور اہل حجاز و اہل عراق نے بیعت کر لی ہے اور جنہوں نے ان کو پسند کیا وہ ان لوگوں سے کہیں بہتر ہیں جو ان کو پسند نہیں کرتے اور جنہوں نے ان سے بیعت کی وہ ان سے کہیں بہتر ہیں جنہوں نے ان کی بیعت نہ کی اور

119۔ جو لوگ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے اور ان کی جان بخشی کی گئی یہ سب لوگ شروع میں مولفۃ القلوب میں سے تھے بعد کو ان میں سے اکثر وبیشتر پکے مسلمان ہو گئے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار بھی باتفاق اہل علم پکے مسلمانوں میں ہے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کا شوریٰ میں کیا دخل وہ "طلقاء" میں سے ہیں کہ
جن کی خلافت جائز نہیں اور وہ خود اور ان کے باپ جنگ احزاب کے
سرخیل رہ چکے ہیں، یہ سن کر ان دونوں حضرات کو اپنے جانے پر
ندامت ہوئی اور انہوں نے ان کے سامنے اپنے اس فعل سے توبہ کی۔
اس روایت کو ابو عمر و رحمہ اللہ نے "الاستیعاب" میں بیان کی ہے۔

مؤلف "الاستیعاب" کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کی "معتبر کتاب" مانتے ہیں اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سبائی بلوائیوں کی بیعت کا ذکر نہیں بلکہ مہاجرین وانصار کی بیعت کا ذکر ہے اور اس تصریح کے ساتھ ہے کہ "بیعت کرنے والے ان سے کہیں بہتر تھے جنہوں نے بیعت نہ کی۔" مؤلف نے معاملہ اُلٹا کر دیا بیعت کرنے والوں کو سبائی بلوائی، باغی اور قاتل کے خطابات سے نوازا اور بیعت نہ کرنے والوں کو اکابر صحابہ قرار دیا اور پھر ان اکابر صحابہ میں آپ کو صرف دو نام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب سے مل سکے، حالانکہ آپ کے معتمد علیہ ابن خلدون کے یہاں اس سلسلہ میں اور بھی کئی نام مل سکتے تھے مگر یاد رہے کہ یہ سب نام صحیح روایات سے ثابت نہیں بلکہ "تاریخ طبری" میں مجہول اشخاص کے اسناد سے مروی ہیں اور بعد کے لوگوں نے وہیں سے لیکر ان کو نقل کر دیا ہے اس لئے جن اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم یعنی سابقین اولین کے نام اس سلسلہ میں پیش کئے جائیں اسناد صحیح کے ساتھ پیش کئے جائیں۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ بعض اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد میں شرکت نہیں کی تھی ان ہی میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں، اس پر شیعان عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے سرے سے بیعت ہی نہ کی، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔
چنانچہ حافظ ابو بکر بن العربی المتوفی ۵۴۲ھ جو شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کہیں مقدم

ہیں اور جن کا اس باب میں مستند ہونا مؤلف کو بھی اس درجہ تسلیم ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں (صفحہ ۳۰۲، ۳۰۳) ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، اپنی مشہور کتاب "العواصم من القواصم في تحقيق مواقف الصحابة بعد وفاة النبي ﷺ" میں جس کے بارے میں مؤلف کے الفاظ ہیں کہ:

"موصوف نے اپنی اس تالیف میں ان اکاذیب کی پوری قلعی کھولی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مواقف اور مشاجرات کے بارے میں وضع ہوئے۔(ص ۳۰۳)

یوں رقمطراز ہیں:

قالت العثمانية: تخلف عنه من الصحابة، منهم سعد بن ابي وقاص، ومحمد بن مسلمة، وابن عمر، وأسامة بن زيد وسواهم من نظرائهم. قلنا: أما بيعته فلم يتخلف عنها. وأما نصرته فتخلف عنها قوم منهم من ذكرتم، لأنها كانت مسالة اجتهادية، فاجتهد كل واحد وأعمل نظره و أصاب قدره.

(ص 147 طبع مصر)

شیعان عثمانی کا بیان ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت جن میں سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، ابن عمر اور اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہم) اور ان ہی جیسے دوسرے حضرات تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کی بیعت سے تو پیچھے نہیں ہٹے البتہ ان کی نصرت سے کچھ لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے جن میں یہ حضرات بھی ہیں جن کا تم نے نام لیا کیونکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا، ہر ایک نے اجتہاد کیا اور اپنی بصیرت سے کام لیا اور اپنے اندازے کو درست سمجھا۔

اسی مؤلف نے اپنی دوسری مشہور تالیف "احکام القرآن" میں ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف اجتہاد کی حسب ذیل تفصیل دی ہے:۔

(المسألة الخامسة) قوله تعالى: «فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله» أمر الله بالقتال، وهو فرض على الكفاية إذا قام به البعض سقط عن البعض الباقين؛ ولذلك تخلف قوم من الصحابة رضي الله عنهم عن هذه المقامات، كسعد بن أبي وقاص، وعبد الله بن عمر ، ومحمد بن مسلمة. وصوب ذلك علي بن أبي طالب لهم، واعتذر إليه كل واحد منهم بعذر قبله منه. ويروى أن معاوية لما أفضى إليه الأمر عاتب سعداً على ما فعل، وقال له: لم تكن ممن أصلح بين الفئتين حين اقتتلا، ولا ممن قاتل الفئة الباغية؛ فقال له سعد: ندمت على تركي قتال الفئة الباغية. فتبين أنه ليس على الكل درك فيما فعل، وإنما كان تصرفاً بحكم الاجتهاد وإعمالاً بما اقتضاه الشرع.

(أحكام القرآن از ابن العربي، سوره حجرات)

(پانچواں مسئلہ) ارشاد الٰہی ہے: «فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله» **(یعنی باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ کر نہ آئے) اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے قتال کا حکم دیا ہے جو فرض کفایہ ہے، جب بعض اشخاص قتال کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو بقیہ بعض اشخاص سے اس کی فرضیت ساقط ہو جائے گی اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی ایک جماعت جیسے کہ سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہم) اس قسم کے مواقع پر بیٹھ رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس فعل کو درست سمجھا اور ان میں سے بھی ہر**

ایک نے آپ کی خدمت میں اپنی معذرت پیش کی اور آپ نے اس کو قبول فرمالیا، اور یہ بھی مروی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب سلطنت تفویض ہوئی تو آپ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے اس فعل پر عتاب کیا اور ان سے کہا کہ "نہ تو آپ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے دو گروہوں میں اس وقت صلح کرائی جبکہ وہ کشت و خون میں مصروف تھے اور نہ ان ہی میں ہوئے کہ جنہوں نے باغی جماعت سے قتال کیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کو جواب دیا کہ مجھے باغی جماعت سے جنگ نہ کرنے پر ندامت ہے"، واضح ہو گیا کہ ان سب حضرات کے طرز عمل پر کوئی اعتراض نہیں آتا بلکہ جو کچھ ہوا بحکم اجتہاد ہوا اور شرع کے موافق عمل کرنے کے لئے ہوا۔

غرض یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہما) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی تھی اور جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں وہ حقیقت حال سے ناواقف ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے "تلخیص المستدرک" میں (جو محدث حاکم کی کسی بات کو بغیر اصول نقد پر پرکھے صحیح تسلیم نہیں کرتے انہوں نے) ان کے اس قول کو بغیر کسی چوں وچرا کے مان لیا ہے کہ:

وأما قول من زعم أن ابن عمر و أبا مسعود و سعداً و أبا موسى و ابن مسلمة و أسامة قعدوا عن بيعته فقول من يجهل حقيقة الحال. (3/ 115)

اور ان لوگوں کی بات جن کا زعم ہے کہ ابن عمر، ابو مسعود، سعد، ابو موسیٰ اور ابن مسلمہ رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے سے بیٹھ رہے ایسے شخص کی بات ہے جو حقیقت حال سے جاہل ہے۔

اور گو حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) کسی عذر کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ باغیوں سے جہاد نہ کر سکے تاہم ان کو ساری عمر

اپنی اس عدم شرکت کا افسوس رہا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تصریح تو ابھی آپ کی نظر سے گزری اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ اس بارے میں حسب ذیل ہیں:

لم أجدني آسى على شيء إلا أني لم أقاتل الفئة الباغية مع علي.

میں اپنے آپ کو کسی چیز پر افسوس کرتے نہیں پاتا بجز اس کے کہ میں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مل کر باغی جماعت سے جنگ نہ کی۔

حافظ نور الدین ہیثمی "مجمع الزوائد" میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

رواه الطبراني بأسانيد، وأجدها رجاله رجال الصحيح.

(7/ 242 طبع مصر 1353ھ)

طبرانی نے اس کو متعدد اسانید سے روایت کیا ہے جن میں سے ایک کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مسند امام ابو حنیفہ میں بھی مروی ہے،[۱۲۰] جس کو حافظ ابن البر رحمہ اللہ نے بھی اپنی مشہور کتاب "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" میں محدث دار قطنی رحمہ اللہ کی کتاب "المؤتلف والمختلف" سے باسناد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نقل کیا ہے۔[۱۲۱]

ہماری اس بحث سے روز روشن کی طرح صاف اور واضح ہو گیا کہ یہ کہنا محض غلط ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی تھی یا ان کی بیعت باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی۔"

120۔ ملاحظہ ہو "جامع مسانید الامام الاعظم" از محدث خوارزمی ج ۲ ص ۲۹۸ طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن۔

121۔ "الاستیعاب" ج ۲ ص ۴۶۶ طبع دائرۃ المعارف۔

قاتلین عثمان سے قصاص کا مسئلہ

رہا طلب قصاص کا مسئلہ تو اس بارے میں مورخ بلاذری، حافظ ذہبی اور علامہ سیوطی (رحمہم اللہ) تینوں کا متفقہ بیان یہ ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت لیتے ہی اس کی تحقیقات کی، چنانچہ آپ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے دریافت کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ بولیں مجھے کچھ پتہ نہیں، دو شخص اندر آئے تھے جن کو میں صرف ان کے چہرے دیکھ کر پہچان سکتی ہوں، ان کے ساتھ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ بھی تھے، پھر محمد نے جو کچھ کیا تھا وہ سب کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا، آپ نے فوراً محمد کو بلوا کر اس الزام کی تحقیقات کی وہ کہنے لگے انہوں نے غلط نہیں کہا میں اسی ارادہ سے اندر آیا تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب میرے والد کا نام لیا تو میں توبہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا خدا کی قسم نہ میں نے ان کو قتل کیا اور نہ اس غرض سے ان کو پکڑا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے بھی کہا یہ سچ کہتے ہیں مگر یہی ان دونوں کو ساتھ لیکر آئے تھے۔[۱۲۲]

اب اگر ان تینوں مؤرخین کی بیان کردہ مذکورہ روایت صحیح ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ "آپ نے قصاص لینے کی کوئی تدبیر نہیں کی" کس قدر لغو ہے۔ یہاں اس واقعہ کا سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کے اور کوئی شاہد نہیں اور وہ بھی اصل قاتلوں کے بارے میں کچھ نہ بتا سکیں کہ جن سے تفتیش کی جا سکتی

122۔ "انساب الاشراف بلاذری" ۵/۷۰، ۷۱، و "تاریخ الاسلام" ذہبی ۱۳۹/۲ طبع مصر ۱۳۶۸ھ، "تاریخ الخلفاء" سیوطی، ص ۱۳، ۱۴ طبع مجتبائی دہلی۔

ہے، محمد بن ابی بکر وہ قسم کھا کر اپنی براءت ظاہر کرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ بھی ان کی تصدیق کرتی ہیں پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ زبردستی قصاص میں کس کو قتل کردیتے، ثانیاً یہ کہ شرعاً عورتوں کی گواہی حدود و قصاص میں معتبر نہیں اور وہ بھی خاص طور سے بیوی کی اپنے شوہر کے حق میں۔ہاں طالبین قصاص کا یہ فرض تھا کہ وہ جن کو قاتل سمجھتے تھے ان کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں حاضر ہو کر مرافعہ کرتے اور اُس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قاتلین سے قصاص نہ لیتے تو ایک بات تھی شہادت بہم پہنچاتے لیکن ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خود حضرت امیر المؤمنین کے خلاف بغاوت کردی جس کا انسداد ضروری تھا۔حافظ ابو بکر بن العربی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے:

وأما الصواب فيه فمع علي، لأن الطالب للدم لا يصح أن يحكم، وتهمة الطالب للقاضي لا توجب عليه أن يخرج عليه، بل يطلب الحق عنده، فإن ظهر له قضاء وإلا سكت وصبر، فكم من حق يحكم الله فيه. وإن لم يكن له دين فحينئذ يخرج عليه ، فيقوم له عذر في الدنيا.

(العواصم من القواصم ص164)

لیکن حق سو اس بارے میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ہے کیونکہ طالب قصاص کے لئے خود حاکم بننا صحیح نہیں اور مدعی کے قاضی کو متہم سمجھنے سے اس پر یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ وہ قاضی کے خلاف خروج کردے بلکہ اس کو تو قاضی سے اپنا حق مانگنا چاہیے اب اگر اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا تو بہتر ورنہ خاموش رہے اور صبر کرے کیونکہ بہت سے حق ایسے بھی تو ہیں کہ جن کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا، ہاں اگر اسے دین کا پاس نہ ہو تو شوق سے قاضی کے خلاف

خروج کر دے اس صورت میں دنیا کے اندر تو اسے اپنے لئے بہانہ مل ہی جائے گا۔

اس کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں:

وأي كلام كان يكون لعلي -لما تمت له البيعة- لو حضر عنده ولي عثمان وقال له: إن الخليفة قد تمالأ عليه ألف نسمة حتى قتلوه، وهم معلومون. ماذا كان يقول إلا: اثبت، وخذ، وفي يوم كان يثبت إلا أن يثبتوا هم أن عثمان كان مستحقاً للقتل وبالله لتعلمن يا معشر المسلمين أنه ما كان يثبت على عثمان ظلم أبداً، وكان يكون الوقت أمكن للطالب، وأرفق في الحال، أيسر وصولاً إلى المطلوب.

والذي يكشف الغطاء في ذلك أن معاوية لما صار إليه الأمر لم يمكنه أن يقتل من قتلة عثمان أحداً إلا بحكم، إلا من قتل في حرب بتأويل، أو دس عليه فيما يقال. حتى انتهى الأمر إلى زمن الحجاج، وهم يقتلون بالتهمة لا بالحقيقة فتبين لكم أنهم ما كانوا في ملكهم يفعلون ما أصبحوا له يطلبون. (ص ١٦٧، ١٦٨)

اور جس وقت کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت مکمل ہوئی تھی[۱۲۳] اگر ولی عثمان رضی اللہ عنہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسی وقت ان سے یہ کہتا کہ خلیفہ پر ایک ہزار آدمی مل کر چڑھ آئے یہاں تک کہ ان کو قتل کر ڈالا اور وہ سب معلوم ہیں تو علی رضی اللہ

123۔ یہاں سے عباسی کے اس دعوی کی تردید ہوتی ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بیعت خلافت مکمل نہ ہو سکی" یہ واضح رہے کہ قاضی ابو بکر بن العربی رحمہ اللہ ان کے خاص الخاص معتمد علیہ ہیں۔

عنہ کو اس صورت میں کیا کلام ہوتا وہ اس کے سوا کیا کہتے کہ ثابت کرتے جاؤ اور قصاص لیتے جاؤ، اور یہ سب کچھ ایک روز میں ثابت ہو سکتا تھا، بجز اس کے کہ مدعا علیہم یہ ثابت کرتے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کے مستحق تھے۔ اور اے مسلمانوں! بخدا تم جانتے ہو کہ عثمان رضی اللہ عنہ پر کبھی ظلم ثابت نہ ہو سکتا تھا اور یہ وقت طالب قصاص کے لئے قاتلوں پر قابو پانے کا بڑا اچھا موقع اور حالات کے لحاظ سے نہایت مناسب اور حصول مقصود کے لئے بہت آسان ہوتا۔

اور جو چیز اس بارے میں حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امارت مل گئی تو ان کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہو سکا کہ بغیر فیصلہ قاضی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے کسی کو قتل کرتے، ہاں جو جنگ میں تاویل کی بنا پر قتل ہو گیا یا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کو دھوکہ سے ختم کر دیا گیا وہ اور بات ہے یہاں تک کے حجاج کے عہد تک معاملہ پہنچا اور اب تو یہ لوگ بغیر کسی حقیقت کے تہمت پر قتل کر دیتے تھے۔ اس سے آپ کو واضح ہو گیا ہو گا کہ جس بات کا یہ لوگ مطالبہ کر رہے تھے اپنی سلطنت میں اس پر کاربند نہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحقیق و تفتیش میں تو اصل قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا اور ظاہر ہے کہ وہ بغیر ثبوت شرعی کسی کو قصاص میں قتل نہیں کر سکتے تھے، تاہم طالبین قصاص سے ہمیشہ ان کا یہ مطالبہ رہا کہ حکم شرع کے بموجب ولی الدم دعویٰ دائر کرے اور قاتل کے خلاف ثبوت بہم پہنچا دے وہ قاتل کو قصاص کے لئے اس کے حوالہ کر دیں گے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں رقمطراز ہیں:

وذلك أن علياً كان إذ ذاك إمام المسلمين وأفضلهم يومئذ باتفاق أهل السنة، ولأن أهل الحل والعقد بايعوه بعد قتل

عثمان، وتخلف عن بيعته معاوية في أهل الشام ثم خرج طلحة والزبير ومعهما عائشة إلى العراق فدعوا الناس إلى طلب قتلة عثمان، لأن الكثير منهم انضموا إلى عسكر علي فخرج علي إليهم فراسلوه في ذلك فأبى أن يدفعهم إليهم إلا بعد قيام دعوى من ولي الدم وثبوت ذلك على من باشره بنفسه. (باب علامات النبوة في الإسلام)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بر سر حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے امام اور ان سب میں افضل تھے، ان سے اہل حل و عقد نے بیعت کرلی تھی، [۱۲۴] معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل شام کے ساتھ ان کی بیعت سے گریز کیا، پھر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رضی اللہ عنہما) جن کے ساتھ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) بھی تھیں عراق کو چلے اور لوگوں کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کی دعوت دی کیونکہ ان میں سے بہت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا شامل ہوئے تھے، اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان کی طرف چلے، پھر ان حضرات نے قاتلین کے بارے میں ان سے مراسلت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے سپرد کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ولی الدم کے دعوی دائر کرنے اور خاص قاتل کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کے بعد ایسا کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں وہی کیا جو ایک خلیفہ عادل کو کرنا چاہیے تھا، خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس سے پہلے مروان کے بارے میں یہی کیا تھا، بغیر ثبوت فراہم ہوئے محض تہمت کی بنا پر کسی کو ماخوذ نہیں

124۔ یہاں سے مؤلف کے اس دعوی کی تردید ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہل حل و عقد نے بیعت نہ کی تھی۔

کیا جا سکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہی مطالبہ تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

وعلي يقول ادخل فيما دخل فيه الناس وحاكمهم إليّ أحكم فيهم بالحق. (فتح الباری، باب قتل الخوارج والملحدين)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (معاویہ رضی اللہ عنہ سے) یہ فرماتے تھے کہ جس طرح دوسرے لوگ داخل بیعت ہیں تم بھی بیعت کر لو میرے پاس قاتلوں کے بارے میں دعوی دائر کرو میں حق کے مطابق ان کا فیصلہ کروں گا۔

اور "صحیح بخاری" کے مشہور شارح علامہ ابن بطال رحمہ اللہ اسی کتاب کے دوسرے قدیم شارح محدث مہلب رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

وكان علي ينتظر من أولياء عثمان أن يتحاكموا إليه فإذا ثبت على أحد بعينه أنه ممن قتل عثمان اقتص منه. (فتح الباری، كتاب الفتن بحث حديث لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة)

حضرت علی رضی اللہ عنہ منتظر تھے کہ اولیاء عثمان رضی اللہ عنہ ان کے یہاں دعویٰ دائر کریں اور جب کسی شخص کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں سے ہے تو اس سے قصاص لیا جائے۔

یہ مہلب رحمہ اللہ وہی ہیں جن سے مؤلف نے غزوہ قسطنطنیہ والی حدیث میں یزید کی منقبت کے لئے سند پکڑی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "فتح الباری" میں اس سلسلہ میں شام کے مشہور تابعی ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ (جن کا شمار زہاد تابعین میں ہے ان) کی وہ گفتگو بھی نقل کی ہے جو خاص اس مسئلہ پر ان کے اور حضرت معاویہ و علی (رضی اللہ عنہما) کے مابین ہوئی تھی، یہ مکالمہ حسب ذیل ہے:

ابو مسلم: (معاویہ رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے) تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت پر جھگڑ رہے ہو کیا تم ان کے برابر ہو؟

معاویہ: نہیں، میں بھی جانتا ہوں وہ مجھ سے افضل ہیں اور خلافت کے سب سے زیادہ حقدار، لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ظلماً شہید کئے گئے ہیں ان کا ابن عم اور ولی ہوں اور قصاص چاہتا ہوں۔ تم علی رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر کہو وہ قاتلوں کو ہمارے حوالے کریں۔

ابو مسلم رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر معاویہ رضی اللہ عنہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں:

يدخل في البيعة ويحاكمهم اليّ.

وہ بیعت میں داخل ہو جائیں اور ان کے بارے میں مجھ سے داد خواہی کریں۔

لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ روایت کتاب "صفین" سے نقل کی ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے مشہور شیخ یحییٰ بن سلیمان رحمہ اللہ کی تالیف ہے۔ حافظ صاحب موصوف رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید بتایا ہے۔[۱۲۵]

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اگر قاتلین سے مراد وہ اشخاص ہیں جنہوں نے براہ راست اس حرکت شنیعہ کا ارتکاب کیا تھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ ان کا پتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لگ سکا نہ اولیاء عثمان رضی اللہ عنہ کو، پھر قصاص کس سے لیا جاتا؟

یہ گنتی کے دو چار تھے جو چوروں کی طرح دبے پاؤں آئے اور اپنا کام کر کے چلے گئے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ "منہاج السنہ" میں لکھتے ہیں:

125۔ ملاحظہ ہو فتح الباری کتاب الفتن بحث حدیث لاتقوم الساعة حتى تقتل فئتان عظيمتان۔

فإنه لم يقتله إلا طائفة قليلة باغية ظالمة قال ابن الزبير لعنت قتلة عثمان خرجوا عليه كاللصوص من وراء القرية فقتلهم الله كل قتلة ونجا من نجا منهم تحت بطون الكواكب يعني هربوا ليلاً. (ج 3 ص 206)

بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک چھوٹی سی باغی اور ظالم پارٹی نے قتل کیا تھا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر خدا کی لعنت ہو کمبخت آبادی کے باہر سے چوروں کی طرح ان پر گھس آئے پھر اللہ نے ان کو ہر طرح قتل کیا اور جو ان میں سے بچا وہ تاروں کی چھاؤں میں بچا (یعنی رات کے اندھیرے میں بھاگ لئے)۔

یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے جو خود موقع واردات پر موجود تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حویلی پر جو لوگ پہرہ دے رہے تھے ان کے افسر یہی تھے۔[۱۲۶] ان کے بیان سے پتہ چلا کہ بعض قاتل عین موقع پر قتل کر دیئے گئے تھے اور جو بچے وہ رات کے سناٹے میں نکل گئے۔ پھر ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

اور اگر قاتلین سے مراد وہ پوری جماعت ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اس وقت آواز اُٹھائی تھی اور ان کا محاصرہ کیا تھا یا محاصرہ کرنے والوں کا ساتھ دیا تھا تو بقول حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وہ اتنی بڑی جماعت تھی کہ اس سے قصاص لینا نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بس کی بات تھی[۱۲۷] اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تو پھر بھی عذر کیا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں کی

126۔ ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام از حافظ ذہبی رحمہ اللہ، ج ۲ ص ۱۳۵۔

127۔ خود مؤلف کی تصریح ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ باغیوں کی جماعت = =پر ہمیں قدرت حاصل نہیں بلکہ ان کو اس وقت غلبہ ہے۔" (ص ۷)

بغاوت سے مجبور تھے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیس سالہ دور امارت میں بھی ان قاتلوں سے قصاص نہ لے سکے حالانکہ ان پر اجتماع عام تھا اور ان کے خلاف ذرا شورش نہ تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

لم يكن علي مع تفرق الناس عليه متمكنا من قتل قتلة عثمان إلا بفتنة تزيد الأمر شراً وبلاء ودفع أفسد الفاسدين بالتزام أدناهما أولى من العكس لأنهم كانوا عسكراً وكان لهم قبائل تغضب لهم والمباشر منهم للقتل وإن كان قليلاً فكان ردؤهم أهل الشوكة ولولا ذلك لم يتمكنوا ولما سار طلحة والزبير إلى البصرة ليقتلوا قتلة عثمان قام بسبب ذلك حرب قتل فيها خلق ومما يبين ذلك أن معاوية قد أجمع الناس عليه بعد موت علي وصار أميراً على جميع المسلمين ومع هذا فلم يقتل قتلة عثمان الذين كانوا قد بقوا بل روي عنه أنه لما قدم المدينة حاجاً فسمع الصوت في دار عثمان يا أمير المؤمنيناه! يا أمير المؤمنيناه! فقال ما هذا؟ قالوا بنت عثمان تندب عثمان فصرف الناس ثم ذهب إليهم فقال يا ابنة عم إن الناس قد بذلوا لنا الطاعة على كره وبذلنا لهم حلماً على غيظ فإن رددنا حلمنا ردوا طاعتهم ولأن تكوني بنت أمير المؤمنين خير من أن تكوني واحدة من عرض الناس فلا أسمعنك بعد اليوم ذكرت عثمان.

لوگوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کے باعث ان کو اتنی قدرت نہ تھی کہ بغیر کسی ایسے فتنہ کے سر اٹھائے کہ جس سے معاملہ میں مزید خرابی اور مصیبت پیدا ہو وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر سکیں، اور دو خرابیوں میں سے اولیٰ کو برداشت کر کے بڑی کو

دفع کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے برعکس کیا جائے۔ وہ یہ تھی کہ وہ لشکر کا لشکر تھا ان کے قبائل تھے جو ان کی حمایت میں بھڑک اُٹھے تھے اور قتل کے اصل مرتکب تھوڑے سے تھے لیکن ان کے معاونین شان و شکوہ رکھتے تھے ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی وہ ایسا کر ہی نہ پاتے، چنانچہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ جب قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی غرض سے بصرہ پہنچے تو اس سبب سے ایسی جنگ ہوئی کہ اس میں ایک خلقت قتل ہو گئی۔ اور اس امر کو یہ چیز بھی واضح کرتی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد لوگوں کا اجتماع ہو گیا تھا اور وہ سب مسلمانوں پر امیر بن گئے تھے، تاہم انہوں نے ان قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو جو باغی تھے قتل نہیں کیا بلکہ ان سے مروی ہے کہ جب وہ حج کے سلسلہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے ان کو یہ صدا سنائی دی: "ہائے امیر المؤمنین! ہائے امیر المؤمنین!" آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اپنے والد کو روتی ہیں، آپ لوگوں کو ہٹا کر ان کے پاس پہنچے اور کہنے لگے "اے دخترِ عم! لوگوں نے ناپسندیدگی سے ہمارے ساتھ اطاعت کا معاملہ کیا ہے اور ہم نے غصہ کو دباتے ہوئے ان کے ساتھ حلم کا۔ اب اگر ہم اپنے حکم کو واپس لے لیں گے تو وہ اپنی اطاعت کو واپس لے لیں گے، تم اگر امیر المؤمنین کی صاحبزادی ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ عام آدمیوں میں ایک تم بھی ہو، دیکھو آج کے بعد پھر میں تمہیں عثمان کا اس طرح ذکر کرتے نہ سنوں۔"

اگرچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ توجیہ بہت سے علماء کو پسند ہے اور وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لینے کی اصل وجہ اس بارے میں حضرت علی رضی

اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجبوری ہی کو قرار دیتے ہیں مگر ہمارے نزدیک جنگ صفین کے نبرد آزماؤں کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں بلکہ اس کی اصلی وجہ مسئلہ کی شرعی صورت ہے کہ اصل قاتل معلوم نہ تھے جن پر قصاص جاری ہوتا۔ باقی لوگوں کی حیثیت باغیوں سے زیادہ نہ تھی اور باغی جب اطاعت قبول کر لیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مشہور معاصر امام ابوالبرکات حافظ الدین نسفی رحمہ اللہ مصنف ''کنز الدقائق'' نے جو بڑے پایہ کے فقیہ اور متکلم گزرے ہیں اپنی کتاب ''الاعتماد شرح عمدۃ'' میں ان باغیوں سے قصاص نہ لینے کی یہی وجہ لکھی ہے۔[۱۲۸]

اور علامہ سعد الدین تفتازانی رحمہ اللہ نے ''شرح مقاصد'' میں اور محقق کمال الدین بن الہمام رحمہ اللہ نے ''السائرة في العقائد المنجية'' میں دوسری توجیہ اس سلسلہ میں یہی بیان کی ہے۔[۱۲۹]

مؤلف بھی بلوائیوں کو باغی مانتے ہیں یہ بھی ان کی تصریح ہے کہ:

''خون عثمان رضی اللہ عنہ کا مسئلہ ثالثی کے سپرد ہو گیا۔'' (ص ۱۱)

ثالثی کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

''کوئی ثالث بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے خلیفہ راشد کو ظلماً قتل کیا، نظام خلافت کی بے حرمتی کا ارتکاب کیا سیاست ملیہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی مستولی رہیں..... ثالثوں نے اتفاق رائے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب خلافت سے

128۔ ملاحظہ ہو ''اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیاء علوم الدین'' از سید مرتضی زبیدی بلگرامی بحث امامت۔

129۔ دونوں کتابوں میں بحث امامت ملاحظہ ہو۔

معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورہ پر منحصر کیا۔"(ص ۱۲)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بقول مؤلف حضرت علی رضی اللہ عنہ تو معزول ہو چکے تھے پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں کیا کارروائی کی جبکہ قصاص کا مسئلہ بجنسہ موجود تھا، اور ان کی ساری لڑائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی مسئلہ پر تھی، خاص طور پر جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی ان کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے اور ان پر اتفاق عام ہو گیا تھا، پھر حسب تصریح حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی نے جو حقیقت میں ولی الدم تھی اس مطالبہ کو ان کے سامنے بھی رکھا تھا، لہٰذا جناب مؤلف اس بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کیا عذر پیش کریں گے؟

ہماری اس تفصیل سے ناظرین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ قصاص ذی النورین رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا محض بے جا ہے، وہ خلیفہ عادل تھے اور انہوں نے اس مسئلہ میں وہی کیا جو شرعاً ان کو کرنا چاہیے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف اس بارے میں اس قدر واضح اور صاف ہے کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس سلسلہ میں ان کی اتباع کے علاوہ دوسرا راستہ نہ مل سکا، لہٰذا مؤلف نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"دوسرے مسلمانوں کا جن میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت شامل تھی یہ قول تھا کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کی بیعت ہماری گردنوں میں ہے، ان کی وفات طبعی نہیں ہوئی اور نہ وہ آخر وقت تک خلافت سے دستبردار ہوئے، ظلم و تعدی سے انہیں اچانک شہید کر دیا گیا۔ ہم علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تسلیم کر لیں گے بشرطیکہ وہ باغیوں اور قاتلوں سے تبرا کریں اور ہمارے ساتھ ہو کر

قصاص لیں، نظام خلافت کی حرمت ہر گز باقی نہیں رہ سکتی اگر قاتلین کو بغیر قصاص لئے چھوڑ دیا جائے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں سامعین سے کہا تھا:

وإن تركتم (أعني قصاص) لم يقم لكم سلطان ولم يكن لكم نظام.

(الخطب ص 137، طبری ۵/ 175 جمرہ)

اگر قصاص لینا تم نے ترک کر دیا تو پھر نہ تمہارے لئے حکومت قائم رہ سکتی ہے اور نہ نظام حکومت۔" (ص ۷،٦)

بے شک ترکِ قصاص سے نظام حکومت قائم نہیں رہ سکتا، لیکن اگر ہر شخص اپنے طور پر طلب قصاص کے لئے اُٹھ کھڑا ہو تو اس سے بھی نظام حکومت باقی نہیں رہے گا، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طالبین قصاص کے بصرہ جانے کی خبر سن کر فرمایا تھا کہ:

إن فعلوا هذا فقد انقطع نظام المسلمين.

(تاریخ طبری 3/ 366 طبع مصر)

اگر ان حضرات نے ایسا کیا تو مسلمانوں کا نظام ٹوٹ جائے گا۔

پھر جیسا کہ سابق میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے حوالہ سے گزرا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاتلین کے سپرد کر دینے سے کب انکار تھا البتہ وہ یہ کہتے تھے کہ حکم شرع کے موافق قاتل کے خلاف ولیِ قصاص دعوی دائر کر کے ثبوت قتل فراہم کر دے۔

رہا قاتلون اور باغیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تبرا کرنا تو وہ بتواتر ان سے ثابت ہے، سب کے سامنے انہوں نے جمل و صفین کے میدانوں تک میں علی الاعلان قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کی ہے۔ چنانچہ خود "تاریخ طبری" (ج ۳ ص ۵۲۳) میں مذکور ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر سے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کا شور اٹھا اور ان کے لئے بد دعا کی صدائیں بلند ہوئیں تو

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بے ساختہ ہاتھ اٹھا دیئے اور دربار الٰہی میں اس طرح عرض رسا ہوئے:

اللّٰهم العن قتلة عثمان و أشياعهم.

اے اللہ! قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان وانصار پر لعنت کر۔

اسی طرح حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ "منہاج السنۃ" میں لکھتے ہیں:۔

وروي عنه أنه سمع أصحاب معاوية يلعنون قتلة عثمان فقال اللهم العن قتلة عثمان في البر والبحر والسهل والجبل.

(ج 2 ص 209)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لوگوں کو سنا کہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کر رہے ہیں تو آپ کی زبان سے بھی یہی الفاظ نکلے کہ اے اللہ! قاتلین عثمان پر لعنت کر خشکی میں، تری میں، میدانوں میں، پہاڑوں میں (جہاں بھی ہوں)۔

بلکہ خود مؤلف نے ایک مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو گشتی مراسلہ نقل کیا ہے اس کے الفاظ ہیں:

الأمر واحد إلا ما اختلفنا فيه من دم عثمان ونحن منه برآء.

(ہمارا اور اہل شام کا) معاملہ واحد ہے سوائے اس کے کہ ہم میں اور ان میں خون عثمان رضی اللہ عنہ کی بابت اختلاف ہوا اور ہم اس سے بری تھے۔

یہ مراسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام ممالک محروسہ میں بھیجا تھا جس میں انہوں نے صراحت کے ساتھ خون عثمان رضی اللہ عنہ سے اپنی براءت کا اظہار فرمایا ہے۔

اور جو مؤلف نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام سے ایک عجیب بات نقل کی ہے کہ "ان کا قول تھا کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کی بیعت ہماری گردنوں میں ہے۔

الخ'' (ص٦) تو ان کو چاہیے کہ اسناد صحیح سے دو چار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم [١٣٠] کا یہ قول بتائیں اور پھر کتاب و سنت کی روشنی میں اس کو ثابت کریں کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کی بیعت اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، یہ بھی فرمائیں کہ اس بیعت کا بقا کب تک رہتا ہے اور اس کے حدود کیا کیا ہیں، امت میں کونسا مشہور عالم اس طرف گیا ہے، عقائد و کلام یا فقہ و حدیث کی کس کتاب میں یہ مسئلہ مذکور ہے؟ اگر خلیفہ شہید کی شہادت کے بعد فوراً آکر اپنے وقت کے کسی دوسرے افضل و صالح ترین شخص کا انتخاب خلافت کے لئے عمل میں آجائے اور اس سے بیعت کر لی جائے تو وہ کیوں خلیفہ نہیں ہو سکتا اور اس کی اطاعت کیوں لازم نہیں ہوتی؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کو ختم کرنے سے پہلے خود مروان کا بیان اس سلسلہ میں نقل کر دیا جائے جس سے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنی امیہ کا اصلی مؤقف واضح ہو جاتا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ''تاریخ الاسلام'' میں رقمطراز ہیں:

وروي عمر بن علي بن الحسين، عن أبيه قال: قال مروان: ما كان في القوم أدفع عن صاحبنا من صاحبكم يعني علياً عن عثمان، قال: فقلت: ما بالكم تسبونه على المنابر قال: لا يستقيم الأمر إلا بذلك. رواه ابن أبي خيثمة. بإسناد قوي. (ج 2/ ص 139)

عمر بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہ اپنے باپ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی زبانی راوی ہیں کہ مروان نے (ایک بار مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے) کہا ہمارے صاحب کی طرف سے تمہارے صاحب

130۔ طبری نے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں جو روایت کی ہے اولاً تو اس کی اسناد صحیح نہیں، دوسرے اس کا وہ مطلب نہیں جو مؤلف نے سمجھا ہے۔

سے زیادہ دفاع کرنے والا یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا۔ زین العابدین رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس پر میں نے اس سے کہا کہ پھر تم لوگ ان کو منبروں پر کیوں گالیاں دیتے ہو؟ کہنے لگا اس لئے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا،[131] اس روایت کو ابن ابی خیثمہ نے باسناد قوی نقل کیا ہے۔

کیا حضرت علی کے زمانے میں کوئی جہاد نہیں ہوا؟

اس بارے میں مؤلف کی تحقیقات حسب ذیل ہیں، فرماتے ہیں:

"نتیجہ یہ ہوا کہ بخلاف حضرات خلفائے ثلاثہ جن کی بیعت پر تمام

131۔ بعض خلفاء بنی امیہ کا یہ حال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بے قصور جانتے ہوئے بھی محض ذاتی مفاد کی خاطر علی الاعلان منبروں پر ان کا نام لے لے کر مجمع عام میں ان پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل جو امام ہدیٰ تھے خود مؤلف کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> "لیکن خدائے بزرگ و برتر کو ملت اسلام کی بہتری مقصود تھی اور امت کو تباہی سے بچانا تھا کہ بالآخر مصلحین کی مساعی جمیلہ سے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کا مسئلہ ثالثی کے سپرد ہو گیا اور دشمنانِ اسلام کے عزائم کا سدہ بروئے کار نہ آسکے۔ انہوں نے اپنی ناکامی سے اہل شام پر سبّ و شتم کا آغاز کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ صرف ان کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی بلکہ گشتی مراسلہ اپنے زیر حکومت علاقہ کے لوگوں کو بھیجا جس میں واضح طور سے بتایا ہے کہ اہل شام سے جو اختلاف تھا وہ خونِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مسئلہ میں تھا ورنہ ہم اور وہ ایک ہی دین کے پیرو ہیں۔" (ص ۱۱)

یہی وہ مراسلہ ہے جس کے آخیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خونِ عثمان رضی اللہ عنہ سے اپنی براءت کا اظہار فرمایا ہے۔

امت مجتمع تھی، اتفاق واتحاد تھا، کفار کے مقابلہ میں جہادی سرگرمیاں تھیں، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہ کوئی جہاد ہوا، نہ کوئی ملک وشہر فتح ہوا، نہ ملت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی، آپس ہی میں تلواریں چلتی رہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منہاج السنۃ'' میں ایک موقع پر لکھا ہے:

فإن الثلاثة اجتمعت الأمة عليهم فحصل بهم مقصود الإمامة وقوتل بهم الكفار وفتحت بهم الأمصار وخلافة علي لم يقاتل فيها كفار ولا فتح مصر وإنما كان السيف بين أهل القبلة (ج 1 ص 145)

یعنی تینوں خلفاء[132] نے امت کو اپنے اوپر مجتمع کر لیا تھا اور اس طرح انہیں امامت کا مقصد حاصل ہو گیا تھا اور اس امارت کے مسلم ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے کفار پر جہاد کیا اور شہروں کو اپنے اقتدار کے تحت لے آئے اور علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں نہ کفار سے جہاد ہوا اور نہ شہر فتح ہوئے اس دور میں تلوار اہل قبلہ میں آپس میں چلتی رہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس افسوسناک حالت کا بیان تفصیل سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد بالکلیہ منقطع ہو گیا، افتراق کلمہ مسلمین ظہور میں آیا اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ:

''ہر روز دائرہ سلطنت اولاسیما بعد تحکیم تنگ ترشدن گرفت تا آنکہ

132۔ مؤلف نے ترجمہ بے ڈھنگا کیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے

''کیونکہ تینوں خلفاء پر امت جمع ہوئی اور ان سے امامت کا مقصد حاصل ہوا، ان کی بدولت کفار سے جہاد کیا گیا اور ان کے ذریعہ شہروں کو فتح کیا گیا۔''

شاید مؤلف کا منشا اس ترجمہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تعریض ہو کہ وہ لوگوں کو اپنے اوپر جمع نہ کر سکے اس لئے ان کی امارت مسلم نہ ہوئی۔

در آخر بجز کوفہ وماحول آن برائے ایشان صافی نماند۔"

(ازالۃ الخفاء ۱/۱۲۳)

یعنی ان کی سلطنت کا دائرہ ہر روز خاص کر ثالثی کے بعد زیادہ تنگ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر میں سوائے کوفہ اور اس کے آس پاس کے اور کچھ ان کے لئے باقی نہ رہا۔[۱۳۳]

مسلمانوں کی خانہ جنگی سے دشمنانِ اسلام نے فائدہ اٹھانا چاہا۔

لم يظهر في خلافته دين الإسلام بل وقعت الفتنة بين أهله وطمع فيهم عدوهم من الكفار و النصاري والمجوس بالشام والمشرق. (منهاج السنة 2/ 138)

یعنی ان کی (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی) خلافت میں دین اسلام کو شوکت نہ ہوئی بلکہ اہل اسلام میں فتنہ واقع ہوا اور شام و مشرق (یعنی ایران وغیرہ) کے کفار و نصاریٰ اور مجوسیوں کو جو (مسلمانوں کے) دشمن ہیں ان کے (مسلمانوں کے) تباہ کرنے کی طمع پیدا ہوئی۔[۱۳۴]

133۔ "صافی" کا ترجمہ "صاف" ہے نہ کہ "باقی"۔ چونکہ دوسرے صوبوں پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تاخت کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے وہاں کی فضا خطرہ سے خالی نہ تھی، برخلاف کوفہ اور اس کے ماحول کے کہ یہاں فضا صاف تھی اور حملہ کا اندیشہ نہ تھا۔ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ شام پر حملہ کرنے کی طمع شاہ روم کو ہوئی تھی نہ کہ نصاری شام کو وہ تو ذمی تھے ان میں شام پر حملہ آور ہونے کی کیا سکت تھی۔

134۔ ہمیں معلوم نہیں مؤلف کی علمی استعداد کیسی ہے مگر وہ فارسی، عربی عبارتوں کے ترجمہ میں اکثر غلطیاں کرتے ہیں، اب اگر ان کو عربی، فارسی میں دسترس نہیں تو اس سے بڑا کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے باایں ہمہ کم مائیگی ایسے اہم علمی موضوع پر قلم اٹھانے کی جرات کی اور اگر واقعی ان کو ان دونوں زبانوں میں مہارت ہے تو پھر غلط ترجمہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ فارسی عبارتوں کے ترجمہ میں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دیدہ و دانستہ عبارت کو اپنے مفید مطلب بنانے کے لئے غلط ترجمہ کیا ہے، لیکن عربی عبارتوں کے ترجمہ میں بیشتر مقامات=

تو یہ بات پیش نظر رہے کہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب "منہاج السنہ" جس کا مؤلف یہاں حوالہ دے رہے ہیں، شیعہ امامیہ کی تردید میں ہے، حسین بن یوسف بن المطہر حلی رافضی المتوفی ۷۲۶ھ نے اپنے مذہب کے اثبات میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے "منها الكرامة في إثبات الإمامة" یہ کتاب ائمہ اثنا عشر کی امامت کے ثبوت اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے ابطال میں ہے۔ شیخ نے اس کی تردید میں ایک نہایت مبسوط کتاب سپرد قلم فرمائی جس کا نام ہے "منهاج السنة النبوية في نقص كلام الشيعة و القدرية" یہ کتاب اگرچہ موضوع پر نہایت جامع اور بے نظیر ہے تاہم بعض جگہ شیخ کا قدم جادۂ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ "لسان المیزان" میں اس کتاب کی بابت لکھتے ہیں:

> طالعت الرد المذكور فوجدته كما قال السبكي في الاستيفاء لكن وجدته كثير التحامل إلى الغاية في رد الأحاديث التي يوردها بن المطهر وان كان معظم ذلك من الموضوعات والواهيات لكنه رد في رده كثيراً من الأحاديث الجياد التي لم يستحضر حالة التصنيف مظانها لأنه كان لاتساعه في الحفظ يتكل على ما في صدره والإنسان عامل للنسيان وكم

=پر غلط ترجمہ کی وجہ سے خود ان کی مطلب برآری بھی نہیں ہوتی پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی غلط ترجمہ کرنے کی کیا توجیہ کی جائے۔ چنانچہ یہاں پر جو انہوں نے عبارت کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

> "شام و مشرق کے کفار و نصاری اور مجوسیوں کے جو دشمن ہیں ان کے تباہ کرنے کی طمع پیدا ہوئی۔"

صحیح نہیں اس کا مطلب تو بظاہر یہ ہے کہ خود شام کے نصاری کو مسلمانوں کے تباہ کرنے کی طمع پیدا ہوئی، حالانکہ عبارت کا یہ ترجمہ نہیں اور نہ تاریخ اس کا ساتھ دیتی ہے بلکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ

> "شام میں اور مشرق میں مسلمانوں کے متعلق ان کے دشمن کفار نصاری اور مجوس کو طمع پیدا ہوئی۔"

من مبالغة لتوهين كلام الرافضي ادته أحيانا إلى تنقيص علي رضى الله تعالى عنه.

وهذه الترجمة لا تحتمل إيضاح ذلك وإيراد أمثلته.

(٦/ ٣١٩،٣٢٠)

میں نے اس ردّ مذکور کا مطالعہ کیا اور جیسا کہ سبکی رحمہ اللہ کا بیان ہے اس کو مکمل ردّ پایا۔ لیکن میں نے ان کو یہ دیکھا کہ وہ احادیث کے رد کرنے میں جن کو ابن المطہر بیان کرتا ہے حد درجہ ناانصافی سے کام لیتے ہیں اور گو بیشتر یہ روایات موضوعات ہی ہیں لیکن انہوں نے اس کی تردید میں بہت سی ان جید حدیثوں کو بھی رد کر دیا ہے جن کے حوالے ان کو تصنیف کے وقت مستحضر نہ تھے کیونکہ وہ اپنی وسعت حافظہ کی بنا پر اپنی یاد داشت پر اعتماد کر لیا کرتے تھے اور انسان سے نسیان ہوتا ہی ہے۔ نیز بہت سی جگہ کلام رافضی کو بودا ثابت کرنے میں ان کی مبالغہ آرائی نے ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص تک پہنچا دیا ہے۔

اور یہ تذکرہ اس بات کی وضاحت اور اس کی امثلہ بیان کرنے کا متحمل نہیں ہے۔

اگرچہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص نہیں ہے تاہم بعض ان مقامات پر جہاں ان کو الزامی جوابات دینے پڑے ہیں کہیں کہیں ایسی صورت پیش آگئی ہے چونکہ مقابلہ روافض سے ہے اور ان کے یہاں عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کرنا دین و ایمان میں داخل ہے اس لئے بعض جگہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا دفاع کرتے ہوئے شیخ کو یہ دکھلانا پڑا ہے کہ اگر تم ان حضرات پر طعن کر سکتے ہو تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس سے نہیں بچ سکتے، دیکھو ان پر بھی یہ یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں یہی صورت

"ازالۃ الخفاء" وغیرہ میں تفضیل کی بحث میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کو پیش آئی ہے، ہمارے بے لاگ محقق کو بمقتضائے طبع ان دونوں حضرات کی وہی عبارتیں پسند آئیں جو الزامی جوابات کے سلسلہ میں ان کے قلم سے نکلی ہیں اور جن سے ایک گونہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص ہوتی ہے۔

یہاں حسب ذیل امور قابل بحث ہیں:

اول: یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو نقشہ مؤلف نے کھینچا ہے وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں صحیح ہے یا نہیں؟

دوسرے: یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ بحیثیت ایک خلیفہ راشد کے درست تھا یا نہیں؟

تیسرے: یہ کہ ان حالات کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہے یا ان لوگوں پر جنہوں نے ان کے خلاف بغاوت کی تھی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ملت کا اجتماع

اول کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ عہد مرتضوی کا مؤلف نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ تاریخی حقائق کے سراسر خلاف ہے، یہ بات کہ:

"ملت ان کی بیعت پر مجتمع نہ ہوئی"

اس کی تحقیق سابق میں نہایت تفصیل سے گزر چکی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ امت کی اکثریت تھی اور سوائے شام کے تمام آفاق میں ان کی بیعت پر اجتماع تھا۔ ان سے مہاجرین و انصار نے بیعت کی تھی جو ملت کا اصلی مصداق ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ "فتح الباری شرح صحیح بخاری" میں فرماتے ہیں:

وكانت بيعة علي بالخلافة عقب قتل عثمان في أوائل ذي الحجة سنة خمس وثلاثين فبايعه المهاجرون والأنصار وكل

من حضر وكتب بيعته إلى الآفاق فأذعنوا كلهم إلا معاوية في أهل الشام. (باب مناقب علي بن أبى طالب)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اوائل ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں ہوئی تھی آپ سے مہاجرین وانصار اور تمام حاضرین نے بیعت کی تھی اور آپ کی بیعت کے لئے تمام آفاق کو لکھا گیا یہ بات سب نے تسلیم کر لی، سوائے معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کے۔

اور معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کا اس باب میں خطا پر ہونا یقینی ہے، چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وبحث در اجتہاد معاویہ وعدم اجتہاد ایشان حالاً اصلاً مفید نیست زیرا کہ گو مجتہد بودند درین مسئلہ بالیقین خطا نمودند، چہ اجتہاد در مقابلہ نص اصلاً اعتبار ندارد۔" (فتاوی عزیزی ۱/۹۸ طبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد وعدم اجتہاد کی بحث اب بالکل مفید نہیں کیونکہ گو وہ مجتہد سہی اس مسئلہ میں انہوں نے بالیقین خطا کی ہے اس واسطے کہ نص کے مقابلہ میں اجتہاد کا قطعی اعتبار نہیں۔

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وخروج ایشان از ہر اجماعیکہ بر خلافت حضرت علی منعقد شدہ باکے ندارد زیرا کہ دران وقت اجتہاد ایشان آنقدر رتبہ است کہ ایشانرا در اہل حل وعقد ان شمرد وعلاوہ آنکہ خلافت حضرت علی عند المحققین بنص ثابت است در مقابلہ نص اجتہاد را اصلا اعتبار نیست۔ (۹۸)

ترجمہ: اور ان کا ہر اس اجماع سے خارج ہونا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر منعقد ہوا کچھ مضائقہ نہیں رکھتا کیونکہ اس وقت میں ان کا اجتہاد اس درجہ کا نہ تھا کہ انہیں اہل حل وعقد میں شمار

کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں محققین کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے اور نص کے مقابلہ میں اجتہاد کا قطعی اعتبار نہیں ہے۔

اب مؤلف صاحب مہاجرین و انصار کو ملت مانتے ہیں تو یقیناً ملت ان کی بیعت پر مجتمع تھی، ورنہ اتنا تو بہر حال ان کو تسلیم ہے:

"یہ مہاجرین و انصار جو راہ چلیں اور جس امر پر مجتمع ہو جائیں وہی حق و صواب ہے۔"

عہد مرتضوی کے غزوات و فتوحات

عمومی طور پر یہ دعوی بھی صحیح نہیں کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی جہاد ہوا نہ ملک و شہر فتح ہوا۔"

معلوم نہیں کہ مؤلف کے نزدیک خوارج اور باغیوں سے جنگ کرنا جہاد میں داخل ہے یا نہیں، اب تک تو تمام فقہاء اسلام اس کو جہاد ہی کہتے چلے آئے ہیں، چنانچہ فقہ کی عام کتابوں میں "باب البغاۃ والخوارج" "کتاب الجہاد والسیر" کے آخر میں مذکور ہوتا ہے۔ تاہم اگر مؤلف کے نزدیک "جہاد" سے مراد صرف قتالِ کفار ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں کفار و مشرکین سے بھی متعدد معرکے پیش آئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حافظ ذہبی رحمہ اللہ "تاریخ الاسلام" میں ۳۷ھ کے حوادث بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفيها غزا الحارث بن مرة الفهري أرض الهند، إلى ان جاوز مكران، وبلاد قندابيل، ووغل في جبل القيقان، فآب بسبي وغنائم، فأخذوا عليه بمضيق فقتل هو وعامة من معه في سبيل الله تعالى.

اور اسی سنہ میں حارث بن مرہ فہری نے زمین ہند پر جہاد کیا یہاں تک کہ وہ مکران اور قندابیل کے شہروں تک پہنچے اور کوہِ قیقان میں گھس گئے اور بہت سے قیدی اور اموال غنیمت لیکر واپس ہوئے۔ پھر کفار نے ان پر ایک تنگ جگہ پر حملہ کیا اور وہ اور ان کے سب ساتھی راہ خدا میں شہید ہو گئے۔

یاقوت حموی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اجازت سے سرحد ہند کا رخ کیا تھا اور فتوحات کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں انہوں نے ایک ہزار غلام تقسیم کیے تھے، لیکن ان کی شہادت کا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد ۴۲ھ میں پیش آیا تھا۔[۱۳۵]

(۲) ابو حنیفہ دینوری نے "الاخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ پہنچ کر خلید بن کاس کو خراسان کا والی بنا کر بھیجا۔ خلید جب خراسان کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ کابل کے خسرو کی بیٹی نیشاپور آگئی ہے اور اہل نیشاپور نے اس کے ساتھ ملکر بغاوت کر دی ہے، خلید نے ان سے جنگ کر کے ان کو شکست دی اور دختر خسرو کو امان دیکر دربار خلافت میں بھیج دیا۔[۱۳۶]

مؤرخ طبری کا اس سلسلہ میں بیان ہے کہ ۳۶ھ میں جنگ جمل کے بعد ماہویہ حاکم "مرو" حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اقرار صلح کے لئے حاضر ہوا تھا

135۔ ملاحظہ ہو "معجم البلدان"۔ "ذکر قیقان"، خلفاء راشدین کے فاضل مؤلف مولوی حاجی معین الدین ندوی مرحوم نے قیقان کو "کوکن" سمجھا ہے اور اس لئے اس مہم کو بحری قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں، قیقان قلات کا علاقہ ہے۔

136۔ دینوری کے الفاظ ہیں "فقاتلهم خليد فهذمهم وأخذ ابنة كسرى بأمان وبعث بها إلى علي"۔ (ص ۱۶۳ طبع لیدن ۱۹۱۲ء)

اور آپ نے اس کو صلح نامہ لکھ دیا تھا لیکن بعد کو اہل "مرو" صلح سے پھر گئے اور انہوں نے "ابر" شہر کے دروازے بند کر دیئے۔ چنانچہ جنگ صفین سے واپسی پر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جعدہ بن ہبیرہ مخزومی رحمہ اللہ کو خراسان بھیجا تو انہیں "ابر" شہر پہنچ کر ان لوگوں کے کفر و سرکشی کا پتہ چلا، یہ واپس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو اس کی اطلاع دی۔ اب آپ نے اس مہم پر خلید بن قرۃ یربوعی رحمہ اللہ کو مامور کیا جنہوں نے یہاں پہنچ کر نیشاپور کا محاصرہ کیا جو اس وقت تک جاری رہا جب تک اہل نیشاپور نے ان سے صلح نہ کر لی۔ پھر اہل "مرو" نے بھی ان سے صلح کر لی۔[137] معلوم ہوا کہ نیشاپور اور "مرو" پر مستقل قبضہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہی ہوا ہے۔

(۳) مؤرخ دینوری رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جو علم اٹھایا گیا وہ جہاد کفار ہی تھا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں آکر جب اہل شام کے مقابلہ میں جانا چاہا تو کوفہ کے سب لوگ آپ کے ساتھ باغیوں سے جہاد پر آمادہ ہو گئے مگر یہاں کے چار سو قراء نے جن میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ اور عبید سلمانی رحمہ اللہ اور ربیع بن خثیم رحمہ اللہ وغیرہ شامل تھے آپ کی خدمت میں آکر شرکت سے معذوری ظاہر کی اور یوں عرض پیرا ہوئے کہ ہم آپ کی فضیلت کے معترف ہیں مگر ہمیں اس بارے میں شرح صدر نہیں، ساتھ ہی یہ التماس کیا کہ:

ولا غنى بك ولا بالمسلمين عمن يقاتل المشركين، فولنا بعض هذه الثغور لنقاتل عن أهله.

آپ کو اور اہل اسلام کو مشرکین سے جنگ کیے بغیر چارہ نہیں، لہٰذا

137۔ ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۳ ص ۷۵۵ و ج ۴ ص ۴۶، ۶۰ طبع مصر ۱۳۵۸ھ۔

آپ ہمیں ان سرحدات میں سے کسی سرحد پر مامور کر دیجئے تاکہ سرحدیوں سے جہاد کریں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت عطا فرما کر انہیں "قزوین" اور "رے" کی سرحد پر مامور کیا اور ربیع بن خثیم رحمہ اللہ کو علمِ جہاد عنایت کرکے ان سب پر امیر بنایا۔[۱۳۸]

(۴) امام بیہقی رحمہ اللہ نے "سنن کبریٰ" میں حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں اُس لشکر میں موجود تھا جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنی ناجیہ کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تھا۔ جب ہم ان کے یہاں پہنچے تو وہ تین جماعتوں میں تقسیم تھے۔ اولاً یہ سب نصاریٰ تھے بعد کو ان کی ایک جماعت اسلام لے آئی، دوسری نصرانیت پر قائم رہی۔ تیسری مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو گئی۔ ہمارے امیر نے مسلمانوں سے کہا تم تو الگ رہو، پھر ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جب انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو جب میں اپنے سر پر تین بار ہاتھ پھیر چکوں تو پھر ان پر نہایت زور کا حملہ کرنا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا پھر ان کے جتنے لڑنے والے تھے ان کو قتل کیا اور ان کی
ذریت کو گرفتار کر لیا۔

اس روایت کو بیان کرنے کے بعد امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قال الشافعي قد قاتل علي من لم يزل على النصرانية ومن ارتد.(ج 8 ص 208)

امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے بھی قتال کیا جو نصرانیت پر قائم تھے اور ان سے

138۔ "الاخبار الطوال" ص ۷۵ او ۷۶ اطبع لیدن۔

بھی جو مرتد ہو گئے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ کی اس تصریح کے بعد اور ان تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ :

وخلافة علي لم يقاتل فيها كافر.

کہ خلافت علی رضی اللہ عنہ میں کسی ایک کافر سے قتال نہیں کیا گیا

یا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا یہ لکھنا:

"وجہاد در زمان ولي بالكلیہ منقطع شد۔"

کس طرح صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس سلسلہ میں تاریخی جزئیات کا پوری طرح استقصاء نہیں فرمایا اور واقعات کا سرسری جائزہ لے کر ایک عام حکم لگا دیا۔

اسماء عمال عہد مرتضوی

کیا حضرت علی کے دائرہ حکومت میں سوائے کوفہ کے کچھ باقی نہ رہا تھا؟

تاریخی اعتبار سے یہ بھی صحیح نہیں کہ :

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سلطنت کا دائرہ ہر روز خاص کر ثالثی کے بعد زیادہ تنگ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آخر میں سوائے کوفہ اور اس کے آس پاس کے کچھ ؟؟؟ اور ان کے لئے باقی نہ رہا۔"

کیونکہ ابھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصریح آپ کی نظر سے گزری کہ آغاز خلافت ہی سے سوائے صوبہ شام کے تمام عالم اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیر نگین تھا، البتہ جنگ صفین کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خوارج سے جنگ میں مصروف ہوئے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے موقع پا کر صوبہ مصر پر قبضہ کر لیا اور موقع بموقع دوسرے صوبوں پر بھی تاختین شروع کیں، لیکن امیر المومنین کی فوجوں نے تمام مقامات سے حملہ آوردستوں کو نکال باہر کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

کی جس وقت شہادت ہوئی ہے سوائے مصر کے تمام عالم اسلام قلمرو خلافت میں داخل تھا اور ہر جگہ عمال خلافت ہی کارفرما تھے۔ امیر حج بھی امیر المؤمنین ہی کی طرف سے متعین ہوتے تھے۔

امام طبری رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان تمام عمال خلافت کو نام بنام گنایا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ۴۰ھ میں جس سال کہ آپ کی شہادت واقع ہوئی مختلف صوبوں کی حکومت پر مامور تھے۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہدیۂ ناظرین ہے:

بصرہ پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، فارس و کرمان پر زیاد بن ابیہ رضی اللہ عنہ، بحرین و یمن پر عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، مکہ و طائف پر قثم بن عباس رضی اللہ عنہ اور مدینہ طیبہ پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ قتال اہل قبلہ میں امام ہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح ہے یا نہیں اور بحیثیت ایک خلیفہ راشد کے ان کو ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟

یہاں سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ حضرات خلفاء اربعہ میں افضیلت کے اعتبار سے باہمی ترتیب وہی ہے جس ترتیب سے وہ متولی خلافت ہوئے ہیں اور اس بنا پر ہر ایک سے اس کے عہد خلافت میں وہی کارنامے سرزد ہوئے جو اس کے شایانِ شان تھے، چنانچہ قتال و جہاد کے بارے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ شریعت اسلام میں جن لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) مرتدین جو سب سے بدترین اور جب تک وہ دوبارہ اسلام قبول نہ کر لیں ان کا زندہ چھوڑنا یا ان کے ساتھ رعایت کرنا کسی حال میں روا نہیں، ان کی مثال جسد اسلام

میں بالکل اس عضو فاسد کی سی ہے جس کا جسم سے جدا کر دینا اس لئے ضروری ہے کہ کہیں اس کا زہر سارے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔

(۲) کفار و مشرکین، لیکن ان کے ساتھ اتنی رعایت ہے کہ اگر وہ لڑائی میں گرفتار ہو کر لونڈی غلام بنا لئے گئے یا انہوں نے خود اطاعت قبول کر کے جزیہ دینا منظور کر لیا تو اب ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کا فرض ہے۔

(۳) بغاۃ و خوارج جن کے ساتھ کسی حال میں غیر مسلموں کا سا سلوک نہیں ہو گا، نہ ان کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنایا جائے گا اور نہ ان کا مال مالِ غنیمت میں شمار ہو گا، بلکہ جب تک وہ خود چھیڑ نہ کریں اور علانیہ سرکشی پر آمادہ نہ ہوں ان سے قتال بھی روا نہیں اور سوائے اس خاص صورت کے کہ ان کا مستقل مرکز جہاں ان کے جمع ہونے سے دوبارہ نقض امن کا اندیشہ ہو نہ ان کے بھاگتے کا تعاقب کیا جائے گا اور نہ ان کے زخمی کو جان سے مارا جائے گا۔

ان تینوں قسموں کی تفصیل سے واضح ہو گیا کہ جس گروہ میں جتنی برائی فی الواقع ہے اسی نسبت سے اس کے متعلق احکام دیئے گئے ہیں اور اسی نسبت سے شرع میں ان کا قتال مطلوب اور اس پر ثواب مبنی ہے۔ اب خلافتِ نبوت کا قدرتی تقاضا ہے کہ خلفاء اربعہ (رضی اللہ عنہم) میں سے ہر ایک کے حصہ میں اسی جماعت کا قتال آئے جس کے وہ اپنی ذاتی فضیلت کے لحاظ سے مستحق تھے، چونکہ خلافت شیخین رضی اللہ عنہما کا زمانہ کارہائے نبوت کی تکمیل کا زمانہ ہے اور خلافت مرتضوی رضی اللہ عنہ کا زمانہ کارہائے ولایت کی انجام دہی کا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ایام خلافت شیخین رضی اللہ عنہما ایام نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است و ایام خلافت مرتضی رضی اللہ عنہ ایام دورہ ولایت است۔"[۱۳۹]

139۔ شاہ صاحب موصوف رحمہ اللہ نے اپنے اس دعویٰ کو ان الفاظ میں مبرہن فرمایا ہے:=

=" باید دانست کہ چون در حظیرۃ القدس کہ مجمع افاضل ناس است خوض کردیم ارواح شیخین و مرتضی رارضی اللہ عنہم دریافیتم و کمالات ایشان را جدا جدا فہم نمودیم، ارواح شیخین باآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ مشعل یافتیم در غایت روشنی کہ آئینہا گرد آن گرفتہ باشند وبسبب تعاکس اضواء آن روشنی دوبالا شدہ باشد نوری کہ برزمین منبسط می شود ہمہ کشی واحد نظرمی آید تمیز شعاع مشعلہ از شعاع آئینہ ہامیان آن نور منسبط متعذرمی گردد ہم چنان اشعۂ ارواح شیخین بااشعۂ روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نتوان شناخت۔"

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ جب ہم نے "حظیرۃ القدس" (پیش گاہ خداوندی) میں کہ جہاں بڑے لوگوں کی ہمتوں کا مجمع لگا رہتا ہے غور کیا تو شیخین اور مرتضی کی ارواح کا پتہ لگایا اور ان کے کمالات کو جدا جدا سمجھا، ارواح شیخین کا تعلق آنحضرت ﷺ سے ایسی مشعل کی طرح پایا جو انتہا درجہ روشن ہو اور جس کے گردا گرد آئینے لگائے گئے ہوں اور ان کے عکس سے وہ روشنی اور دوبالا ہو گئی ہو اب جو نور (کہ ان میں سے نکل کر) زمین پر پھیل رہا ہے وہ بالکل یکساں نظر آتا ہے اور اس پھیلے ہوئے نور میں مشعل کی شعاع کا آئینوں کی شعاع سے امتیاز کرنا دشوار ہے، اسی طرح ارواح شیخین کی شعاعیں آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کی شعاعوں کے ساتھ مل کر اس طرح یکساں ہو گئی ہیں کہ اب ارواح شیخین آنحضرت ﷺ کی روح مبارک سے الگ شناخت نہیں ہو تیں۔

امیر خسرو نے اپنے اس شعر میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے:

من تو شدم تو من شدی   من تن شدم تو جان شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں   من دیگرم تو دیگری

رق الزجاج و رقت الخمر   فتشابها وتشاكل الأمر
فكأنها خمر ولا قدح   وكأنها قدح ولا خمر

ترجمہ:

شیشہ بھی صاف اور مے بھی صاف   تو دونوں مشتبہ ہوئے اور معاملہ مشکل ہو گیا
اب کبھی تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مے ہی جام نہیں   اور کبھی یوں خیال پڑتا ہے کہ جام ہی مے نہیں=

=وروح مرتضی رضی اللہ عنہ بآنحضرت ﷺ بمنزلہ نور قمر یا قتیم کہ در محاذات شمس واقع شدہ وکسب نورانیت ازو نمودہ باخود صورتے دیگر گرفتہ بجمال خود برآید ہم چنان روح مرتضی علی رضی اللہ عنہ فاتحیت ولایت راکہ در داخل روح آنحضرت ﷺ مندرج بود بسطے لائق دادہ براس خود قائم شدہ۔

آن بادہ شعلہ گون کہ دارد خورشید

در کاسہ ماہ چون رسد شیر شود

وشرح این کلمہ آنست کہ بسبب آنحضرت ﷺ یک برزہ از برت تجلی اعظم کہ برنگ ہمم ملاء اعلی رنگین بود آخر شد و برزہ دیگر کہ برنگ عالم مثال واقع است پیدا گشت آن راہ اول راہ نبوت بود واین راہ آخر راہ ولایت است پس ایام خلافت شیخین رضی اللہ عنہما ایام نبوت آنحضرت ﷺ است و ایام خلافت مرتضی رضی اللہ عنہ ایام دورہ ولایت است۔

در صدیق تشبہ باعتبار فناء وانعکاس اشعہ بیشتر یا قتیم ولہٰذا آنحضرت ﷺ در باب صدیق فرمودند "لو كنت متخذًا خليلاً غير ربي لا تخذت أبا بكر خليلاً" اشارت نمود بذ ہمین فنا وانعکاس۔

ودر فاروق تشبہ باعتبار کارِ مطلوب بر دست او و باعتبار تائید حظیرۃ القدس زیادہ تر ادراک کردیم لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند "لو كان بعدي نبي لكان عمر."

ودر مرتضی رضی اللہ عنہ تشبہ باعتبار اعتدال قوای ثلاث وانتظام بعض آن با بعض زیادہ تردیدیم لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند "هو مني وأنا منه."

(تفہیمات الٰہیہ ج ص،)

ترجمہ: اور مرتضی رضی اللہ عنہ کی روح کا تعلق آنحضرت ﷺ سے بمنزلہ نور ماہتاب کے پایا جو آفتاب کے مقابل ہے اور اس سے روشنی حاصل کر کے اپنی الگ صورت میں اپنے جمال کا مظاہرہ کرتا ہے اسی طرح حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ کی روح بھی فاتحیتِ ولایت کو جو آنحضرت ﷺ کی روح مبارک کے اندر تھی بسط مناسب دیکر بذات خود قائم ہوگئی ہے۔

آفتاب کی مے شعلہ گون جب جام ماہتاب=

("تفھیمات الھیة" ج۱ص۲۴۵)

خلافت شیخین رضی اللہ عنہما کے ایام آنحضرت ﷺ کی نبوت کے (یعنی کارنامہ ہائے نبوت کے) ایام ہیں اور خلافت مرتضی رضی اللہ عنہ کے ایام دورہ ولایت کے ایام ہیں۔

اس مسئلہ قتال میں بھی یہی صورت پیش آئی کہ مرتدین اور کفار و مشرکین سے ہمیشہ انبیاء جنگ کرتے آئے ہیں لیکن باغیوں سے جنگ نبی کے زمانہ میں نہیں ہو سکتی کیونکہ جو نبی ﷺ کے خلاف تلوار اُٹھائے وہ باغی نہیں مرتد یا کافر ہوتا ہے۔ باغیوں سے جنگ اولیاء کا حصہ ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اگرچہ جیسا ہم نے سابق میں بیان کیا محض چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کفار و مشرکین بلکہ

=میں پہنچتی ہے تو دودھ بن جاتی ہے

اس بات کی شرح یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سبب سے تجلی اعظم کا ایک ظہور ملاء اعلی کی ہمتوں کے رنگ میں رنگین ہو کر ختم ہو گیا اور دوسرا ظہور کہ جو عالم مثال کے رنگ میں واقع ہے ظاہر ہوا، وہ پہلا راستہ ہے، لہٰذا شیخین رضی اللہ عنہما کے ایام خلافت آنحضرت ﷺ کی ایام نبوت ہیں اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت دور ولایت کے ایام ہیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں فنا اور انعکاس اشعہ کے اعتبار سے زیادہ تشبہ پایا اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بابت فرمایا کہ "میں اگر اپنے پروردگار کے علاوہ اور کسی کو جگری دوست بناتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا" اس میں آپ نے اسی فنا اور انعکاس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ میں ان کے ہاتھ سے مطلوبہ کام کی تکمیل اور حظیرۃ القدس کی تائید کے اعتبار سے زیادہ تشبہ محسوس کیا اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔"

اور حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ میں قوای سہ گانہ (قوت شہویہ، نفس سبعیہ اور قوت عقلیہ) کے اعتدال اور ان کے باہمی انتظام کے اعتبار سے زیادہ تشبہ دیکھا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے"۔

مرتدین کے ساتھ بھی ہوئیں لیکن ان کی خلافت کا اصل کارنامہ جس میں وہ خلفاء ثلاثہ سے منفرد ہیں یہی ''قتال خوارج وبغاۃ'' ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ قتال اہل قبلہ میں اسی طرح امام ہیں جس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ قتال مرتدین میں ہیں اور حضرت فاروق اعظم و عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہما قتال کفار و مشرکین میں ہیں اور ان دونوں موخر الذکر حضرات کے قتال میں بھی وہی فرق عیاں ہے جو خود ان دونوں کے مراتب میں ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قیصر و کسریٰ کو شکست دی ہے اور ذی النورین رضی اللہ عنہ نے ان کے باج گزاروں کو، غرض جس درجہ کا قتال اسی درجہ کا قتال کرنے والا۔ افضل چیز افضل کے ہاتھوں انجام پائی۔(ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ ''ازالۃ الخفاء'' میں فرماتے ہیں:

''وکلمہ منطبق «وَالَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ» است بر علی مرتضی رضی اللہ عنہ۔ زیرا کہ در ایام خلافت او امری کہ واقع شد وے بدان متفرد بود قتال بغاۃ است۔''(ج ۱ ص ۲۳۱)

ترجمہ: اور آیت «وَالَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ» (اور وہ لوگ کہ جب ان کو بغاوت کا سامنا ہوتا ہے تو انتقام لے لیتے ہیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منطبق ہے۔ کیونکہ ایام خلافت میں جو خاص بات واقع ہوئی اور جس میں وہ متفرد تھے وہ قتال بغاۃ ہی ہے۔

اور اسی ''ازالۃ الخفاء'' میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''وخبر دادند کہ مرتضی را با قریش مناقشات خواہند افتاد و با ناکثین و مارقین و قاسطین جنگ واقع خواہد شد و عمار بن یاسر را فئہ باغیہ خواہند کشت و بر دست اولی الناس بالحق جماعہ مارقہ ہلاک خواہند شد، آمیتھم رجل مشدون۔''(ج1ص269)

ترجمہ: اور آنحضرت ﷺ نے خبر دی کہ مرتضی رضی اللہ عنہ کو قریش کے ساتھ جھگڑے پیش آئیں گے اور ناکثین (بیعت توڑنے والے اصحاب جمل مراد ہیں)، مارقین (دین سے نکلنے والی خوارج مراد ہیں۔) اور قاسطین (انصاف کا خون کرنے والے اہل شام مراد ہیں) سے جنگ ہوگی۔ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو باغی لوگ قتل کریں گے اور جو لوگ حق سے زیادہ قریب ہوں گے ان کے ہاتھوں "مارقین" کی جماعت ہلاک ہوگی "مارقین" کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک شخص ایسا ہوگا کہ ان کا ہاتھ ناقص ہوگا۔

اور اسی کتاب میں ایک اور مقام پر مذکور ہے:

"واز لوازم خلافت خاصہ آنست کہ آنچہ خدائے عز و جل برائے آنحضرت ﷺ وعدہ فرمودہ است بعض آن بر دست این خلیفہ ظاہر شود، این علامت خلافت در وقت تو ان شناخت نہ قبل از خلافت بخلافت دیگر، ووجود این معنی در خلفاء متحقق است، در آیہ «الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ» اقامت صلوۃ وایتاء زکوۃ وامر بمعروف ونھی از منکر مذکور شدہ ودر آیۃ «وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ» تمکین و تقویت دین بردست ایشان و بر حسب سعی ایشان و حصول اطمینان از کفار مذکور است۔

ودر آیہ «ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ» اشارہ بفتح بلدان و شیوع اسلام در اقالیم معمورہ ودر آیہ «لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ» غلبہ بر دین یہودیت و نصرانیت و مجوسیت مذکور است و آندر زمان خلفائی ثلثہ بودہ است ودر آیہ «مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ» قتال مرتدین مذکور است، وآن در زمان صدیق اکبر بظہور پیوست و در آیہ «سَتُدْعَوْنَ إِلٰى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيْدٍ» جمع عساکر بنفیر عام برائی قتال فارس وروم مذکور است و آن در

زمان مشائخ ثلاثہ متحقق شد ودر آیہ «اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَه وَ قُرْآنَه» جمع قرآن در مصاحف مذکوراست وآن درعہد مشائخ ثلاثہ ظہور یافت۔

ودر حدیث قدسی «إن الله مقت عربهم وعجمهم» قتال عجم مذکوراست وآن درایام خلفائے ثلاثہ ظاہر گشت، ودر حدیث «هلك كسرى فلا كسرى بعده وهلك قيصر فلا قيصر بعده»، وحدیث «لتفتحن كنوز كسرى» فتح فارس وروم مذکوراست وآن در زمان خلفائی ثلاثہ بظہور رسید، ودر حدیث قتال خوارج «لئن أدركتهم لأقتلنهم قتل عاد» ودر حدیث دیگر لفظ «يلي قتلهم أولى الفريقين» وآن در زمان حضرت مرتضی واقع شد۔ (''ازالۃ الخفاء'' ج ا ص ۱۴)

ترجمہ: اور خلافت خاصہ نبوت کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ جو حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت ﷺ سے وعدہ فرمایا ہے اس میں سے کچھ اس خلیفہ کے ہاتھوں میں ظاہر ہو اور خلافت نبوت کی اس علامت کو دوسری علامات کے برخلاف اس کے عہد خلافت ہی میں پہچانا جاتا ہے، قبل از خلافت نہیں، چنانچہ اس امر کا وجود خلفاء میں متحقق ہے۔

آیت «وَالَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْن» الخ میں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے کا ذکر ہے اور آیت «وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ» الخ میں ان کے ہاتھوں اور ان کی کوششوں کے مطابق دین کا اقتدار اور اس کی تقویت اور کفار کی طرف سے اطمینان کا حصول مذکور ہے۔

اور آیہ «ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ» الخ میں شہروں کے فتح ہونے اور اقالیم عالم اسلام کی اشاعت کا اشارہ ہے اور آیہ «لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ» میں دین یہودیت و نصرانیت و مجوسیت پر غلبہ کا بیان ہے اور یہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہوا ہے اور آیت

«مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ» الخ میں قتال مرتدین کا ذکر ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ظاہر ہوا اور آیت «سَتُدْعَوْنَ إِلٰى قَوْمٍ أُوْلِيْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ» میں فارس و روم سے لڑنے کے لئے نفیر عام کے ساتھ لشکروں کے جمع کرنے کا مذکور ہے اور یہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں متحقق ہوا۔ اور آیت «اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَه وَ قُرْآنَه» [١٤٠] میں قرآن مجید کے مصاحف میں جمع کرنے کا بیان ہے اور اس کا ظہور بھی خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں ہوا۔

اور حدیث قدسی «إن الله مقت عربهم وعجمهم» الخ میں قتال عجم کا بیان ہے اور یہ خلفائے ثلاثہ کے ایام میں ظاہر ہوا اور حدیث «هلك كسرى فلا كسرى بعده وهلك قيصر فلا قيصر بعده»، اور حدیث «لتفتحن كنوز كسرى» میں فارس و روم کے فتح کرنے کا بیان ہے اور اس کا ظہور خلفاء ثلاثہ کے عہد میں ہوا اور قتال خوارج کی حدیث میں ہے «لئن أدركتهم لأقتلنهم قتل عاد» [١٤١] اور دوسری حدیث کے لفظ ہیں «يلي قتلهم أولى الفريقين» [١٤٢] اور یہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوا۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جن لوگوں کے خلاف بھی تلوار اٹھائی بالکل

140۔ ان تمام آیات کی تفسیر اور ان کی تشریح کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ''ازالۃ الخفاء'' کے مقصد اول کی فصل سوم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

141۔ اگر میں ان کو پا جاؤں تو اس طرح قتل کروں جیسے عاد کو ختم کیا گیا ہے (یعنی ان کا نام ونشان مٹا دوں)۔

142۔ ان کو وہ قتل کرے گا جو دونوں فریقوں میں سے حق سے زیادہ قریب ہو گا۔

صحیح اٹھائی اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا کتاب وسنت کے عین مطابق کیا، بلکہ بغاۃ وخوارج سے قتال ہی ان کا وہ کارنامہ ہے جس سے ان کی خلافت راشدہ کی تصدیق ہوئی۔ محاربین علی مرتضی (رضی اللہ عنہ) کے باب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی جو رائے ہے وہ نہایت تفصیل کے ساتھ سابق میں ''ازالۃ الخفاء'' سے نقل کی جاچکی ہے، البتہ ان مسلسل بغاوتوں سے قدرتی طور پر آپ کی خلافت میں جو ضعف پیدا ہوا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتوحات اسلامی کا بڑھتا ہوا سیلاب دفعتاً اپنی جگہ رک گیا اور ان اندرونی بغاوتوں کے دُور کرنے میں آپ کو اتنی فرصت ہی نہ مل سکی کہ دوسری مہمات کی طرف اپنی توجہ مبذول فرماتے، لیکن اس سے نہ آپ کی صحتِ خلافت پر کوئی اثر پڑتا ہے نہ آپ کے فضائل وکمالات پر، یہ ایک قدرتی بات تھی جس میں آپ کا کچھ دخل نہ تھا نہ آپ کی کوشش وسعی میں کچھ کمی تھی نہ آپ کی نیت میں کوئی خرابی۔ جس طرح بعض انبیاء کی دعوت ان کی قوم مان لیتی ہے اور ان پر ایمان لے آتی ہے اور بعض کے ساتھ انکار وسرکشی سے پیش آتی ہے، یہی حال نائبان انبیاء اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا بھی ہے کہ بعض کے لوگ مطیع وفرمانبردار بن جاتے ہیں اور بعض سے بغاوت وسرکشی کے ساتھ پیش آتے ہیں، حالانکہ ان حضرات کی کوشش اور جدوجہد میں نہ کوئی فرق ہوتا ہے اور نہ ان کے اخلاص اور حسن نیت میں ذرّہ برابر کمی۔ تقدیر الٰہی کی حکمت کے مطابق جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

اس لئے اس صورت حال کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر ڈالنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اہل شام حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے برسر جنگ نہ ہوتے تو آپ کو انتظام خلافت میں ذرا دقت نہ پیش آتی اور خلافت راشدہ کے تمام کاروبار حسب دستور چلتے رہتے، یہ اہل شام کی بغاوت ہی تھی کہ جس کی بدولت فتوحات اسلامیہ کا بڑھتا ہوا سیلاب دفعتاً اپنی جگہ رک گیا، بلکہ نصاریٰ کو شام

پر حملہ کرنے کی طمع پیدا ہوئی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ "البدایہ والنہایہ" میں رقمطراز ہیں:

فلم يزل معاوية نائباً على الشام في الدولة العمرية والعثمانية مدة خلافة عثمان، وافتتح في سنة سبع وعشرين جزيرة قبرص وسكنها المسلمون قريباً من ستين سنة في أيامه ومن بعده، ولم تزل الفتوحات والجهاد قائماً على ساقه في أيامه في بلاد الروم والفرنج وغيرها، فلما كان من أمره وأمر أمير المؤمنين علي ما كان، لم يقع في تلك الأيام فتح بالكلية، لا على يديه ولا على يدي علي، وطمع في معاوية ملك الروم بعد أن كان قد أخشاه وأذله، وقهر جنده ودحاهم، فلما رأى ملك الروم اشتغال معاوية بحرب علي تدانى إلى بعض البلاد في جنود عظيمة وطمع فيه، فكتب معاوية إليه: والله لئن لم تنته وترجع إلى بلادك يا لعين! لأصطلحن أنا وابن عمي عليك ولأخرجنك من جميع بلادك، ولأضيقن عليك الأرض بما رحبت. فعند ذلك خاف ملك الروم وانكف، وبعث يطلب الهدنة.

ثم كان من أمر التحكيم ما كان، وكذلك ما بعده إلى وقت اصطلاحه مع الحسن بن علي كما تقدم.

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا تقرر کر دیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ دولت عمری میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پوری مدت خلافت تک شام کے نائب سلطنت رہے۔ انہوں نے ۲۷ھ میں جزیرہ قبرص کو فتح کیا اور وہاں ان کے عہد حکومت میں اور اس کے بعد ساٹھ سال کے قریب مسلمان سکونت گزین رہے اور ان کے زمانہ

نیابت میں بلاد روم و فرنگ وغیرہ میں برابر فتوحات جاری رہیں اور جہاد قائم رہا۔

پھر جب ان میں اور امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ میں وہ معاملہ پیش آیا جو آیا تو ان ایام میں بالکلیہ کوئی فتح واقع نہ ہوئی نہ ان کے ہاتھ پر اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اور شاہ روم نے بعد اس کے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنی دھاک بٹھا کر اسے ذلیل کر دیا اور اس کے لشکر کو مغلوب کر کے ان (کی لاشوں) کو زمین پر بچھا دیا تھا (ان پر حملہ کرنے) کے بارے میں طمع کی، چنانچہ شاہ روم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ میں مشغول پایا تو وہ بہت بڑے لشکروں کے ساتھ شام کے بعض شہروں کے قریب آگیا اور ان پر حملہ کی سوچنے لگا، تب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو لکھا کہ خدا کی قسم تو اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو میں اپنے ابن عم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے ساتھ تیری مخالفت پر صلح کروں گا اور تجھے تیرے شہروں سے نکال باہر کروں گا اور زمین کو اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تجھ پر تنگ کروں گا، اس پر شاہ روم ڈر گیا اور اپنے ارادے سے باز آگیا، اور طلب صلح کے لئے پیغام بھیجا،[١٤٣] پھر تحکیم کا جو کچھ معاملہ ہوا اور اسی طرح اس کے بعد بھی

143۔ مؤلف نے حسب عادت حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس پوری عبارت میں سے صرف خط کشیدہ ؟؟؟؟ عبارت درج کتاب کی ہے اور پھر اس پر یوں قلم فرما ہوئے ہیں:

واقعات شاہد ہیں کہ نازک ترین موقعوں پر بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رشد و ہدایت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا،(١) مسلمان نسلیں رہتی دنیا تک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شکر گذار رہیں گی(٢) کہ عین اس وقت جب قیصر روم اس تاک میں بیٹھا تھا اور اپنی فوجوں کو اسلامی سرحد پر مجتمع کر رہا تھا کہ جوں ہی صفین کی خانہ جنگی میں اسلامی فوجیں برادر کشی(٣) سے گھٹ کر خستہ و=

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے صلح ہو جانے تک یہی صورت حال برقرار یعنی جہاد

=ماندہ پڑ جائیں ان پر حملہ کر کے مسلمانوں کی حربی قوت کو فنا کے گھاٹ اتار دے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اس خطرہ کا احساس کیا، قیصر کو ڈانٹ پلائی کہ اگر ایک قدم بھی تو نے اسلامی سرحد کی طرف بڑھایا تو میں اور میرے چچیرے بھائی (علی رضی اللہ عنہ) باہم صلح صفائی کر لیں گے اور پھر ہماری متحدہ فوجیں تیرے علاقہ پر دھاوا کر کے تجھے اپنا ملک چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیں گے، علامہ ابن کثیر نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فلما رأى ملك الروم اشتغال معاوية بحرب علي تدانى إلى بعض البلاد في جنود عظيمة وطمع فيه، فكتب معاوية إليه: والله لئن لم تنته وترجع إلى بلادك يا لعين! لأصطلحن أنا وابن عمي عليك ولأخرجنك من جميع بلادك، ولأضيقن عليك الأرض بما رحبت. فعند ذلك خاف ملك الروم وانكف، وبعث يطلب الهدنة. (البداية والنهاية: 8119)

جب قیصر روم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ سے جنگ میں مبتلا دیکھا اپنی کثیر فوجیں اسلامی سرحدوں کی جانب قبضہ کرنے کی طمع میں بڑھائیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو لکھ بھیجا اے لعین! میں اور میرے چچیرے بھائی تیرے خلاف صلح کر لیں گے اور تجھ کو تیرے ملک سے نکال دیں گے اور وسیع زمین تجھ پر تنگ کر دیں گے، قیصر اس سے خائف ہوا لوٹ گیا اور طلب صلح کے لئے وفد بھیجا۔

مؤلف نے ابن کثیر رحمہ اللہ کی پوری عبارت اس لئے نقل نہ کی کہ اس کے بیان کرنے سے اس صورت حال کی ذمہ داری حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر آتی تھی۔

(۱) رشد و ہدایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت میں تھی نہ ان سے بغاوت میں۔

(۲) مسلمان نسلیں رہتی دنیا تک ان کی اس وقت شکر گزار رہتیں جبکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لیتے اور خلافت راشدہ کا شیرازہ درہم و برہم نہ ہوتا۔

(۳) جب جنگ صفین مولف کے نزدیک برادر کشی ٹھہری تو پھر اس میں رشد و ہدایت کیا خاک ہوئی۔

مسدود رہا اور کسی قسم کی کوئی فتح نہ ہو سکی۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ سے مؤلف نے یہ نقل کیا ہے کہ:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد بالکلیہ منقطع ہو گیا تھا۔" (ص ۴)

اور اسی طرح ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے جو لکھا ہے کہ:

"علی کی خلافت میں دین اسلام کو شوکت نہ ہوئی بلکہ اہل اسلام میں فتنہ واقع ہوا اور شام و مشرق (ایران) کے کفار و نصاریٰ اور مجوسیوں کو جو مسلمانوں کے دشمن ہیں ان کے تباہ کرنے کی طمع پیدا ہوئی۔"[144] (ص ۵، ۴)

اس کی تشریح سمجھنی ہو تو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی مندرجہ بالا عبارت ملاحظہ ہو جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ فتوحات اسلامیہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الجھنے کی بدولت کس طرح سے ایک دم بڑھتے بڑھتے رک گئیں اور شام پر حملہ کرنے کی نصاریٰ کو کیونکر طمع پیدا ہو گئی۔ جنگ صفین کے زمانے میں نیشاپور و مرو میں جو ہنگامہ ہوا اس کی تفصیل ہم سابق میں سپرد قلم کر چکے ہیں۔ بے لاگ محقق کو اگر فریقین میں کسی سے بھی لاگ نہیں ہوتی تو وہ اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ڈالتے ورنہ کم از کم اس ذمہ داری میں

144۔ مؤلف نے "وطمع فیهم عدوهم من الکفار والنصاری والمجوس" میں "بالشام والمشرق" کا جو ترجمہ کیا ہے صحیح نہیں، یہاں "بالشام والمشرق" ظرف مضاف الیہ نہیں، مؤلف نے شام اور مشرق کے کفار کہہ کر ان کو صاف مضاف الیہ بنا دیا جو درست نہیں۔ "شام اور مشرق میں طمع پیدا ہو گئی" مؤلف کے ترجمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شام و مشرق کے کفار کو یہ طمع پیدا ہوئی، حالانکہ اصل عبارت میں اضافت نہیں کہ جس سے شام و مشرق کے کفار کی تخصیص ہو سکے بلکہ شام و مشرق میں اس طمع کے وقوع کا بیان ہے کہ یہ طمع وہاں کے لوگوں میں ہوئی ہو یا بیرونی لوگوں میں، چنانچہ شام میں خود وہاں کے کفار و نصاریٰ کو یہ طمع نہ ہوئی بلکہ شاہ روم کو ہوئی تھی۔

برابر کا شریک تو ضرور قرار دیتے، لیکن انہوں نے حقائق سے چشم پوشی کر کے اس بارے میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بنایا ہے، حالانکہ خود مولف کے معتمد علیہ محققین کی تصریحات سراسر اس کے بر خلاف ہیں، چنانچہ حافظ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ[145] المتوفی ۴۵۶ھ "الفصل في الملل والأهواء والنحل" میں رقمطراز ہیں:

فهو الإمام بحقه وما ظهر منه قط إلى أن مات رضي الله عنه شيء يوجب نقض بيعته وما ظهر منه قط إلا العدل والجد والبر والتقوى كما لو سبقت بيعة طلحة أو الزبير أو سعد أو سعيداً أو من يستحق الإمامة لكانت أيضاً بيعة حق لازمة لعلي ولغيره ولا فرق فعلى مصيب في الدعاء إلى نفسه وإلى الدخول تحت إمامته. (ج ۴ ص 122)

(حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد) حضرت علی رضی اللہ عنہ امام برحق تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی وفات کے وقت تک کبھی کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوئی کہ جس کی بناپر ان سے نقض بیعت ضروری ہوتا، ان سے تو بجز عدل اور سعی مسلسل اور نکوئی اور تقوی کے اور کوئی بات ظاہر نہ ہوئی۔ جس طرح کہ اگر ان کی بیعت سے پہلے حضرت طلحہ یا حضرت زبیر یا حضرت سعد یا حضرت سعید (رضی اللہ عنہم) یا اور کسی مستحق امامت سے بیعت کرلی جاتی تو یہ بھی بیعت حق ہی ہوتی اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) اور دیگر حضرات پر لازم ہوتی اور لزوم بیعت کے لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کسی دوسرے مستحق خلافت کی بیعت میں کچھ فرق نہیں

145۔ یہ ابن حزم وہی ہیں جنکی "جمہرۃ الانساب" کے حوالہ سے مؤلف کی کتاب بھری پڑی ہے۔

لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ذات کی طرف بلانے اور اپنی امامت کے تحت داخل ہونے کی دعوت دینے میں حق بجانب تھے۔

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

ولو أن معاوية بايع علياً لقوي به على أخذ الحق من قتلة عثمان فصح أن الاختلاف هو الذي أضعف يد علي عن إنفاذ الحق عليهم ولولا ذلك لأنفذ الحق عليهم.

اور اگر معاویہ (رضی اللہ عنہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لیتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے حق (قصاص) وصول کر لینے کی قوت حاصل ہو جاتی، یہ صحیح ہے کہ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے) اختلاف ہی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو ان پر نفاذ حق (یعنی قصاص) کے جاری کرنے سے کمزور کر دیا ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ ضرور ان پر حق کو نافذ کر کے رہتے۔

اور قاضی ابو بکر بن العربی رحمہ اللہ [146] **صاحب** "العواصم من القواصم"، **"احکام القرآن" آیت** «وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا» **کے تحت لکھتے ہیں:**

المسألة الرابعة: هذه الآية هي الأصل في قتال المسلمين، والعمدة في حرب المتأولين، وعليها عول الصحابة، وإليها لجأ الأعيان من أهل الملة، وإياها عنى النبي صلى الله عليه وسلم بقوله: «يقتل عماراً الفئة الباغية» وقوله في شأن الخوارج: «يخرجون على خير فرقة من الناس أو على حين فرقة»، والرواية الأولى أصح لقتلهم أدنى الطائفتين إلى الحق، وكان الذي

146۔ **قاضی صاحب مؤلف کے خاص معتمد علیہ بزرگوں میں ہیں، مؤلف نے اپنی کتاب میں (ص ۳۰۲، ۳۰۳) ان کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔**

قتلهم علي بن أبي طالب ومن كان معه، فتقرر عند علماء المسلمين، وثبت بدليل الدين أن علياً رضي الله عنه كان إماماً، وأن كل من خرج عليه باغ ، وأن قتاله واجب حتى يفيء إلى الحق، وينقاد إلى الصلح، لأن عثمان رضي الله عنه قتل، والصحابة برآء من دمه، لأنه منع من قتال من ثار عليه، وقال: «لا أكون أول من خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم في أمته بالقتل» فصبر على البلاء، واستسلم للمحنة، وفدى بنفسه الأمة، ثم لم يمكن ترك الناس سدى، فعرضت الإمامة على باقي الصحابة الذين ذكرهم عمر في الشورى، وتدافعوها، وكان علي أحق بها وأهلها ، فقبلها حوطة على الأمة أن تسفك دماؤها بالتهارج والباطل، ويتخرق أمرها إلى ما لا يتحصل، وربما تغير الدين، وانقض عمود الإسلام، فلما بويع له طلب أهل الشام في شرط البيعة التمكين من قتلة عثمان وأخذ القود منهم، فقال لهم علي: ادخلوا في البيعة، واطلبوا الحق تصلوا إليه، فقالوا: لا تستحق بيعة وقتلة عثمان معك نراهم صباحاً ومساءً، فكان علي في ذلك أسد رأيا، وأصوب قولاً، لأن علياً لو تعاطى القود منهم لتعصبت لهم قبائل، وصارت حرباً ثالثة فانتظر بهم أن يستوثق الأمر، وتنعقد البيعة العامة، ويقع الطلب من الأولياء في مجلس الحكم، فيجري القضاء بالحق. ولا خلاف بين الأمة أنه يجوز للإمام تأخير القصاص إذا أدى ذلك إلى إثارة الفتنة أو تشتيت الكلمة. (٢/ ٢٢٤)

(چوتھا مسئلہ) یہی آیت قتال مسلمین کی بنیاد ہے اور اہل تاویل سے جنگ میں اسی پر اعتماد ہے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی سے استناد کیا ہے اور اکابر اہلِ ملت نے اسی کو دستاویز بنایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں کہ "عمار (رضی اللہ عنہ) کو باغی جماعت قتل کرے گی" اور اپنے اس فرمان میں جو خوارج کے بارے میں ہے کہ "وہ بہترین جماعت کے خلاف خروج کریں گے" یا "اس وقت خروج کریں گے جبکہ (مسلمانوں میں) افتراق ہوگا" اس آیت کو مراد لیا اور پہلی روایت زیادہ صحیح ہے[147]، کیونکہ ان خوارج کو اس جماعت نے قتل کیا جو دونوں جماعتوں میں حق سے قریب تر تھی اور ان کو قتل کرنے والے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی تھے (یعنی اس آیت میں ان جماعتوں کی نشاندہی فرمائی ہے جو بحکم آیت شریفہ شرعاً باغی قرار پاتی ہیں اور ان سے قتال کرنا امام پر واجب ہے۔)

لہٰذا علماء اہل اسلام میں یہ بات مسلم ہے اور دلیل شرع سے ثابت ہے کہ علی رضی اللہ عنہ امام تھے اور جس نے بھی ان کے خلاف خروج کیا وہ باغی تھا اور اس سے قتال واجب تھا یہاں تک کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئے اور صلح کے لئے جھک جائے یہ اس بنا پر تھا کہ حضرت عثمان

147۔ واضح رہے کہ یہ دونوں روایتیں "صحیح بخاری" میں موجود ہیں اور ان میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک میں اس وقت کا بیان ہے جب خوارج خروج کریں گے اور دوسری میں اس جماعت کی نشاندہی ہے جس کے خلاف ان کا خروج ہوگا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی پیشن گوئی کے مطابق ایسا ہی ہوا کہ جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعتوں میں اختلاف برپا تھا خوارج نکلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کے خلاف نکلے جو اس وقت کی بہترین جماعت (خیر فرقۃ) تھی۔

رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے اور صحابہ ان کے خون سے بری تھے انہوں نے اپنے خلاف یورش کرنے والوں سے جنگ کو منع کر دیا تھا اور یوں فرمادیا تھا کہ ''میں آنحضرت ﷺ کی امت کو قتل کرنے میں آپ کا پہلا جانشین نہیں بنوں گا'' چنانچہ انہوں نے بلاء پر صبر کیا اور آزمائش کے آگے سر تسلیم خم کر کے خود کو امت پر قربان کر دیا، اب یہ ممکن نہ تھا کہ لوگوں کو یوں ہی (بے حکمران) چھوڑ دیا جائے، لہٰذا امت نے ان بقیہ اصحاب کے سامنے جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شوری میں (خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے) نامزد کیا تھا عرض کیا، ان حضرات نے اس ذمہ داری کو ایک دوسرے پر ٹالا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اس کے سب سے زیادہ حقدار اور اہل تھے اس ذمہ داری کو امت کی محافظت کے خیال سے قبول کر لیا کہ کہیں بلاوجہ اور ناحق خونریزی برپا ہو اور امت کے حالات اس طرح بگڑ جائیں کہ پھر سنبھالے نہ سنبھلیں، نیز اندیشہ تھا کہ دین میں تغیر آجاتا اور اسلام کا ستون ٹوٹ جاتا۔

پھر جب ان سے بیعت کر لی گئی تو اہل شام نے بیعت کی شرط میں یہ مطالبہ رکھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر ان کو قابو دیا جائے اور ان سے قصاص لیا جائے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ آپ لوگ بیعت میں آجائیں اور اپنے حق کا مطالبہ کریں یہ حق تمہیں مل جائیگا، اس پر وہ کہنے لگے کہ آپ تو اس کا استحقاق ہی نہیں رکھتے جبکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ ہیں اور وہ صبح وشام آپ کی نظروں میں رہتے ہیں سو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے اس بارے میں زیادہ درست تھی اور ان کا قول زیادہ صحیح تھا کیونکہ وہ اگر ان سے قصاص لینے لگتے تو ان لوگوں کی حمایت میں قبیلے کے قبیلے اکٹھے ہو جاتے اور ایک تیسری لڑائی چھڑ جاتی۔ لہٰذا آپ نے اس کا انتظار کیا کہ امن کا استحکام ہو اور بیعت عامہ منعقد ہو جائے اور

اولیاء کی طرف سے مجلس حکم میں مطالبہ ختم ہوتا کہ حق کے مطابق فیصلہ صادر ہوسکے اور امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ امام کو قصاص میں تاخیر روا ہے جبکہ قصاص لینے سے فتنہ اٹھے یا افتراق پیدا ہو۔

اور اس کے بعد لکھتے ہیں:

المسألة السادسة: إن الله سبحانه أمر بالصلح قبل القتال، وعين القتال عند البغي فعمل علي بمقتضى حاله فإنه قاتل الباغية التي أرادت الاستبداد على الإمام، ونقض ما رأى من الاجتهاد والتحيز عن دار النبوة ومقر الخلافة بفئة تطلب ما ليس لها طلبه إلا بشرطه من حضور مجلس الحكم والقيام بالحجة على الخصم، ولو فعلوا ذلك ولم يقد علي منهم ما احتاجوا إلى مجاذبة، فإن الكافة كانت تخلعه، والله قد حفظه من ذلك، وصانه. وعمل الحسن رضي الله عنه بمقتضى حاله، فإنه صالح حين استشرى الأمر عليه، وكان ذلك بأسباب سماوية، ومقادير أزلية، ومواعيد من الصادق صادقة .... نفذ الوعد الصادق في قوله: «إن ابني هذا سيد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين». وبقوله: «الخلافة ثلاثون سنة، ثم تعود ملكاً»، فكانت لأبي بكر، وعمر، وعثمان، وعلي، وللحسن منها ثمانية أشهر لا تزيد يوماً ولا تنقص يوماً، فسبحان المحيط لا رب غيره. (٢/ ٢٢٤-٢٢٥)

المسألة الثامنة: قوله: «فإن بغت إحداهما على الأخرى» بناء (ب غ ي) في لسان العرب الطلب قال الله تعالى: «ذلك ما كنا نبغ» ووقع التعبير به هاهنا عمن يبغي ما لا ينبغي على عادة اللغة في تخصيصه ببعض متعلقاته وهو الذي يخرج على

الإمام يبغي خلعه أو يمنع من الدخول في طاعة له، أو يمنع حقاً يوجبه عليه بتأويل، فإن جحده فهو مرتد.... والذي قاتل علي طائفة أبوا الدخول في بيعته، وهم أهل الشام، وطائفة خلعته، وهم أهل النهروان. وأما أصحاب الجمل فإنما خرجوا يطلبون الإصلاح بين الفرقتين، وكان من حق الجميع أن يصلوا إليه ويجلسوا بين يديه، ويطالبوه بما رأوا أنه عليه،فلما تركوا ذلك بأجمعهم صاروا بغاة بجملتهم، فتناولت هذه الآية جميعهم. (٢/ ٢٢٥)

(چھٹا مسئلہ) اللہ سبحانہ نے جنگ سے قبل صلح کا حکم دیا ہے اور بغاوت کے وقت قتال مقرر فرمایا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے وقت کے مقتضی کے مطابق عمل کیا کہ اس باغی جماعت سے قتال کیا جس نے اپنے امام کے خلاف استبداد سے کام لیا اور اس کے اجتہاد کو توڑنے کا ارادہ کیا اور دارالنبوۃ اور مستقر خلافت سے کٹ کر اس جماعت کے ساتھ اپنا مرکز بنایا کہ جو ایسی بات طلب کر رہی تھی کہ جس کے کرنے کا حق بغیر اس شرط پوری کئے یعنی مجلس حکم میں حاضر ہونے اور مدعا علیہم کے خلاف حجت قائم کئے بغیر ان کو حاصل نہ تھا اور اگر وہ لوگ ایسا کرتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر بھی ان سے قصاص نہ لیتے تو ان کو اس کشاکش کی ضرورت ہی نہ پیش آتی کہ سب لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت سے معزول کر دیتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو خلع خلافت سے محفوظ رکھا اور اس سے بچایا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے حالات کے مطابق عمل کیا کہ جب ان کو معاملہ میں الجھاؤ پیش آیا جو اسباب سماوی، تقدیر ازلی اور مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سچے وعدوں کے مطابق تھا تو انہوں نے صلح کر لی.... اور اس طرح مخبر صادق علیہ الصلوۃ والسلام کا وہ سچا وعدہ پورا ہوا جو آپ نے فرمایا تھا کہ ”یہ میرا بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے" نیز آپ نے فرمایا تھا کہ "خلافت تیس سال تک رہے گی پھر بادشاہت آجائے گی" چنانچہ (اسی کے مطابق ان سالوں میں) حضرات ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی خلافت رہی اور منجملہ ان میں آٹھ ماہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ہوئے جس میں ایک دن کی کمی بیشی نہیں، پس پاک ہے وہ ذات جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جس کے علاوہ کوئی دوسرا رب نہیں۔

(آٹھواں مسئلہ) ارشاد باری ہے «فإن بغت إحداهما» (پھر اگر فریقین میں سے کوئی بغاوت کرے) بغی کا مادہ عربی زبان میں طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے «ذلک ما کنا نبغ» (یہی ہے وہ چیز جسے ہم چاہتے تھے) اور یہاں یہ تعبیر لغت کے اس دستور کے مطابق ہے کہ لفظ کی اس کے بعض متعلقات میں تخصیص کرلی جاتی ہے اور یہاں اس سے مراد وہ فریق ہے جو ایسی بات طلب کرنے لگے جو اسے طلب نہ کرنی چاہیے اور یہ فریق ہے جو امام کے خلاف خروج کر کے اس کو معزول کرنا چاہیے یا اس کی اطاعت میں داخل ہونے سے مانع ہو یا امام جو حق اس پر واجب کرے اس کو ادا نہ کرے لیکن اس کا یہ طرز عمل کسی تاویل کی بنا پر ہو ورنہ اگر جانتے بوجھتے تکذیب کرے تو وہ مرتد ہے.... اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جن لوگوں سے قتال کیا ان میں ایک جماعت تو وہ تھی جس نے آپ کی بیعت میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا یہ اہل شام تھے اور ایک جماعت وہ تھی جس نے آپ کی بیعت توڑی تھی، یہ اہل نہروان (خوارج) تھے، رہے اصحاب جمل تو یہ لوگ فریقین میں اصلاح کی غرض سے نکلے تھے، تاہم سب کا حق یہ تھا کہ وہ آپ کے پاس پہنچتے اور آپ کے سامنے بیٹھ کر ان سے ان چیزوں کا مطالبہ کرتے جن کے پورا کرنے کی ذمہ داری وہ ان پر ڈالتے

تھے اور جب سب نے اس چیز کو چھوڑا تو سب باغی ٹھہرے اور یہ آیت سب پر شامل ہے۔

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''منہاج السنۃ'' میں لکھتے ہیں:

ولا كان قتاله مباحاً لكونه عاجزاً عن قتل قتلة عثمان بل لو كان قادراً على قتل قتلة عثمان وقدر أنه ترك هذا الواجب إما متأولاً وإما مذنباً لم يكن ذلك موجباً لتفريق الجماعة والامتناع عن مباعيته ولمقاتلته بل كانت مبايعته على كل حال أصلح في الدين وأنفع للمسلمين وأطوع لله ولرسوله من ترك مبايعته فقد ثبت في ''الصحيح'' عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «إن الله يرضى لكم ثلاثاً: أن تعبدوه ولا تشركوا به شيئاً، وأن تعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا، وأن تناصحوا من ولاه الله أمركم»، وثبت في ''الصحيح'' عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «على المرء المسلم السمع والكاعة في عسره ويسره ومنشطه ومكرهه وأثره عليه ما لم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة»، وفي ''الصحيحين'' عن عبادة رضي الله عنه قال: ''بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة في يسرنا وعسرنا ومنشطنا ومكرهنا وأثرة علينا وأن لا ننازع الأمر أهله وأن نقول أو نقوم بالحق حيث ما كنا، لا نخاف في الله لومة لائم''، وفي ''الصحيح'' عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «من رأى من أمير شيئاً يكرهه فليصبر عليه فإنه من فارق الجماعة قيد شبر فمات فميتته ميتى جاهلية» وفي ''الصحيح'' من حديث ابن عمر رضي الله عنه قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: «من

خلع يداً من طاعة لقى الله يوم القيامة ولا حجة له ومن مات وليس في عنقه بيعه مات ميتة جاهلية»، وفي ”الصحيح“ عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا يزكيهم ولا ينظر إليهم ولهم عذاب أليم: رجل لا يبايع إماماً إلا لدنيا إن أعطاه منها رضى وإن منع سخط» الحديث، وفي ”الصحيح“ عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «اسمعوا وأطيعوا وإن استعمل عليكم عبد حبشي كأن رأسه زبيبة»، وعلي رضي الله عنه كان قد بايعه أهل الكوفة ولم يكن في وقته أحق منه بالخلافة وهو خليفة راشد تجب طاعته.

ومعلوم أن قتل القاتل إنما شرع عصمة للدماء فإذا أفضى قتل الطائفة القليلة إلى قتل أضعافها لم يكن هذا طاعة ولا مصلحة وقد قتل بصفين أضعاف أضعاف قتلة عثمان وأيضاً فقول النبي صلى الله عليه وسلم في الحديث المتفق على صحته: «تمرق مارقة على حين فرقة من المسلمين تقتلهم أدنى الطائفتين إلى الحق» يدل على أن علياً وأصحابه أدنى إلى الحق من معاوية وأصحابه فلا يكون معاوية وأصحابه في قتالهم لعلي أدنى إلى الحق. وكذلك حديث عمار بن ياسر: «تقتلك الفئة الباغية» قد رواه مسلم في صحيحه من غير وجه ورواه البخاري لكن في كثير من النسخ لم يذكره تاماً. وأما تأويل من تأوله أن علياً وأصحابه قتلوه وأن الباغية الطالبة بدم عثمان فهذا من التأويلات الظاهرة الفساد التي يظهر فسادها للعامة والخاصة .... والحديث ثابت صحيح عن النبي صلى الله عليه وسلم عند أهل العلم بالحديث

"والذين قتلوه هم الذين باشروا قتله" والحديث أطلق فيه لفظ "البغى" لم يقيده بمفعول كما قال تعالى: "لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا" وكما قال النبي صلى الله عليه وسلم: "الذين هم فيكم تبع لا يبغون أهلاً ولا مالاً"، ولفظ "البغى" إذا أطلق فهو الظلم كما قال تعالى: "فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي" وقال: "فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ"، وأيضاً فإن النبي صلى الله عليه وسلم ذكر هذا لما كانوا ينقلون اللبن لبناء المسجد وكانوا ينقلون لبنة لبنة وكان عمار ينقل لبنتين لبنتين، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "ويح عمار! تقتله الفئة الباغية يدعوهم إلى الجنة ويدعونه إلى النار"، وهذا ليس فيه ذم لعمار بل مدح له ولو كان القاتلون له مصيبين في قتله لم يكن مدحاً له وليس في كونهم يطلبون دم عثمان ما يوجب مدحه وكذلك من تأول قاتله بأنهم الطائفة التي قاتل معها فتأويله ظاهر الفساد ويلزمهم ما ألزمهم إياه علي وهو أن يكون النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه قد قتلوا كل من قتل معهم في الغزو كحمزة وغيره وقد يقال فلان قتل فلاناً إذا أمره بأمر كان فيه حتفه ولكن هذا مع القرينة لا يقال عند الإطلاق بل القاتل عند الإطلاق الذي قتله دون الذي أمره، ثم هذا يقال لمن أمر غيره وعمار لم يأمره أحد بقتال أصحاب معاوية بل هو كان من أحرص الناس على قتالهم وأشدهم رغبة في ذلك وكان حرصه على ذلك أعظم من حرص غيره وكان هو يحض علياً وغيره على قتالهم ولهذا لم يذهب أحد من أهل العلم الذين تذكر مقالاتهم إلى هذا التأويل. (۲/ ۲۱۰ تا ۲۱۲)

اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ مباح تھی کیونکہ وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے عاجز تھے بلکہ اگر وہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر قادر بھی ہوتے اور فرض کیا جائے کہ انہوں نے اس واجب کو ترک بھی کر دیا تھا، یا تو تاویل کی بنا پر یا مرتکب گناہ ہو کر تب بھی یہ چیز جماعت میں تفرقہ ڈالنے اور ان کے بیعت سے باز رہنے اور ان سے جنگ چھیڑ دینے کا موجب نہ تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لینا ان کی بیعت نہ کرنے کی بہ نسبت ہر حال میں شرع کے لحاظ سے زیادہ مناسب، مسلمانوں کے لئے زیادہ سود مند اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لحاظسے زیادہ بہتر تھا کیونکہ حدیث میں آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے کہ ''اللہ تمہارے لئے تین باتوں کو پسند فرماتا ہے: (۱) یہ کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ ذرا بھی کسی کو شریک نہ کرو (۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو (۳) یہ کہ اس کی خیر خواہی کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملہ کا والی بنایا ہے، نیز حدیث صحیح میں ثابت ہے کہ ''مرد مسلمان پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے تنگی ہو یا فراخی، خوشی کی حالت ہو یا ناخوشی کی اور اس صورت میں بھی کہ جب اس پر دوسرے کو ترجیح دی جا رہی ہو جب تک کہ امیر معصیت کا حکم نہ دے، پھر جب معصیت کا حکم دے تو اب نہ سننا ہے نہ اطاعت کرنا''، اور ''صحیحین'' میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''ہم نے آنحضرت ﷺ سے سننے اور کہنا ماننے پر بیعت کی ہے، اپنی فراخی میں اور اپنی تنگی میں اور اپنی خوشی میں اور اپنی ناخوشی میں اور اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دیدی جائے جب بھی اور اس امر پر کہ اولی الامر سے ان کی حکومت کے باب میں جھگڑا نہیں کریں گے اور ہم جہاں بھی ہوں گے حق کہیں گے یا حق پر قائم رہیں گے اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی

ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔" اور حدیث "صحیح" میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات جو اسے ناپسند ہو تو اس پر صبر کرے کیونکہ جس شخص نے جماعت کو بالشت بھر بھی چھوڑ دیا اور اس کو موت آگئی تو اس کی موت جاہلیت[148] کی موت ہوگی، اور حدیث "صحیح" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے وارد ہے کہ "میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے اطاعت سے اپنا ہاتھ اٹھالیا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی اور جس کو اس حال میں موت آئی کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ تھی تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔ اور حدیث "صحیح" میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ "تین شخص ایسے ہیں کہ جن سے نہ اللہ تعالیٰ کلام فرمائے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے گا اور ان کو دردناک عذاب ہے (۱) وہ شخص جس نے امام سے صرف دنیا کے لئے بیعت کی کہ اگر اس نے اس کو کچھ دیدیا تو وہ راضی ہوگیا اور جو نہ دیا تو ناراض ہوگیا، آخر حدیث تک (مصنف نے باقی دو شخصوں کا بنظر اختصار ذکر نہیں کیا) اور حدیث "صحیح" میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ " سنو اور کہنا مانو اگرچہ تم پر حبشی غلام عامل بنادیا جائے جس کا سر (اتنا چھوٹا ہو) گویا کہ کشمکش ہے"۔ اور علی رضی اللہ عنہ سے اہل کوفہ نے مدینہ میں بیعت کرلی تھی اور ان کے وقت میں ان سے زیادہ خلافت کا کوئی حقدار نہ تھا اور وہ خلیفہ راشد تھے جن کی اطاعت واجب تھی۔

148۔ یہاں جاہلیت سے کفر مراد نہیں بلکہ جاہلیت کی افراتفری اور بدنظمی مراد ہے۔

اور یہ معلوم ہے کہ قاتل کو قتل کرنا اس لئے روا ہے کہ خون ریزی سے بچا جائے پھر جب ایک چھوٹی سی جماعت کا قتل کرنا اس کے کئی گنا کو قتل کرنے کا سبب بن جائے تو یہ نہ طاعت ہوئی نہ مصلحت، حالانکہ جنگ صفین میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے کئی گنوں کے بھی کئی گنے قتل ہو گئے۔

نیز اس حدیث میں جس کی صحت پر اتفاق ہے آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''مسلمانوں کے افتراق پر دین سے نکلنے والی ایک جماعت نکلے گی جس کو وہ جماعت قتل کرے گی جو فریقین میں حق سے زیادہ قریب ہو گی'' اس بات کو بتاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کی نسبت حق سے زیادہ قریب تھے لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال میں حق سے زیادہ قریب نہیں ہو سکتے۔

اور اسی طرح حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ ''تم کو باغی جماعت قتل کرے گی'' اس کو مسلم نے اپنی ''صحیح'' میں متعدد طرق سے روایت کیا ہے اور بخاری نے بھی اس کو روایت کیا ہے لیکن بہت سے نسخوں میں وہ بتمامہ مذکور نہیں ہے۔

اور جن لوگوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب نے انہیں قتل کیا تھا اور ''باغی'' سے مراد وہ جماعت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی طالب تھی تو یہ تاویل ان تاویلات میں سے ہے جن کا فساد اتنا ظاہر ہے کہ اس کو عام خاص سب سمجھتے ہیں اور یہ حدیث علماء حدیث کے نزدیک آنحضرت ﷺ سے ثابت اور صحیح ہے اور عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل وہی لوگ ہیں جنہوں نے ان کو قتل کیا تھا، نیز حدیث میں لفظ بغی مطلق وارد ہوا ہے اس کو کسی مفعول کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا جس طرح کہ ارشاد باری ﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ میں اور حدیث نبوی

«الذین هم فیکم تبع لایبغون أهلاً ولا مالاً» میں ہے اور لفظ "بغی" جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے ظلم ہی مراد ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے «فإن بغت إحداهما علی الأخری فقاتلوا التي تبغي» اور دوسری جگہ فرمایا ہے «فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَاد».

نیز آنحضرت ﷺ نے اس حدیث کو اس وقت بیان فرمایا تھا جب کہ لوگ مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے اینٹیں لا رہے تھے سب تو ایک ایک اینٹ لاتے اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو اینٹیں لاتے تھے اس پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ "ہائے عمار! کو باغی جماعت قتل کرے گی یہ تو ان کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ ان کو آگ کی طرف بلائیں گے"، اس حدیث میں عمار رضی اللہ عنہ کی مذمت نہیں بلکہ ان کی مدح ہے۔ اگر اُن کے قاتل انہیں قتل کرنے میں حق بجانب ہوتے تو یہ عمار رضی اللہ عنہ کی مدح نہیں ہو سکتی اور ان لوگوں کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا خواہاں ہونے میں بھی عمار رضی اللہ عنہ کی مدح نہیں ہوتی۔

اور اسی طرح جس نے ان کے قاتل کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ وہ جماعت تھی جو ان کے ساتھ مل کر لڑی تھی اس کی تاویل کا فساد بھی ظاہر ہے اور ان پر وہی الزام آتا ہے جو الزام ان پر حضرت علی نے لگایا تھا اور وہ یہ ہے کہ (اس تاویل پر تو) آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہر اس شخص کے قاتل ٹھہرے جو آپ کے ساتھ جہاد میں شہید ہوا تھا جیسے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور بے شک جب کوئی شخص کسی کو ایسے کام کا حکم دے کہ جس میں اس کو موت واقع ہو جائے تو اس کے بارے میں بھی یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ "فلاں نے فلاں کو قتل کر دیا"، لیکن اس کے ساتھ کوئی قرینہ ہوتا ہے (بغیر قرینے کے) مطلقاً اس طرح نہیں بولا جاتا، بلکہ جب مطلقاً بولا جاتا ہے تو قاتل

اسی کو کہتے ہیں جو قتل کرے، حکم کرنے والے کو نہیں پھر یہ بھی اس شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جسے کوئی دوسرا ایسا کام کرنے کو کہے اور عمار رضی اللہ عنہ کو تو کسی نے بھی اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ وہ تو خود ہی سب سے زیادہ ان کے لڑنے پر حریص اور سب سے بڑھ کر اس کے خواہش مند تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بھی ان کے قتال پر یہی ترغیب دلاتے تھے اور اسی بنا پر کوئی شخص بھی ان اہل علم میں سے کہ جن کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں اس تاویل کی طرف نہیں گیا ہے۔

ان حضرات کی تصریحات سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور جب ان سے امت نے بیعت کی ہے اس وقت ان سے زیادہ کوئی اور خلافت کا حقدار اور اہل نہ تھا۔

(۲) جن لوگوں نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی وہ سب بحکم شرع باغی تھے اس لئے ان سے قتال کرنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مورد طعن نہیں بنایا جاسکتا۔

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طالبینِ قصاص سے کہا تھا کہ وہ بیعت کر لیں اور مجلس قضاء میں آکر دعوی دائر کر کے ملزمین کے خلاف ثبوت فراہم کریں، مگر فریق مخالف نے ان کی یہ تجویز تسلیم نہیں کی۔

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے پورے دور خلافت میں عدل و انصاف کے خلاف کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوئی جس کی بنا پر ان کی بیعت کا توڑنا ضروری ہو جاتا۔

(۵) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہر حال میں ان سے بیعت کر لینا مناسب تھا ان کے اختلاف و بغاوت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قوت کو بہت نقصان پہنچایا۔

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت اس وقت کی بہترین جماعت (خیر فرقہ) تھی، جو حق سے زیادہ قریب تھی۔

(۷) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کو محض اپنی ذمہ داری کے خیال سے قبول کیا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے اقتباسات میں مؤلف کی تلبیسات

اب شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ان تمام تصریحات کو جو سابق میں گذر چکی ہیں اپنے ذہن میں رکھ کر حضرت ممدوح نے فتنہ شہادت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جو کچھ سپرد قلم فرمایا ہے ملاحظہ فرمائیں اور پھر عباسی صاحب کے اس حوالہ کا جائزہ لیں جو انہوں نے شاہ صاحب رحمہ اللہ موصوف کی اسی عبارت سے ان کے مقصد کے خلاف پیش کیا ہے اور یہ دیکھیں کہ حضرت ممدوح کی عبارت کو اس کے سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے انہوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کی پوری عبارت اس سلسلہ میں یہ ہے:

"باید دانست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در احادیث متواترہ بالمعنی افادہ فرمودند کہ حضرت عثمان مقتول خواہد شد، و نزدیک بقتل او فتنہ عظیمہ خواہد برخاست کہ تغیر اوضاع و رسوم مردم کند و بلائی آن مستطیر باشد زمانی کہ پیش ازاں فتنہ است آن را باوصاف مدح ستودند وما بعد آن را باصناف ذم نکوہیدند واستقصا نمودند در بیان آن فتنہ تا آنکہ مطابقت موصوف بر آنچہ واقع شد بر ہیچ فردی مخفی نماند، و بابلغ بیان واضح ساختند کہ انتظام خلافتِ خاصہ بآن فتنہ منقطع خواہد شد وبقیہ برکات ایام نبوت روی باختفا خواہد آورد واین معنی را تا بحدے ایضاح کردند کہ پردہ از روی کار برخاست وحجۃ اللہ بثبوت آن قائم شد وآن خبر در خارج متحقق گشت بآتوجہ کہ حضرت مرتضٰی باوجود رسوخِ قدم در سوابق اسلامیہ ووفور اوصاف خلافتِ خاصہ وانعقاد بیعت برائی او

ووجوب انقیاد رعیت فی حکم اللہ بہ نسبت او متمکن نشد در خلافت و در اقطار ارض حکم او نافذ نگشت و تمامہ مسلمین تحت حکم او سر فرو دنیادند و جہاد در زمان وی رضی اللہ عنہ بالکلیہ منقطع شد و افتراق کلمہ مسلمین بظہور پیوست و اختلاف ایشان رخت بعدم کشید و مردم بحروب عظیمہ با او پیش آمدند و دست او را از تصرف ملک کوتاہ ساختند و ہر روز دائرہ سلطنت او لاسیما بعد تحکیم تنگ تر شدن گرفت تا آنکہ در آخر بجز کوفہ و ماحول آن برائی ایشان صافی نماند و ہر چند این خللہا در صفات کاملہ نفسانیہ ایشان خللی نینداخت لیکن مقاصد خلافت علی وجہہا متحقق نگشت، و بعد حضرت مرتضی چون معاویہ بن ابی سفیان متمکن شد و اتفاق ناس بروی بحصول پیوست و فُرقت جماعہ مسلمین از میان برخاست وی سوابق اسلامیہ نداشت ولوازم خلافتِ خاصہ در وی متحقق نبود بعد ازان بادشاہان دیگر از مرکز حق دور تر افتادند کما لا یخفی، پس خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بانقطاع خلافتِ خاصہ منتظمہ نافذہ ازین جہت متحقق گشت۔ (۱۲۲،۱۲۳/۱)

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ نے ان احادیث میں جن کا مضمون متواتر ثابت ہے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں گے اور ان کی شہادت کے قریب ایک ایسا عظیم فتنہ برپا ہوگا جو لوگوں کے طور طریق بدل کے رکھ دے گا اور جس کی بلا عام ہو گی، اور اس فتنہ سے پہلے کے زمانہ کو آپ نے انواع واقسام کی خوبیوں سے سراہا ہے اور اس کے بعد کے زمانہ کو طرح طرح کی ہر برائیوں سے یاد فرمایا ہے، آپ نے اس فتنہ کے بیان میں اس درجہ اہتمام فرمایا کہ جو کچھ واقع ہوا اس پر آپ کے بیان کو تطبیق دینا کسی شخص پر پوشیدہ نہ رہا اور آپ نے نہایت وضاحت سے بتایا کہ خلافت خاصہ کا انتظام اس فتنہ پر ختم ہو جائے گا اور زمانہ نبوت کا بقیہ برکات چھننے لگیں گی اور اس بات کی آپ نے اس درجہ وضاحت فرمائی کہ

حقیقت کے چہرہ سے پردہ اُٹھ گیا اور اللہ کی حجت اس کے ثبوت سے قائم ہوگئی اور یہ خبر خارج میں اس طرح متحقق ہوئی کہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ باوجود اسلامی خدمات میں راسخ القدم ہونے اور خلافت خاصہ کے بکثرت اوصاف رکھنے اور ان کے لئے بیعت منعقد ہو جانے اور حکم الٰہی میں رعیت کے لئے ان کی اطاعت کے واجب ہونے کے خلافت میں اقتدار نہ پاسکے، اور اطراف زمین میں ان کا حکم نافذ نہ ہو سکا اور تمام مسلمان ان کے حکم پر گردن نہ جھکا سکے، اور جہاد ان کے زمانہ میں بالکل بند ہو گیا، اور مسلمانوں میں پھوٹ پیدا ہو گئی اور ان کی باہمی الفت کالعدم ہوئی اور لوگوں نے ان کے ساتھ سخت لڑائیاں لڑیں، اور ان کے ہاتھ کو ملک پر تصرف کرنے کے لئے بڑھنے نہ دیا اور ہر روز ان کی سلطنت کا دائرہ خصوصاً تحکیم کے بعد زیادہ تنگ ہونے لگا، یہاں تک کہ آخر میں بجز کوفہ اور اس کے مضافات کے ان کے لئے صاف نہ رہا اور اگرچہ ان رخنوں کے پڑ جانے سے آپ کے ذاتی اوصاف کاملہ پر کچھ اثر نہیں پڑا لیکن خلافت کے مقاصد اپنی اصلی صورت میں ظاہر نہ ہوئے اور نہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد جب معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو اقتدار ملا اور لوگوں کا اتفاق ان پر ہو گیا اور مسلمانوں کی آپس کی پھوٹ جاتی رہی تو وہ سوابق اسلامیہ [۱۴۹] نہیں رکھتے تھے اور خلافت خاصہ کے لوازم میں موجود نہ تھے، ان کے بعد جیسا کہ ظاہر ہے دوسرے بادشاہ مرکز حق سے اور دور جا پڑے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے خلافت خاصہ منتظمہ نافذہ کے ختم ہو جانے کی جو خبر دی تھی وہ اس طرح پر پوری ہوئی۔

149۔ سوابق جمع ہے سابقہ کی جس کے معنی ہیں اگلی چیز، یہاں وہ اسلامی خدمات مراد ہیں جو= =ابتدا اسلام میں آنحضرت ﷺ کی معیت میں اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں انجام دی گئیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ موصوف کی اس تمام عبارت میں سے صرف دو اقتباسات کو جن پر خط کھینچ دیا گیا ہے مؤلف نے اپنے مفید مطلب سمجھا، لہٰذا ایک کو "اموی خلافت کا پس منظر" بتاتے ہوئے "حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت اور سبائی پارٹی" کے زیر عنوان نقل کر دیا اور دوسرے کو "خلیفہ اور منصبِ خلافت" پر بحث کرتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب میں جگہ دی، ناظرین نے اس کارروائی سے اندازہ لگالیا ہو گا کہ مؤلف کی نیت صحیح نہیں ہے، وہ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ہدف ملامت بنانا چاہتے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ راشد ثابت کرنا، حالانکہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا عبارت ان دونوں سے سخت ابا کرتی ہے۔

جناب مؤلف کو اپنی بے لاگ تحقیق میں اولاً تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس پوری عبارت میں بس اتنی چیز قابل نقل نظر آئی کہ:

> "حضرت علی کے زمانہ میں جہاد بالکلیہ منقطع ہو گیا، افتراق کلمہ مسلمین ظہور میں آیا اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی سلطنت کا دائرہ ہر روز خاص کر ثالثی کے بعد زیادہ تنگ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آخر میں سوائے کوفہ کے اور اس کے آس پاس کے اور کچھ ان کے لئے باقی نہ رہا۔"

اور پھر اس پر غضب یہ کیا کہ اس تمام افسوسناک حالت کی ذمہ داری اس تمہید کے ساتھ کہ:

> "حضرت موصوف (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی یہ خطائے اجتہادی تھی یا بے بسی و مجبوری نتیجہ یہ ہوا کہ الخ"

خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر ڈال دی کہ ان کی غلطی سے ایسا ہوا، حالانکہ شاہ صاحب ممدوح رحمہ اللہ کا یہ ہرگز مقصد نہیں، ان کا فرمانا یہ ہے کہ اس فتنہ کی بدولت ایسی ایسی خرابیاں پیدا ہوئیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ اور صاحب کمال کے ہوتے ہوئے کہ جن کی اطاعت بحکم شرع اس وقت واجب تھی

لوگ ان سے جنگ وجدل پر آمادہ ہو گئے جس کی بنا پر خلافت خاصہ کا انتظام ٹوٹ گیا اور ایام نبوت کے بقیہ برکات پوشیدہ ہونے لگے اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اتفاق عام ہوا تو وہ ان اوصاف کے مالک نہ تھے جو خلفاء راشدین میں تھے، لیکن مؤلف نے ابلہ فریبی کے لئے دونوں جگہ عبارت کو اپنی سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام آئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خوبی ثابت ہو جائے، حالانکہ خود شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تصریح کر دی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف کمال پر اس صورت حال میں کچھ خلل نہیں آتا۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے عبارت مذکورہ بالا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق حسب ذیل امور کی صراحت کی ہے:

(۱) ”رسوخ قدم در سوابق اسلامیہ“ یعنی سوابق اسلامیہ میں ثابت قدم ہونا۔ سوابق اسلامیہ کی تشریح خود شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ”ازالۃ الخفاء“ میں ان الفاظ سے کی ہے:

> ”اعانت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در اعلای کلمۃ اللہ بحضور آن حضرت و ایام حیاۃ او صلی اللہ علیہ وسلم پس مسمی است بسوابق اسلامیہ۔“ (ج ۱ ص ۱۱۴)
>
> اللہ کا یوں بول بالا کرنے میں آنحضرت ﷺ کی اعانت کرنا خود آپ کے حضور اور آپ کی حیات طیبہ میں اس کا نام ہے ”سوابق اسلامیہ۔“

(۲) ”وفور اوصاف خلافت خاصہ“ یعنی اوصاف خلافت نبوت کا آپ میں بکثرت موجود ہونا ان دونوں باتوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استحقاق خلافت ثابت ہوتا ہے۔

(۳) ”انعقاد بیعت برائے او“ یعنی آپ کے لئے بیعت کا منعقد ہو جانا جس سے آپ کی صحت خلافت معلوم ہوتی ہے، حالانکہ عباسی صاحب اس کے سرے سے منکر ہیں۔

(۴) ”وجوب انقیاد رعیت فی حکم اللہ بہ نسبت او“ حکم الٰہی کے اعتبار سے رعیت کے حق میں آپ کی اطاعت کا واجب ہونا۔ جس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ آپ کے مطیع و منقاد نہ ہوئے باغی تھے۔

لیکن مؤلف نے ان چاروں باتوں کو سرے سے نظر انداز کر دیا، کیونکہ وہ اگر ان کو بیان کر دیتے تو ہر شخص بآسانی فیصلہ کر لیتا کہ ان لڑائیوں میں خطا کس کی تھی اور حق پر کون تھا اور شرعاً و عقلاً ان حالات کی ذمہ داری کس پر آتی ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں انہوں نے ”ازالۃ الخفاء“ سے بس اتنی عبارت ذکر کی ہے جس میں ان پر اتفاق عام ہو جانے کا بیان ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں جو یہ لکھا تھا کہ:

”وے سوابق اسلامیہ نداشت، ولوازم خلافت خاصہ در وے متحقق نبود“

وہ سب چھوڑ گئے کیونکہ اگر وہ پوری عبارت کو ذکر کر دیتے تو ناظرین کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی خلافت خلافتِ راشدہ نہ تھی، اسی طرح شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کے بعد جو یہ فرمایا ہے کہ:

”بعد ازاں بادشاہان دیگر از مرکز حق دور تر افتادند کما لا یخفی“

اس کا بھی سرے سے کچھ ذکر نہیں، کیونکہ اس سے ان کے امیر المؤمنین یزید کی قلعی کھلتی کہ وہ مرکز حق سے بہت دور جا پڑا تھا۔ یہی وہ بے لاگ تحقیق و ریسرچ ہے جو مولف کا خاص حصہ ہے۔

پھر اس جرأت کو ملاحظہ فرمائیے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی اس تصریح کے ہوتے ہوئے آپ نے عہد شیخین، دور مرتضوی اور امارت معاویہ میں باہم موازنہ

کر کے ''ازالۃ الخفاء'' کی اس دوسری خط کشیدہ عبارت کو خود حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے خلاف مقصد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ راشد ثابت کرنے کے لئے کس طرح استعمال کیا ہے فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں۔''(ص ۳۳۳)

''.... حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا زمانہ اخوت مساوات اور یکجہتی کا مثالیہ زمانہ تھا، بالفاظ دیگر خلافتِ خاصہ علی منہاج النبوۃ کا زمانہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس مبارک عہد کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

''تمام مسلمین در زمان ایشان باہم مؤتلف و بایک دیگر متراحم و بر کفار شدید و بر جہاد متوافق، نام مخالفت در میان ایشان واقع نہ۔ سپاہ و رعایا خلیفہ را از جان خود دوست دارد، و خلیفہ بر رعایا و سپاہ از پدر مشفق، مہربان تر۔''(''ازالۃ الخفاء'' ۱۴۹/۱ طبع اول)

ترجمہ: تمام مسلمین ان کے (شیخین کے رضی اللہ عنہما) زمانہ میں باہم متحد اور ایک دوسرے کے مہربان تھے، کفار پر شدید اور جہاد پر متفق تھے، مخالفت کا نام بھی ان کے درمیان نہیں آیا تھا، سپاہ اور رعایا خلیفہ کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتی اور خلیفہ رعایا اور سپاہ پر باپ سے زیادہ مشفق اور مہربان تھے۔[۱۵۰]

اس زمانہ کی برکات خلیفۂ سوئم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک باقی رہیں،[۱۵۱] اس خلافت کے اواخر میں سبائی منافقین کی سازش سے جو فتنہ اٹھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ

150۔ یہاں مؤلف نے آخر کا ایک فقرہ چھوڑ دیا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

151۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے عہد شیخین اور عہد ذی النورین رضی اللہ عنہم کا جو باہمی موازنہ کیا تھا وہ حذف کر دیا۔

سوئم مظلومانہ شہید کر دیئے گئے، سبائی سازشوں کا مقصد پورا ہو گیا کہ جماعت مسلمین میں یوں پہلی مرتبہ تفرقہ پڑ گیا۔[152] اگرچہ متعدد صحابہ متحارب فریقین میں مصالحت کے ساعی رہے اور بہت سے غیر جانبدار تاہم جیسا ابتدائی اوراق میں مختصراً بیان ہوا باہمی خانہ جنگیوں سے انتظام خلافت صحیح طور سے قائم نہ ہو سکا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مقتل عثمان رضی اللہ عنہ سے فتنہ رونما ہونے کے بارے میں احادیث متواترہ بالمعنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

"دریں وقت خلافت علی منہاج النبوت منقطع شود و ملک عضوض پدید آید، و معنی ملک عضوض دلالت می کند بر حروب و مقاتلات و جهیدن یکی بر دیگر و منازعت یکے بادیگرے۔"
("ازالۃ الخفاء" طبع اول ۱۴۲/۱)

ترجمہ: اس وقت خلافت علی منہاج نبوت منقطع ہو جائے گی اور ملک عضوض ظاہر ہو گا اور ملک عضوض کے معنی دلالت کرتے ہیں جنگوں اور قتال پر اور ایک کا دوسرے پر چڑھائی کرنا اور ایک کا دوسرے سے جھگڑنا۔"[153]

152۔ اس تفرقہ میں مؤلف کو صرف سبائی یاد رہے اور ان نواصب و خوارج کو بالکل بھول گئے جو اس آگ کو برابر ہوا دے رہے تھے۔

153۔ مقتل عثمان رضی اللہ عنہ سے لیکر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت تک = =مؤلف کو ملک عضوض کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا اور ستم یہ کہ اس پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ سے سند لا رہے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت راشدہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کو بادشاہی قرار دیتے ہیں اور خلافت عضوض کا زمانہ خلفاء اربعہ کے بعد بتلاتے ہیں۔ مؤلف صاحب اس بات پر تو بڑے چراغ پا ہوئے ہیں کہ ایک فاطمی عالم نے حضرت

(ص ۳۴۷، ۳۴۴)

"اپنے والد ماجد کی آخری وصیت کی متابعت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بعد صلح بیعت کر لی[١٥٤] اتحاد المسلمین کی پھر وہی کچھ کیفیت رونما ہوئی جو خلفاء ثلاثہ کے مبارک زمانہ میں تھی[١٥٥] اس خوشی میں صحابہ اور تابعین نے اس سال کا نام ہی عام الجماعہ رکھا، یعنی جماعت مسلمین کے اتحاد و اتفاق کا سال، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد تقریباً بیس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہے اور بے نظیر حسن تدبیر سے تمام فتنہ پرورانہ سرگرمیوں کو دور کر کے ہر خطہ مملکت میں امن وامان کو بحال کیا۔"(۳۳۸)

معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو ملک عضوض کیوں بتادیا، مگر خود عہد مرتضوی کو ملک عضوض بتاتے ہوئے انہیں ذرا شرم نہ آئی۔ (ملاحظہ ہو "عرض مؤلف" طبع دوم ص ۳۵، ۳۶)

154۔ یہ محض جھوٹ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں کوئی وصیت نہیں کی۔ مؤلف نے اس سلسلہ میں کوئی مستند یا غیر مستند حوالہ پیش نہیں کیا عجب نہیں جو یہ بات خود ان کی خانہ ساز ہو۔

155۔ یہ مؤلف کا خیال ہے ورنہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان اس سلسلہ میں یہ ہے کہ:

"لوگوں نے ناخوش دلی سے ہمارے ساتھ اطاعت کا معاملہ کیا ہے اور ہم نے غصہ کو دباتے ہوئے ان کے ساتھ حلم کا۔ اگر ہم نے اپنے حلم کو واپس لے لیا تو وہ اپنی اطاعت کو واپس لے لیں گے۔"

(یہ ہیں وہ الفاظ جو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو اپنے پدر بزرگوار کے خون ناحق کا قصاص لینے سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہے تھے اور جس کی تفصیل حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی "منہاج السنہ" کے حوالہ سے ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔)

''چنانچہ امت کے داخلی وخارجی تمام تعمیری کام جو پچھلے چار برس کی طوائف الملوکی [156] سے رکے پڑے تھے اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تیزی سے شروع کیے، ہر طرف خوشی اور مرفہ الحالی کی لہریں دوڑ گئیں، امیر المؤمنین کا اصول حکمرانی حلم و کرم، عدل و انصاف، جود وسخا تھا جس سے رعایا کے محبوب بن گئے تھے۔ [157] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''كانت سيرة معاوية مع رعيته من خيار سيرة الولاة، وكان رعيته يحبونه'' [158] (یعنی حضرت معاویہ

156۔ دور مرتضوی کو ''طوائف الملوکی'' تعبیر کرنا بڑی خیرہ چشمی اور گستاخی ہے۔ مؤلف نے یہ نہ سوچا کہ اس ''طوائف الملوکی'' کی ذمہ داری کس کے سر آئے گی۔ حضرت معاویہ کے یا حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے؟

157۔ بے شک لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ اوصاف ان سے کہیں زیادہ تھے۔

158۔ یہاں مؤلف نے شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پوری عبارت نقل نہیں کی جو حسب ذیل ہے:

وأما قوله: ولى معاوية الشام فأحدث من الفتن ما أحدثه فالجواب أن معاوية إنما ولاه عمر بن الخطاب رضي الله عنه لما مات أخوه يزيد بن أبي سفيان ولاه عمر مكان أخيه واستمر في ولاية عثمان وزاده عثمان في الولاية وكانت سيرة معاوية مع رعيته من خيار سير الولاة وكانت رعيته يحبونه. وقد ثبت في ''الصحيحين'' عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «خيار أئمتكم الذين تحبونهم ويحبونكم وتصلون عليهم ويصلون عليكم وشرار أئمتكم الذين تبغضونه ويبغضونكم وتلعنونهم ويلعنونكم».

وإنما ظهر الأحداث من معاوية في الفتنة لما قتل عثمان ولما قتل عثمان كانت الفتنة شاملة لأكثر الناس لم يختص بها معاوية بل كان معاوية= =أطلب للسلامة من كثير منهم وأبعد عن الشر من كثير منهم ومعاوية كان خيراً من الأشتر النخعي ومن محمد بن أبي بكر ومن عبيد الله بن عمر

بن الخطاب ومن أبی الأعور السلمی ومن هاشم بن هاشم بن هاشم المرقال ومن الأشعث بن قيس الكندي ومن بسر بن أبي أرطاة وغير هؤلاء من الذين كانوا معه ومع علي بن أبي طالب رضي الله عنهما. (۳/ ۱۷۹)

اور مؤلف (حسین حلی رافضی) کا یہ کہنا کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو شام کا والی بنایا تو اس نے نت نئے فتنے برپا کیے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو تو حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے والی بنایا تھا، چنانچہ جب ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان ہی کو والی کر دیا عہد عثمانی میں یہ برقرار رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی ولایت کے حدود میں اور اضافہ فرما دیا ان کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ بہترین والیوں کا سا تھا، ان کی رعیت ان سے محبت کرتی تھی، "صحیحین" میں آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تمہارے بہترین ائمہ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کو دعائیں دو اور وہ تمہیں دعائیں دیں اور تمہارے بدترین ائمہ وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔"

اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے فتنہ میں نئی طرز عمل کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) شہید کر دیئے گئے اور جس وقت ان کی شہادت ہوئی تو اکثر لوگ فتنہ میں مبتلا ہو چکے تھے، اس بارے میں خصوصیت نہ تھی بلکہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) تو ان میں سے بہت سے لوگوں کی بہ نسبت سلامتی کے زیادہ طالب اور شر سے زیادہ دور تھے، چنانچہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) اشتر نخعی، محمد بن ابی بکر، عبید اللہ بن عمر بن الخطاب ابو الاعور سلمی، ہاشم بن ہاشم مرقال، اشعث بن قیس کندی، بسر بن ارطاۃ اور ان کے علاوہ اور لوگوں سے (اس سلسلہ میں) کہیں بہتر تھے جو خود ان کے یا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ =

= شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ جو کچھ لکھا ہے مطاعن عثمان رضی اللہ عنہ کی جوابدہی میں لکھا ہے، تاہم انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جواب رافضی میں یہ نہیں کیا

رضی اللہ عنہ کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ حکمرانوں کے بہترین سلوک کی طرح تھا اور ان کی رعایا ان سے محبت کرتی تھی) صحیح مسلم میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے کہ "خیار أئمتکم الذین تحبونہم ویحبونکم ویصلون علیکم وتصلون علیہم" (ک ۳۳ ح ۶۵، ۶۶) تم میں بہترین حکمران وہ ہوں گے جس سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کو دعا دو، وہ تم کو دعا دیں، سرداری و حکمرانی کی جو بہترین صفات ان کی ذات میں مجتمع تھیں ایسی کم کسی میں ہوں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "ما رأیت رجلاً أخلق بالملک من معاویة"[۱۵۹] (میں نے کسی شخص کو بھی حکمرانی سے ایسی مناسبت رکھتے نہیں دیکھا جیسی (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہے) اسی طرح کے ان کے دیگر معاصرین کے اقوال ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

کہ اس نے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر اعتراض کیا تھا تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراضات شروع کر دیتے، بلکہ پہلے اس کی تاریخی غلطی بیان کی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تقرر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ پھر یہ بتایا کہ عہد فاروقی و عہد عثمانی میں ان کا طرز عمل رعایا کے ساتھ بہترین تھا، اس لئے اس سلسلہ میں ان حضرات پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ہاں شہادت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بعد جب کہ اکثر لوگ مبتلائے فتنہ ہوئے تو ان کے طرز عمل میں بھی فرق آیا تاہم یہ بہت سے ان لوگوں سے بہتر تھے جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ انصاف یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موازنہ ان کے ہم طبقہ حضرات سے کیا جائے جیسا کہ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کیا ہے، نہ ؟؟؟ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جیسا کہ عباسی صاحب نے کیا ہے۔

159۔ یہاں لفظ "ملک" ملحوظ رہے، یہ تعریف باعتبار ملوکیت ہے نہ کہ باعتبار خلافت۔ مؤلف نے "ملک" کا ترجمہ "حکمرانی" کر کے اس طرف سے ذہن ہٹا دیا۔

"ما رأيت أحداً أسود من معاوية"[١٦٠] (میں نے (حضرت) معاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ سرداری کے لائق کسی کو نہ پایا) سننے والے نے جب سوال کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ؟ فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے برتر تھے دیگر صفات میں لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ سرداری میں بڑھ کر تھے۔ (البدایہ والنہایہ ۱۳۸/۸)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت لیث بن سعد رضی اللہ عنہ کی سند سے جو زاہد وقت اور متقی و متورع عالم تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور فاتح ایران اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں تھے، یہ قول نقل کیا ہے کہ: "ما رأيت أحداً بعد عثمان أقضى بحق من صاحب هذا الباب يعني معاوية" (میں نے (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی کو ایسا حقانی فیصلہ کرتے نہیں دیکھا جیسے یہ دروازہ والا ہے، یعنی معاویہ رضی اللہ عنہ)[١٦١]، حضرت عمیر بن سعد الانصاری رضی اللہ عنہ جو زاہد صحابی

160۔ یہاں بھی دنیوی سیادت مراد ہے، نہ صفات خلافت، مطلب یہ ہے کہ سرداری ان کو خوب زیب دیتی تھی۔

161۔ یہ غالباً کسی خاص فیصلہ کے باب میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہوگا، ورنہ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سبّ و شتم کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تنبیہ کرنا مذکور ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام والتسلیمات کا فیصلہ ہے کہ وہ قضاء میں فائق تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ "ازالۃ الخفاء" میں لکھتے ہیں: =

تھے اور حمص کے عامل تھے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا، کسی نے ان کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص میں کچھ کہا تو حضرت عمیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”لا تذكروا معاوية إلا بخير فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «اللهم اهديه» (معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر سوائے بھلائی کے اور کسی طرح نہ کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ”خدایا! اسے ہدایت کا ذریعہ بنا“)۔

واقعات شاہد ہیں کہ نازک ترین موقعوں پر بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رشد و ہدایت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔“

(ص ۳۴۰،۳۳۹)

”علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

=وقد ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم بوجوه عديدة قال: «اقضاكم علي، وأخرج أبو عمر عن ابن عباس عن عمر أنه قال: أقضانا علي، وأقرأنا أُبيّ. (ج 2ص 268)

آنحضرت ﷺ سے بطریق متعددہ ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ”علی تم سب میں قضا کے اندر بڑھے ہوئے ہیں“ اور ابو عمر (ابن عبدالبر) رحمہ اللہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”ہم سب میں قضا کے اندر بڑھے ہوئے علی رضی اللہ عنہ ہیں اور قراءت میں اُبیّ رضی اللہ عنہ ہیں۔

والجهاد في بلاد العدو قائم، وكلمة الله عالية، والغنائم ترد إليه من أطراف الارض، والمسلمون معه في راحة وعدل، وصفح وعفو. (البداية والنهاية 8/ 119)

دشمن کے ممالک کے خلاف جہاد برابر قائم تھا، اللہ کا نام بلند تھا، مال غنیمت تمام اطراف ارض سے ان کے پاس آتا تھا اور مسلمان ان کے زمانہ عہد میں آرام و انصاف ترحم اور درگذر کے ساتھ رہتے تھے۔"

(۳۴۱،۳۴۲)

"وہ تو فیضان تھا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ صحابی کے حسن تدبر کا کہ ملت کی بگڑی حالت کو گویا آن واحد میں سنبھال لیا اور طبیب حاذق کی طرح قوم کی اندرونی عوارض کا فوری تدارک کر کے کاروان ملت کو جادہ پیمائی کے لئے پھر مستعد کرایا، محدث دہلوی رحمہ اللہ نے خلیفہ راشد کی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے:

چنانچہ طبیب حاذق تدبیر صحت مریض وازالہ مواد مرض او می نماید وحمیہ می فرماید ہم چنان این خلیفہ راشد جلب صحب طبیعت عالم می کند وازالہ مادو مرض می سازد وارشاد وحمیہ می نماید۔

("ازالۃ الخفاء" طبع اول ۱/۱۴۴)

ترجمہ: جس طرح طبیب حاذق مریض کی صحت اور مادہ مرض کے دفعیہ کی تدبیر کرتا ہے اور پرہیز بتاتا ہے اس طرح خلیفہ راشد طبائع اہل دنیا کی صحت و تندرستی کے حصول کا اور مادہ مرض کا دفعیہ کا ازالہ کر دیتا اور پرہیز بتا دیتا ہے۔

یہ خلیفہ راشد ہی کی خدمت تھی جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انجام دی، اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ "سوابق اسلامیہ" کے اعتبار سے ذاتی طور سے ان پر فوقیت رکھتے تھے مگر اپنے ماحول کی وجہ سے مقاصد خلافت خاصہ انجام دینے سے قاصر رہے، محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"مقاصد خلافت خاصہ علی وجہہ (در زمان علی) متحقق نگشت و بعد مرضی چون معاویہ بن ابی سفیان متمکن شد و اتفاق ناس بروے بحصول پیوست و فرقت جماعت مسلمین از میان برخاست۔
(ازالۃ الخفاء، طبع اول ۱/۱۲۳)

ترجمہ: (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں) خلافت خاصہ کے مقاصد اس کے مطابق پورے نہ ہوئے اور حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ جب حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہما (خلافت پر) متمکن ہوئے اور ان کی ذات پر لوگوں کا اتفاق واتحاد حاصل ہو گیا اور جماعت مسلمین کے درمیان تفرقہ اٹھ گیا۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ پیران پیر فرماتے ہیں:

وأما خلافة معاوية بن أبي سفيان فثابتة صحيحة. [١٦٢]

162۔ یہاں بھی مؤلف نے حسب عادت پوری عبارت نقل نہ کی جو حسب ذیل ہے:

وأما خلافة معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنه فثابتة صحيحة بعد موت علي رضي الله تعالٰى عنه و بعد خلع الحسن بن علي نفسه من الخلافة وتسليمها إلى معاوية رضى الله عنه.

اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اور حضرت حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) کے اپنے آپ کو خلافت سے علیحدہ کرنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سونپ دینے کے بعد صحیح ثابت ہوتی ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلع خلافت سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جو مؤقف تھا وہ اسی غنیۃ الطالبین میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

ولأن علياً رضي الله عنه كان على الحق في قتاله لأنه كان يعتقد صحة إمامته على ما بينا من اتفاق أهل الحل والعقد من الصحابة رضي الله عنهم على إمامته وخلافته فمن خرج عن ذلک وناصبه حرباً كان

باغياً خارجًا عن ذلک وناصبه حرباً كان باغياً خارجاً عن طاعة الإمام فجاز قتاله.

اور چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے قتال میں حق پر تھے کیونکہ وہ اپنی=
=صحتِ خلافت پر یقین رکھتے تھے چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اہل حل و عقد کا ان کی امامت و خلافت پر اتفاق ہو گیا تھا، لہٰذا جس نے اس امر سے خروج کیا اور آپ سے جنگ چھیڑ دی وہ امام کی اطاعت سے خارج اور باغی ٹھہرا اور اس سے قتال جائز ہوا۔

پھر مؤلف صاحب پیران پیر رحمہ اللہ کی عبارت سے خلافت راشدہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس میں مجرد صحت کا حکم ہے نہ خلافت راشدہ کا اثبات۔ حضرت پیران پیر رحمہ اللہ تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلع خلافت کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپ دی تو اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ متغلب کے حکم میں نہیں رہے بلکہ واقعی خلیفہ بن گئے۔ اس سے ان کا خلیفہ راشد ہونا کہاں ثابت ہوا؟ اہل سنت میں سے کوئی بھی ان کی خلافت کو خلافت راشدہ نہیں مانتا اور مؤلف کا اگر یہ مذہب ہے کہ جس کی خلافت صحیح ہے وہ خلیفہ راشد ہے تو پھر جب تک الغاے خلافت نہیں ہوا، ترکوں کے اخیر عہد تک جتنے خلفاء ہوئے ہیں سب خلفاء راشدین میں شمار کیے جائیں گے۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ مؤلف کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں پیران پیر رحمہ اللہ کی کسی رائے سے اتفاق نہیں۔ حضرت پیران پیر رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحت خلافت پر اہل حل و عقد کا اتفاق مانتے ہیں۔ مؤلف کے نزدیک اہل حل و عقد نے ان سے بیعت ہی نہ کی۔ حضرت پیران پیر صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتے دم تک خلیفہ بر حق تھے، مؤلف کے نزدیک اول تو ان کی بیعت خلافت ہی مکمل نہ ہو سکی اور پھر ثالثوں نے اتفاق رائے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورہ پر منحصر کیا۔

پیران پیر رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتال اپنے مخالفین سے جائز تھا۔ مؤلف کے نزدیک قابل طعن۔

(ص 21 غنية الطالبين)

لیکن حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی خلافت درست اور ثابت ہے۔

پس ایسی خلافت کو جس میں ملت کا اتحاد و اتفاق قائم و برقرار رہا ہو اور ملت مسلمہ ایک صحابی کاتب وحی کے زیر قیادت اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف جہاد رہی ہو، زبردست فتوحات حاصل ہوئی ہوں، تمام امت امن و امان اور راحت و آرام سے زندگی بسر کرتی ہو وہ خلافت راشدہ کیوں نہ کہلائے؟ کیا محض اس لئے کہ اس کو "ملک عضوض" کا نام دیا جائے کہ خلیفہ راشد ازالہ مادہ مرض اور جلب صحت طبیعت عالم کی غرض سے ایسی تدبیر اختیار کرنے پر مجبور ہو جس کو آج کی اصطلاح میں "مارشل لاء" کہتے ہیں اور وہ بھی ایک علاقہ سے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لئے۔"

"ایک حدیث وضع کی گئی یعنی رسول اللہ ﷺ سے یہ قول منسوب کیا گیا: «الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملک» اس وضعی حدیث کے راوی حشرج بن نباتہ الکوفی رضی اللہ عنہ ہیں وہ سعید بن جمہان رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے یہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "میری امت میں خلافت تیس برس تک رہے گی، پھر بادشاہی ہو گی۔" یہ حدیث بتغیر الفاظ "ابو دائود" وغیرہ میں بھی ہے، اول تو اس کے راوی حشرج بن نباتہ الکوفی تقریباً تمام ائمہ رجال کے نزدیک ضعیف الحدیث اور "لا یحتج به" ہیں منکر الحدیث ہیں، یہ حشرج، سعید بن جمہان بصری سے روایت کرتے ہیں جن کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا، ان دونوں کے سنین وفات میں ۶۲ برس کا فرق ہے پھر یہ سعید تو بصرہ کے رہنے والے تھے اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ مدنی ہیں وہیں ان کی وفات

ہوئی۔ انہوں نے یہ حدیث ان سے کب، کیونکر اور کہاں سنی؟ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی صحابی[163] نے ایسی حدیث کا جو نظام خلافت کو صرف تیس برس تک قائم رہنے کی پیشین گوئی کرتی ہو روایت نہ کرنا ہی اس کے وضعی ہونے کا بین ثبوت ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وضعی حدیث حضرت کی خلافت کی تنقیص میں اور حضور سرور کائنات ﷺ کی اس پیشین گوئی کے اثر کو زائل کرنے کے مقصد سے وضع ہوئی جو حضرت جابر بن سمرہ رضی

163۔ یہ بے لاگ ریسرچ کا ایک نمونہ ہے کہ مؤلف نے "ازالۃ الخفاء" کے جس صفحہ سے ملک عضوض کی عبارت نقل کی ہے اس صفحہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ "در حدیث ابی بکرہ ثقفی وارد شدہ الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ" حدیث ابی بکرہ ثقفی میں آتا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی۔ مگر بے لاگ محقق کو "ملک عضوض" والی عبارت تو اس لئے نظر آگئی کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر طعن کرنا تھا اور یہ عبارت اس لئے نظر نہیں آئی کہ اس سے ان کی خلافتِ راشدہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ بہر حال مؤلف کے علی الرغم شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ اس حدیث کے دوسرے راوی حضرت ابی بکرہ ثقفی صحابی (رضی اللہ عنہ) بھی ہیں۔

لہٰذا مؤلف صاحب کے نزدیک "اس وضعی ہونے کا بین ثبوت" جو تھا وہ غتر بود ہوا۔ تعجب ہے شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تو اس حدیث کو صحیح اور مستفیض فرمائیں اور مؤلف کی بے لاگ تحقیق اسے محض بغض علی رضی اللہ عنہ میں وضعی قرار دے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بے لاگ محقق مصطلحات فن کے پابند نہیں ہیں اس لئے آپ کو یہ اعتراض کرنے کا حق نہیں کہ "موضوع" کو وضعی کہنا کہاں کی ٹیک ہے، کیونکہ جب وہ صحیح کو غلط کہنے میں کسی کے پابند نہیں تو فنی اصطلاحات میں اہل فن کے کیوں پابند ہوں۔ آپ اپنی علمی اصطلاح میں لفظ "وضعی" کے معنی کچھ اور سمجھا کیجئے۔ مؤلف نے تو اسے جعلی اور موضوع کے معنی میں استعمال کیا، ظاہر ہے کہ ایسی بے لاگ تحقیق میں اصول اور اصول حدیث کی ایک اصطلاح کیا پورے فن کی تبدیلی کا حق حاصل ہے۔

اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے اور صحاح کی اکثر کتب میں موجود ہے، نیز ترمذی میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی حدیثیں مروی ہیں، یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ دین اسلام قوت سے رہے گا یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہوں اور وہ سب قریش سے ہوں گے۔" "لایزال الإسلام عزیزًا إلی اثني عشرة خلیفة کلهم من قریش"۔ ان بارہ خلیفوں میں پانچویں امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ اور چھٹے امیر المؤمنین یزید ہوتے ہیں، آنحضرت ﷺ کی اس پیشین گوئی کے خلاف جو عین مطابق واقعہ کے ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بادشاہت کا نام دیا جائے یا "ملک عضوض" کا، اس کامیاب عہد کا مفاد ملیہ کے لئے مبارک ہونا واقعات تاریخ سے ثابت ہے۔"

(ص ۳۴۲، الغایت ۳۴۵)

بہرحال شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ خلافتِ نبوت و خلافتِ رحمت کا زمانہ ہے اور "ملک عضوض" کا دور مؤلف کے علی الرغم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے بعد شروع ہوتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در احادیث مستفیضہ خبر دادند کہ بعد وفات وی صلی اللہ علیہ وسلم خلافتِ نبوت و خلافتِ رحمت خواہد بود و بعد ازان "ملک عضوض" وآنچہ متصل وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واقع شد خلافت خلفای اربعہ بود پس خلافتِ ایشان خلافتِ نبوت و رحمت باشد، واگر سیرت این خلفاء مشابہ سیرت انبیاء نمی بود یا ایشان بغصب خلافت را گرفتہ بودند خلافت نبوتِ و رحمت نمی بود۔

وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در احادیث مستفیضہ [۱٦٤] اعلام فرمودند بآنکہ خلافت تاسی سال است و سفینہ تفسیر کرد آنرا بخلافت خلفای اربعہ و عقل نیز برآن دلالت می کند زیرا کہ مطلق ریاست موقت بسی سال نیست، پس این خلفا متصف بخلافتی بودند کہ غیر "ملک عضوض" باشد، پس این خلافت ممدوح بود و خلافتی کہ بغصب وجور باشد ممدوح نمی شد۔"(۲۷۹/۱)

اور آنحضرت ﷺ نے احادیث مستفیضہ میں خبر دی ہے کہ آپ کی وفات کے بعد خلافتِ نبوت و خلافتِ رحمت ہوگی اور اس کے بعد "ملک عضوض"،[165] اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے متصل جو کچھ واقع ہوا وہ خلفائے اربعہ کی خلافت تھی، لہٰذا ان حضرات کی خلافت خلافت نبوت ورحمت ہوئی اور اگر ان خلفاء کی سیرت انبیاء کی سیرت کے مشابہ نہ ہوتی یا ان لوگوں نے خلافت کو بذریعہ غصب لیا ہوتا تو خلافت، نبوت ورحمت نہ ہوتی۔

ترجمہ: اور آنحضرت ﷺ نے احادیث مستفیضہ میں یہ بھی بتلایا ہے کہ خلافت تیس برس رہے گی اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے اس خلافت کی تفسیر خلفائے اربعہ کی خلافت سے کی اور عقل بھی اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ مطلق ریاست تیس سال کے ساتھ موقت نہیں، پس یہ خلفاء اس خلافت سے متصف تھے کہ جو "ملک عضوض" نہیں ہے لہٰذا یہ خلافت ممدوح ہوئی اور جو خلافت کہ غصب اور جور سے حاصل ہو وہ ممدوح نہ ہوئی۔

164۔ مؤلف صاحب حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ کو "وضعی" یعنی جعلی بتاتے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب= =رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلافتِ نبوت کی مدت تیس سال ہونا احادیث مستفیضہ سے ثابت ہے۔

165۔ کاٹ کھانے والی بادشاہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان چاروں خلفاء کی خلافت خلافتِ نبوت ورحمت تھی اور ان کی سیرت انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے مشابہ تھی۔اس لئے ان میں سے کسی کی خلافت کو بھی ملک عضوض میں داخل کرنا صریح ظلم ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو خلافت بذریعہ غصب حاصل کی جائے ممدوح نہیں
اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تصریح ملاحظہ ہو:

''ومعاویہ رافرمودان ملکت فاحسن وفرمود: «کیف بک لو قد قمصک الله قمیصاً یعني الخلافة» قالت أم حبیبة أو أن الله مقمص أخي؟ قال: «نعم ولکن فیه هنات وهنات وهنات»، واین کلمہ اشعار است بآنکہ خلافت او منعقد خواہد شد بجہت تسلط نہ حسب بیعت، وسیرت او موافق سیرت شیخین نباشد، وآن خلافت بعد بغی بر امامِ وقت باشد، لہذا سہ بار لفظ ''ھنات'' فرمودند۔

(ازالۃ الخفاء ج۱ ص۲۶۹)

ترجمہ: اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تم بادشاہ ہو تو اچھا برتاؤ کرنا، نیز فرمایا کہ تمہارا کیا حال ہوگا اگر اللہ نے تم کو ایک قمیص پہنائی (خلافت کی ذمہ داری مراد ہے) حضرت ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو قمیص پہنائے گا؟ فرمایا ہاں لیکن اس میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں'' اور یہ کلمہ اس بات کو بتلا رہا ہے کہ ان کی خلافت تسلط کی بناپر ہوگی نہ بیعت کی بناپر، اور ان کی روش شیخین کی روش کے مطابق نہ ہوگی اور یہ خلافت امام وقت سے بغاوت کے بعد ہی ہوگی اسی کو تین بار ھنات (خرابیاں ہیں) کا لفظ فرمایا۔

اور شاہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں رقمطراز ہیں:

ونشهد بالجنة والخير للعشرة المبشرة وفاطمة و خديجة و عائشة والحسن والحسين رضى الله عنهم ونوقرهم ونعترف بعظم محلهم في الإسلام وكذلك أهل البدر وأهل بيعة الرضوان.

وأبوبكر الصديق إمام حق بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم عمر ثم عثمان ثم علي رضي الله عنهم، ثم تمت الخلافة، وبعده ملك عضوض.

(ج ا ص ۱۴۸ شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل)

اور ہم شہادت دیتے ہیں جنت اور خیر کی عشرہ مبشرہ کے حق میں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے حق میں (اللہ ان سب سے راضی ہو) اور ان سب کی توقیر کرتے ہیں اور اسلام میں ان کا جو بلند مقام ہے اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اسی طرح اہل بدر رضی اللہ عنہم اور اصحاب بیعت الرضوان رضی اللہ عنہم کے حق میں بھی یہی شہادت دیتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کے بعد امام برحق ابو بکر صدیق تھے پھر عمر پھر عثمان پھر علی رضی اللہ عنہم پھر خلافت ختم ہو گئی اور اس کے بعد ملک عضوض تھا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بغیر انتخاب محض اپنے تسلط و استیلاء کی بنا پر خلیفہ بن جانا ایسا امر ہے کہ جس کا مؤلف نے بھی جابجا اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے، چنانچہ (ص ۴۰ پر) لکھتے ہیں:

”امیر یزید کی ولی عہدی کی اس بیعت سے پہلے کبھی اس اہتمام سے بیعت نہیں لی گئی تھی کہ مملکت اسلامی کے گوشہ گوشہ سے بیعت کے لئے وفود آئے ہوں اور ہر علاقہ کے لوگوں نے بطیب خاطر اس طرح

ایسے قریشی نوجوان کی بیعت کی ہو جو اپنی صلاحیتوں اور خدمات ملیہ کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے ملت کا محبوب ہو۔"

معلوم ہوا یزید سے پہلے خود اس کے پدر بزرگوار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس شان سے بیعت نہیں لی گئی تھی، دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اسلامی تاریخ میں اگر کوئی شخص ہے جس کا انتخاب بالکل پہلی بار امت کے عام استصواب سے ہوا تو وہ امیر المومنین یزید ہیں۔" (ص ۲۳۸ طبع دوم)

معلوم ہوا مؤلف کے امیر المؤمنین یزید سے پہلے خود ان کے والد کا انتخاب بھی استصواب عام سے نہیں ہوا تھا۔ واقعہ تحکیم پر بحث کرتے ہوئے مؤلف نے صاف صاف لکھا ہے کہ:

"ثالثوں نے اتفاق رائے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب خلافت سے معزول کر کے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورہ پر منحصر کیا اور یہ قرار دیا کہ جب تک انتخاب خلیفہ کی کار روائی مکمل نہ ہو فریقین اپنے اپنے مقبوضہ علاقہ پر قابض رہیں لیکن صفین کی واپسی کے بعد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ہی پارٹی[۱۶۶] کے ایک گروہ (خوارج)[167] سے قتال وجدال میں الجھ گئے

166۔ اس عبارت کے لفظ لفظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف مؤلف کا غیظ و غضب ٹپک رہا ہے، خوارج کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پارٹی بتا رہے ہیں۔ اگر مرتدین کو (نعوذ باللہ) پیغمبر کی پارٹی کہا جا سکتا ہے تو بلاشبہ خوارج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پارٹی تھی۔

167۔ جہاد خوارج کو جس کا شمار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑی نیکیوں میں سے ہے "جدال و قتال" اور "جھگڑے" کے لفظوں سے تعبیر کرنا مؤلف ہی کو زیب دیتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے جنگ نہروان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

تاآنکہ ان ہی میں سے ایک بدبخت خارجی عبدالرحمن بن ملجم نے جس کا خسر شحینہ بن عدی[۱۶۸] اور برادر نسبتی الاخضر بن شحینہ جنگ نہروان میں حضرت علی کے فوجیوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے،

"حادثۂ ثالثہ" حرب نہروان وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنرا در خبر متواتر بیان فرمودند وارشاد نمودند کہ در حین فرقت مسلمین ظہور خواہد آمد ومتولی قتل آن فریق قتل اولہما بالحق باشد وآن یکی از حسنات عظیمہ آن جماعہ خواہد بود۔

("ازالۃ الخفاء" ج ۱ ص ۱۵۳)

تیسرا حادثہ جنگ نہروان اور آنحضرت ﷺ نے اس کو خبر متواتر میں بیان فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ یہ حادثہ اس وقت ظاہر ہوگا جبکہ مسلمانوں میں = = تفریق ہوگی اور اس فرقہ کو وہ لوگ قتل کریں گے جو مسلمانوں کی دونوں جماعتوں میں حق سے زیادہ قریب ہوں گے اور یہ اس جماعت کی بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہوگی۔

168۔ یہ سسرے اور سالے کا قصہ اس لئے درمیان میں لایا جارہا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ ابن ملجم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا محض بے وجہ نہ تھا، حالانکہ یہ شقی پہلے ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کا منصوبہ بنا کر گھر سے چلا تھا جس کی تفصیل حسب تصریح ابن کثیر رحمہ اللہ یہ ہے کہ "تین خارجیوں نے جن میں ایک کا نام عبدالرحمن بن ملجم تھا یہ مصر کا رہنے والا تھا، دوسرے کا برک بن عبداللہ تمیمی اور تیسرے کا عمرو بن بکر تمیمی نے باہم مل کر یہ سازش کی کہ حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کا خاتمہ کر دیا جائے، ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری لی، برک نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے کی اور عمرو نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مار ڈالنے کی اور یہ عہد کر کے کہ رمضان کو ہر شخص اس کا کام تمام کر دے جس کے قتل کرنے کا اس نے عہد کیا ہے، تینوں اپنی اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابن ملجم کوفہ پہنچا یہاں خوارج موجود تھے مگر اس نے اپنے ارادہ کو کسی پر ظاہر نہ کیا، اتفاق کی بات ایک روز بنو تم الرباب کے لوگوں میں بیٹھا ہوا تھا یہ لوگ نہروان کے مقتولین کا تذکرہ کر رہے تھے کہ دفعتاً اسی برادری کی ایک عورت قطام بنت شجنہ ادھر آنکلی جس کے باپ بھائی جنگ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارے گئے، یہ

حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کو زہر آلود خنجر سے مجروح کر دیا،[۱۶۹]
زخم ایسا کاری لگا کہ تین روز بعد وفات پاگئے، خوارج سے ان کے

عورت حسن و جمال میں نہایت فائق مشہور تھی۔ ابن ملجم کی جو اس پر نظر پڑی تو حواس ٹھکانے نہ رہے، دل و جان سے اس پر عاشق و فریفتہ ہو گیا اور اسے نکاح کا پیام دیا۔ اس نے مہر میں شرط رکھی تین ہزار درہم دو، ایک غلام دو اور ایک خوش گلو لونڈی دو اور علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرو، وہ بولا سب منظور، خدا کی قسم! میں تو اس شہر میں محض علی رضی اللہ عنہ کے قتل ہی کے ارادے سے آیا ہوں، پھر اس سے نکاح ہوا۔ وصل کا لطف اٹھایا اور رمضان کے آنے پر=
=اس شقی ازلی نے اپنے عہد کے مطابق سترہ تاریخ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔
(ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۳۲۵، ۳۲۶)
اس تفصیل سے ناظرین نے معلوم کر لیا ہو گا کہ اس شقی نے حضرت امیر المؤمنین کے قتل کا منصوبہ پہلے بنایا تھا اور قطام سے جو شجنہ کی بیٹی تھی بعد میں نکاح کیا، لہٰذا قطام کے باپ شجنہ اور اس کے بھائی الاخضر بن شجنہ کے قتل ہونے کا جو قطام کے رشتہ سے ابن ملجم کے سسر اور سالے ہوتے ہیں، دراصل ابن ملجم کے اس ارادۂ بد میں کچھ دخل نہیں ہے، وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شہید کرنے کا پہلے ہی بیڑا اُٹھا کر چلا تھا، اگر یہ عشق کا قصہ بیچ میں نہ آجاتا تو قطام سے نکاح کے بغیر بھی وہ اپنا کام سرانجام دیتا جیسا کہ اس کے دوسرے دو ساتھیوں نے کیا، چنانچہ اسی تاریخ میں برک نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا، وہ زخمی ہو گئے تھے مگر جان بچ گئی، عمرو نے بھی اسی تاریخ کو مصر میں اپنا کام کیا لیکن اتفاق کی بات حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طبیعت اس روز خراب تھی اس لئے وہ نماز جماعت میں شریک نہ ہو سکے بلکہ ان کی جگہ ان کے نائب خارجہ بن ابی حبیبہ نماز پڑھانے آئے تھے اس لئے خارجی کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا، اب مؤلف صاحب بتائیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے کس خارجی کا باپ مارا تھا جو ان خارجیوں نے ان پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔
169۔ ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خنجر سے نہیں بلکہ تلوار سے مجروح کیا تھا اور یہ زخم پیٹ میں نہیں بلکہ حضرت علی رحمہ اللہ کے سر پر آیا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جھگڑے نہ ہوتے اور یہ سانحہ نہ پیش آتا تو امت کے مشورہ سے نئے
خلیفہ کا انتخاب ہوتا اور تاریخی واقعات کا رخ ہی دوسرا ہو جاتا، بہر
حال جو مقدر تھا پیش آیا۔" (ص ۱۴، ۱۳)

مؤلف کی بے لاگ ریسرچ میں ایک طرف تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد ہیں اور دوسری طرف انہیں یہ اعتراف بھی ہے کہ "ثالثوں نے نئے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ اہل حل و عقد کے مشورہ پر منحصر کر دیا تھا" مگر اس تجویز پر عمل درآمد نہیں ہوا، ورنہ اگر امت کے مشورہ سے نئے خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو تاریخی واقعات کا رخ ہی دوسرا ہو جاتا، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلافت راشدہ پھر نئے سرے سے قائم ہو جاتی، مگر افسوس ایسا نہ ہوا اور جو مقدر تھا پیش آیا، کیا بے لاگ محقق یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں اہل حل و عقد کو انتخاب خلیفہ کا حق حاصل تھا اور ان کے سانحہ شہادت کے پیش آجانے کے بعد پھر اس کی شرعاً ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

جس حدیث کے متعلق مؤلف نے وضع کا دعویٰ کیا ہے، اس کی صحت و عدم صحت پر تو ہم انشاءاللہ آئندہ چل کر بحث کریں گے، سردست ہم اپنے ناظرین کی توجہ مؤلف کی اس کارگزاری کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں جو انہوں نے شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے اقتباسات پیش کرنے میں انجام دی ہے۔

فضربه ابن ملجم بالسيف على قرنه فسال دمه على لحيته رضي الله عنه. (ج 7 ص 326)

ابن ملجم نے تلوار سے آپ کے سر پر وار کیا تو آپ کا خون آپ کی ریش مبارک پر بہنے لگا۔ اللہ آپ سے راضی ہو۔

فاضل مؤلف کی سادگی ملاحظہ ہو، آپ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ موصوف کی مذکورہ سابق طویل عبارت کے آخری اقتباس میں صرف شرط کو تو رہنے دیا ہے اور جزا کو اُڑا دیا ہے، حالانکہ فارسی زبان کا معمولی سواد خوان بھی جب یہ الفاظ پڑھے گا کہ:

"وبعد حضرت مرتضی چون معاویہ بن ابی سفیان متمکن شد و اتفاق ناس بر و پیوست و فرقتِ جماعت مسلمین از میان برخاست۔"

تو اس کا ذہن فوراً اس چون کی جزاء کا متلاشی ہو گا[170] اور جب وہ اس کو نہ پائے گا تو سمجھ لے گا کہ بات ادھوری رہ گئی ہے، یہاں اس جملہ کا صرف جزو اول یعنی شرط مذکور ہے اور جزو ثانی یعنی جزاء غائب ہے، ہاں مؤلف صاحب نے جس طرح نقل اقتباس میں جو لفظ "خاصہ"[171] کا اضافہ فرمایا ہے اور لفظ "حضرت" کو حذف کر دیا ہے اگر وہ اس حک و اضافہ کے بجائے یہاں سے اس "چون" کو جو حرف شرط ہے اڑا دیتے تو کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہ ہوتی اور جب تک اصل کتاب سے مراجعت نہ کی جاتی ان کی تحقیق پر ذرا حرف نہ آتا۔ سابق میں بھی فاضل مؤلف نے "حضرت مرتضی نیز بخطائے اجتہادی حکم فرمود" کا ترجمہ کرتے ہوئے اسی بے لاگ ریسرچ کا مظاہرہ کیا تھا۔

پھر اس پر طرفہ یہ کہ آپ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کو بے ربط اور مطلب خبط کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے جانتے جہاں تک بن سکا ان کی تردید بھی کر دی ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت میں حسب ذیل امور کی تصریح کی ہے۔

170۔ مؤلف صاحب نے عربی عبارات کے ترجموں اور اقتباسات میں جا بجا یہی کاریگری دکھائی ہے۔

171۔ شاہ صاحب موصوف رحمہ اللہ کی اصل عبارت ہے:

"لیکن مقاصدِ خلافت علی وجہا متحقق نگشت وبعد حضرت مرتضی چون الخ"

اور مؤلف نے نقل کیا ہے "مقاصدِ خلافت خاصہ علی وجہا متحقق نگشت وبعد مرتضی چون الخ" ممکن ہے کہ یہ محض سبقت قلم ہی ہو کیونکہ اس سے مطلب میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

۱۔ باید دانست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در احادیث متواترہ بالمعنی افادہ فرمودند کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مقتول خواہد شد، ونزدیک بقتل او فتنہ عظیمہ خواہد برخاست۔

۲۔ کہ انتظام خلافت خاصہ بآن فتنہ منقطع خواہد شد۔

۳۔ وآن خبر وخارج متحقق گشت بآں وجہ کہ حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ باوجود رسوخ قدم در سوابق اسلامیہ ووفور اوصاف خلافت خاصہ وانعقاد بیعت برائی او ووجوب انقیاد رعیت فی حکم اللہ بنسبت او متمکن نشد در خلافت الخ........ وہر چند این خللہا در صفات کاملہ نفسانیہ ایشان خللی نیداخت لیکن مقاصد خلافت علی وجہھا متحقق نگشت۔

۴۔ وبعد حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ چون معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ متمکن شد واتفاق ناس بروی الجصول پیوست وفرقت جماعہ مسلمین از میان برخاست وی سوابق اسلامیہ نداشت ولوازم خلافت خاصہ دروی متحقق نبود، بعد ازان بادشاہاں دیگر از مرکز حق دور تر افتادند کمالا یخفی۔

۵۔ پس خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بانقطاع خلافت خاصہ منتظمہ نافذہ ازین جہت متحقق گشت۔

وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ

"آنحضرت ﷺ نے احادیث متواترہ میں بیان فرمایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوں گے اور ان کی شہادت کے قریب ایک ایسا عظیم فتنہ اُٹھے گا کہ جس سے خلافتِ خاصہ کا نظام ٹوٹ جائے گا۔ سو آنحضرت ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ حضرت مرتضی رضی اللہ عنہ جیسے شخص کو تو خلافت میں اقتدار نہ مل سکا اور ان کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اقتدار نصیب ہوا تو نہ وہ سوابق اسلامیہ رکھتے تھے اور نہ خلافت خاصہ کے لوازم ان میں موجود تھے۔ اور ان کے بعد بادشاہ سریر آرائے مملکت ہوئے وہ مرکز حق سے بہت دور ہو چکے تھے، لہٰذا

آنحضرت ﷺ نے خلافت خاصہ منتظمہ نافذہ[۱۷۲] کے ختم ہو جانے کی جو خبر دی تھی وہ اس طرح پوری ہوئی۔"

مگر مؤلف کو شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ان تمام باتوں میں صرف اس حد تک تو ان سے اتفاق ہے کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ سوابق اسلامیہ کے اعتبار سے ذاتی طور سے ان (یعنی معاویہ رضی اللہ عنہ) پر فوقیت رکھتے تھے مگر اپنے ماحول کی وجہ سے مقاصد خلافتِ خاصہ انجام دینے سے قاصر رہے۔"

لیکن آگے کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں بلکہ خود ان ہی کی عبارت سے ناظرین کو یہ باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے اور انہوں نے خلافت خاصہ کے مقاصد کو خوب انجام دیا تھا۔ چنانچہ کبھی خلیفہ راشد کی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت کا حوالہ پیش کرتے ہیں اور کبھی مقاصد خلافتِ خاصہ کی انجام دہی کے ثبوت میں ان کے جملہ شرطیہ کو دو پارہ کر کے شرط کو ذکر کرتے ہیں اور جزاء کو غائب کر جاتے ہیں، حالانکہ خود شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی "ازالۃ الخفاء" میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذکر میں تصریح کر دی کہ:

"وبعضِ مقاصدِ خلافت خاصہ میدانست اما امضای آن نتوانست کرد۔" (ج ۱، ص ۱۴۷)

172۔ یاد رہے یہاں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے "خلافت خاصہ" کے ساتھ دو قیدیں اور بڑھائی ہیں ایک منتظمہ، دوسری نافذہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو وہ خلافت خاصہ غیر منتظمہ سمجھتے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت خاصہ نہیں بلکہ خلافت عامہ بمعنی ملوکیت اور بادشاہی کے قرار دیتے ہیں۔

کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت خاصہ کے بعض مقاصد جانتے تھے لیکن ان کا اجراء نہ کر سکے۔

پھر ایک طرف شاہ صاحب رحمہ اللہ ممدوح کے حوالے سے یہ رقمطراز ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مقتل عثمان رضی اللہ عنہ سے فتنہ رونما ہونے کے بارے میں احادیث متواترہ بالمعنیٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ کہ اس وقت خلافت علی منہاج نبوت منقطع ہو جائے گی اور ملک عضوض ظاہر ہوگا۔"

اور دوسری طرف خود ہی یہ لکھ رہے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت خلافتِ راشدہ کیوں نہ کہلائے اور اس کو "ملک عضوض" کا نام کیوں دیا جائے؟ سبحان اللہ کیا بے لاگ تحقیق ہے، یا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد ہی "ملک عضوض" ظاہر ہو گیا تھا اور خلافت علی منہاج نبوت منقطع ہو چکی تھی یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد بھی "ملک عضوض" کا پتہ نہ تھا اور خلافت راشدہ ہی چل رہی تھی، کیا خوب۔ یا این شوراشوری یا باین بے نمکی۔ پھر جن احادیث میں ملک عضوض کی پیشین گوئی ہوئی ہے ان ہی میں یہ بھی تصریح ہے کہ ملک عضوض کے بعد حکومت جابرہ ہوگی چنانچہ خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں:

"در حدیث صحیح وارد شدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر دادند کہ چند گاہ نبوت و رحمت خواہد بود بعد ازان خلافت و رحمت بعد ازان ملک عضوض بعد ازان جبروتِ و عتو، ودر بعض روایات خلافت بر منہاج نبوت واقع شدہ، و نیز بہ ثبوت رسیدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر دادند الخلافة بعدي ثلاثون سنة۔"

("ازالۃ الخفاء" ج ۱ ص ۸)

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خبر دی کچھ وقت تک تو نبوت ورحمت ہوگی اس کے بعد خلافت ورحمت اس کے بعد ملک عضوض[173] اس کے بعد جبر اور حد سے بڑھ جانا اور بعض روایات میں (خلافت ورحمت کی جگہ) خلافت بر منہاج نبوت کے لفظ آتے ہیں اور یہ بھی ثبوت کو پہنچا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی۔

اب اگر مؤلف کو "ملک عضوض" کی روایات پوری طرح تسلیم ہیں اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا دور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے معًا بعد ہی فوراً شروع ہوگیا تھا تو انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو "ملک عضوض" کہنے پر ذرا برا نہ ماننا چاہیے، بلکہ شکر کرنا چاہیے کہ "ملک عضوض" کے بجائے اسے کسی نے جبر و عتو سے تعبیر نہیں کیا ورنہ حدیث کی روشنی میں تو خود ان کے نظریہ کے مطابق (نہ کہ ہماری رائے میں) جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے "ملک عضوض" تھا تو ان کا زمانہ جبر و عتو کا ٹھہرتا ہے۔

اور اگر وہ ان احادیث متواترہ بالمعنی پر صرف "ملک عضوض" کے بعد بھی خلافتِ راشدہ کی رٹ لگائے جاتے ہیں تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں جو قرآن مجید نے ان کے پیش رؤں (دے خوے جیسے بے لاگ محققوں) کو خطاب کر کے کہا تھا کہ (اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) الآیۃ

پھر یہ عجیب ریسرچ ہے کہ خلافت راشدہ کے عین بیچ میں اچانک "ملک عضوض" گھس آیا، یہاں مؤلف کو وہ بارہ خلیفوں والی حدیث یاد نہ آئی، جو حدیث

173۔ "ملک عضوض" کے معنی "کاٹ کھانے والی بادشاہت" مطلب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی طرح یہ بے گزند نہ ہوگی۔

سفینہ کو موضوع قرار دیتے وقت یاد آگئی تھی اور جس میں خلافت نبوت کی مدت تیس سال بتائی گئی ہے اور جس کی صحت پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مؤلف علی الرغم یہ کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ ''بہ ثبوت رسیدہ'' یہ کیا بات ہے کہ پانچویں اور چھٹے خلیفہ کے لئے تو حدیث دو از دہ خلیفہ بالکل از بر تھی اور چوتھے خلیفہ کے بارے میں بالکل فراموش ہو گئی، کیا ان کے حق میں اس حدیث کا مطلب بدل گیا تھا، آخر ان ہی سے مؤلف کو کیوں کد ہے؟

از دیگران چیست کہ آزر دہ

مؤلف نے ''ازالۃ الخفاء'' کے جس صفحہ سے مقتل عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بعد ''ملک عضوض'' کا ظاہر ہونا نقل کیا ہے، اسی صفحہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

ودر حدیث الخلافة بالمدينة والملک بالشام تعین مکان واقع شد۔

(ج ۱ ص ۱۴۲ طبع بریلی ۱۲۶۲ھ

اور اس حدیث میں کہ (خلافت مدینہ میں ہو گی اور بادشاہی شام میں) جگہ کا تعین واقع ہو گیا۔

پھر مؤلف نے اس عبارت کو در خور اعتناء کیوں نہ سمجھا اور حدیث نبوی نے جب ملوکیت کا مقام تعین کر دیا ہے تو ''ملک عضوض'' کی ابتداء بھی وہیں سے ماننی پڑے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ''ملک عضوض'' سے کیا واسطہ، ان کی خلافت تو مدینہ طیبہ میں منعقد ہوئی تھی۔

خلفاء اربعہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے عہد پر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تبصرہ

اب شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے ادوار پر جو تبصرہ کیا ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد امارت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے ملاحظہ فرمایئے اور مؤلف کی بے لاگ ریسرچ سے اس کا موازنہ کیجئے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "وسیرت شیخین متقارب بود، ومناقب ایشان ہم عنان ومتوافق، وسوابق ایشان متعائق، وغزوائی کہ در ایام ایشان واقع شد متشابہ، نقشِ اول صدیق اکبر بست واتمام آن بر دست فاروق اعظم بحصول انجامید، تمام مسلمین در زمان ایشان باہم مؤتلف وبایکدیگر متراحم وبر کفار شدید وبر جہاد متوافق۔ نام مخالفت در میان ایشان واقع نہ سپاہ ورعایا خلیفہ را از جان خود دوست دار تر و خلیفہ بر رعایا وسپاہ از پدر مشفق ومہربان تر و جیوش وامرای امصار اہل سوابق از مہاجرین اولین انصار۔"
>
> (ج ۱ ص ۱۴۸، ۱۴۹)

شیخین کی روش قریب قریب تھی ان کے مناقب بھی برابر سے اور ملتے جلتے ایک دوسرے کے قدم بقدم اور ان کے سوابق بھی اور جو غزوات بھی ان کے زمانے میں ہوئے وہ بھی یکساں۔ پہلا نقش صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بنایا اور اس کی تکمیل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے ہوئی، سارے مسلمان ان کے عہد میں آپس میں الفت رکھتے، ایک دوسرے پر شفقت کرتے، کفار کے ساتھ سخت اور جہاد پر متفق تھے۔ مخالفت کا نام بھی ان کے درمیان نہ تھا۔ فوج اور رعایا خلیفہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی اور خلیفہ رعایا اور فوج پر باپ سے

زیادہ شفیق اور مہربان تھے۔ سالاران لشکر اور حکام ولایت اہل سوابق
تھے جو مہاجرین اولین اور انصار میں سے تھے۔

مؤلف نے اپنے اقتباس میں اخیر کا فقرہ چھوڑ دیا، حالانکہ عہد شیخین (رضی اللہ عنہما) میں انتظامِ خلافت کے درست ہونے میں اس چیز کا بھی خاص دخل تھا، علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے ''مقدمہ تاریخ'' میں لکھا ہے کہ:

سأل رجل علياً رضي الله عنه: ما بال المسلمين اختلفوا
عليك و لم يختلفوا على أبي بكر و عمر فقال: لأن أبا بكر و
عمر كانا واليين على مثلي و أنا اليوم وال على مثلك يشير إلى
وازع الدين. (مقدمة ابن خلدون فصل في ولاية العهد)

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا اس کی کیا وجہ
کہ لوگوں نے آپ سے تو اختلاف کیا مگر حضرت ابو بکر و عمر (رضی اللہ
عنہما) سے نہیں کیا؟ آپ نے جواب دیا کہ اس لئے کہ شیخین رضی اللہ
عنہما مجھ جیسوں پر حکومت کرتے تھے اور میں تم جیسوں پر حاکم ہوں،
یہ آپ کا اشارہ دینی جذبہ (کے کمی) کی طرف ہے۔

اور دورِ ذی النورین رضی اللہ عنہ کے متعلق ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں:

''سیرت حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ نسبت بسیرت شیخین
مغائرتی داشت زیرا کہ گاہی از عزیمت بر رخصت تنزل مینمود، وامرا
حضرت ذی النورین نہ برصفت امرای شیخین بودند و انقیاد رعیت
مراورانہ مثل انقیاد رعیت با حضرت صدیق و فاروق بود ہر چند آن
خشونت باز قوۃ بفعل نیامد واز دلی و زبان بدست وسلاح انتقال نکردہ
بود إلا عند إتمام هذا القرن وهذا لا ينازع فيه إلا مكابر۔

(اج ص ۱۵۱، ۱۵۰)

حضرت ذی النورین (رضی اللہ عنہ) کی روش میں بہ نسبت شیخین
(رضی اللہ عنہما) کی روش کے کچھ فرق تھا کیونکہ وہ کبھی عزیمت سے

رخصت پر اتر آتے تھے اور حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کے حکام
بھی اس صفت کے نہ تھے جیسے شیخین (رضی اللہ عنہما) کے اور ان کی
رعیت بھی ان کی ویسی مطیع نہ تھی جیسی کہ حضرت صدیق و فاروق
رضی اللہ عنہما کی تھی، اگرچہ یہ بدمزگیاں باطن سے ظاہر میں نہ آئیں اور
دل و زبان سے دست و سلاح کی طرف منتقل نہ ہوئیں مگر اس وقت
جبکہ یہ عہد ختم ہونے لگا اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کے تسلیم کرنے
میں سوائے دھاندلی کرنے والے کے اور کوئی جھگڑا نہیں کرے گا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ ممدوح نے عہد شیخین و عہد ذی النورین (رضی اللہ عنہم)
میں جو موازنہ کیا تھا مؤلف نے اس کو سرے سے نظر انداز کر دیا اور اتنا کہہ کر:

"اس زمانہ کی برکات خلیفہ سوئم حضرت عثمان ذی النورین کے عہد
خلافت تک باقی رہیں۔ الخ"

"ملک عضوض" کا راگ الاپنے لگے، حالانکہ عہد مرتضوی تک حالات کی تدریجی رفتار کو سمجھنے کے لئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا، تاکہ ناظرین اندازہ لگا سکتے کہ جس فتنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جیتے جی سر اُٹھایا تھا اس نے حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو کس طرح پریشان کیا، فرق اتنا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے زبانی فہمائش پر اکتفا کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے دفعیہ کے لئے شمشیر و سنان سے بھی کام لیا، لیکن تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں، شدنی امر ہو کر رہا اور دونوں حضرات کو اپنی اصلاحی کوششوں کے باوجود فتنہ پردازوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا اب اس خرابی کی ذمہ داری خوارج و بغاۃ کے بجائے حضرت عثمان یا حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے سر ڈالنا اور ان کی خلافت کو ملک عضوض بتانا کتنا بڑا صریح ظلم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت پر تبصرہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس طویل عبارت میں گذر چکا ہے جس سے مؤلف نے دو اقتباسات لیکر درج کتاب کئے

ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی جو اُن کی رائے تھی اسی عبارت میں مذکور ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک اور مقام پر اسی کتاب میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت کا نقشہ صرف دو جملوں میں کھینچا ہے مگر کس قدر صحیح اور خوب کھینچا ہے۔

إمارة على أقذاء [١٧٤] وهدنة على دخن.

وہ امارت تھی جو آنکھوں میں کھٹکتی تھی اور وہ صلح تھی جس میں کدورت موجود تھی۔

یعنی اگرچہ بعد صلح ان پر اتفاق عام ہو گیا تھا تاہم خلافت راشدہ کے مقابلہ میں ان کی امارت آنکھوں میں کھٹکتی تھی اور صلح کے بعد اس نورانی دور کی آب وتاب جاتی رہی تھی۔ یہ دراصل حدیث فتن کی طویل روایت کا ایک ٹکڑا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت کو اسی حدیث کا مصداق قرار دیتے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"وھدنہ اولی مبتدا آن صلح حضرت امام حسین بود با معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنرا در حدیث صحیح بیان فرمودند، أخرج البخاری عن الحسن قال لقد سمعت ابا بكرة رضي الله عنه قال بينا النبي صلى الله عليه وسلم يخطب جاء الحسن فقال ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين من المسلمين.

بعد ازان از حقیقت ھدنہ خبر دادند کہ "إمارة على أقذاء وهدنة على دخن"، باز استقلال معاویہ بن ابی سفیان بباد شاہی بیان فرمودند، أخرج

174۔ "اقذاء" قذی کی جمع ہے۔ قذی اس تنکے کو کہتے ہیں جو آنکھ میں جا پڑے۔

ابن أبي شيبة عن معاوية قال مازلت أطمع في الخلافة منذ قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا معاوية! إن ملكت فأحسن.

("ازالۃ الخفاء" ج ا ص ۱۵۳، ۱۵۴ طبع قدیم)

پہلا ہدنہ [175] جس کا آغاز حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اس صلح سے ہوا جو انہوں نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ کی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو صحیح حدیث میں بیان فرمایا ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت حسن (بصری) رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے اسی اثنا میں امام حسن (رضی اللہ عنہ) آنکلے تو آپ نے فرمایا "میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرادے گا۔"

اس کے بعد آپ نے اس "ہدنہ" کی حقیقت سے اطلاع دی کہ یہ امارت ہوگی آنکھوں میں کھٹکتی اور صلح ہوگی کدورت کے ساتھ، پھر حضرت معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما) کی بادشاہی کے مستقل ہونے کو بیان فرمایا، چنانچہ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے راوی ہیں کہ مجھے اس وقت سے خلافت کی طمع تھی جب سے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ "اے معاویہ! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو اچھا برتاؤ کرنا۔"

اب پڑھیے امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے وہ الفاظ جو انہوں نے اپنی معذرت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے اس وقت کہے تھے جب کہ وہ اپنے پدر بزرگوار کے مظلومانہ قتل کا انتقام چاہتی تھیں کہ:

175۔ "ہدنہ" صلح کو کہتے ہیں۔

إن الناس قد بذلوا لنا الطاعة على كره وبذلنا لهم حلمًا على غيظ (منهاج السنة ج 2ص 209)

لوگوں نے ناپسندیدگی کے باوجود ہم سے اطاعت کا برتاؤ کیا ہے اور ہم نے غیظ کے باوجود ان کے ساتھ حلم کا۔

اور حدیث مذکور سے اس کو مطابقت دیجئے کہ اس کے پہلے جملہ "إمارة على أقذاء" (امارت ہوگی آنکھوں میں کھٹکتی) میں لوگوں کی اسی ناپسندیدگی کا بیان ہے جس کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اعتراف کیا ہے اور "وهدنة على دخن" (صلح ہوگی دھوئیں کے ساتھ) اسی غیظ کی تصویر ہے جس کے ہوتے ہوئے حلم کا برتاؤ تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کو بادشاہی بتاتے ہیں، اسے خلافت راشدہ قرار نہیں دیتے، تمام اہل سنت کا یہی مسلک ہے اور ان میں اس بارے میں دو رائیں نہیں ہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ ممدوح نے اس سلسلہ میں دو حدیثیں پیش کی ہیں جس کے متعلق وہ ناظرین کو ان الفاظ میں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

"اول الخلافة بالمدينة والملک بالشام" لفظ خلافت را کہ با ملک قسیم ساختند ببین کہ از میان این مقابلہ چہ میزاید۔"

("ازالۃ الخفاء" ج ا ص ۱۵۱)

(اس حدیث میں) لفظ "خلافت" کو "ملک" (سلطنت) کے مد مقابل قرار دیا گیا ہے، دیکھو اس مقابلہ سے کیا بات پیدا ہوتی ہے۔

دوسری حدیث وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی "إن ملكت فأحسن" یہاں خود انہوں نے "ملک" کا ترجمہ بادشاہی کیا ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ ہی کہا کرتے تھے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعاویۃ بن ابی سفیان گفت "لست بخليفة ولكني أول ملوك الإسلام وستجربون الملوک بعدي."

("ازالۃ الخفاء" ج ۱ ص ۱۴۷)

اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں خلیفہ نہیں ہوں بلکہ شاہان اسلام میں سے پہلا بادشاہ ہوں اور بادشاہوں کا تو اب تم میرے بعد تجربہ کرو گے۔

لیکن مؤلف شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس بات کو بھی جھٹلانے کے لئے تیار ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ قول منسوب کرنا کہ "میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں" کذب محض ہے۔ جس روایت سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے اس کے اسناد تک منقطع ہیں۔ پہلا راوی تو مجہول الاسم ہے یعنی "عن شيخ من المدينة" (ص ۱۳۵ ج ۸، البدایہ والنہایہ) پھر کیا یہ نسلی تعصب کا کوئی جذبہ ہے یا لاعلمی اور کوتاہ فہمی کا سبب ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے۔" (ص ۴۲ "عرض مؤلف" طبع دوئم)

ایک طرف مؤلف کا یہ طنطنہ ہے اور دوسری طرف ان کی علمی دیانتداری کا یہ حال ہے کہ "البدایہ والنہایہ" میں اس سلسلہ میں دو روایتیں مذکور ہیں مگر انہوں نے صرف ایک روایت پر اظہار خیال فرمایا اور دوسری کا سرے سے ذکر نہیں کیا، "البدایہ والنہایہ" کی پوری عبارت حسب ذیل ہے:

وقال حنبل بن إسحاق حدثنا أبو نعيم حدثنا ابن أبي عتيبة عن شيخ من أهل المدينة قال قال معاوية: أنا أول الملوك، وقال ابن أبي خيثمة: حدثنا هارون بن معروف حدثنا حمزة عن ابن شوذب قال: كان معاوية يقول: أنا أول الملوك وآخر خليفة، قلت: والسنة أن يقال لمعاوية ملك، ولا يقال له

خليفة لحديث سفينة: «الخلافة بعدي ثلاثون سنة ثم تكون ملكاً عضوضاً» (ج 8 ص 135)

حنبل بن اسحاق کا بیان ہے کہ ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہ ہم سے ابن ابی عتیبہ نے مدینہ کے ایک شیخ سے نقل کیا کہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ میں پہلا بادشاہ ہوں، اور ابن ابی خیثمہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہارون بن معروف نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حمزہ نے ابن شوذب سے نقل کیا کہ معاویہ یوں کہا کرتے تھے کہ میں پہلا بادشاہ ہوں اور آخری خلیفہ، میں (ابن کثیر رحمہ اللہ مؤلف کتاب) کہتا ہوں کہ سنت یہ ہے کہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو بادشاہ کہا جائے خلیفہ نہ کہا جائے کیونکہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ "خلافت میرے بعد تیس برس تک رہے گی، پھر "ملک عضوض" ہو جائے گا۔"

بے لاگ محقق نے بس ایک روایت پر کلام کر کے یوں سمجھ لیا کہ تحقیق کا حق ادا ہو گیا، اب ان کے فیصلہ کو حرف آخر سمجھا جائے، پھر دعویٰ "کذب محض" کا اور ثبوت میں صرف "انقطاع" کو پیش کیا ہے۔ یہ محض ابلہ فریبی ہے، فن اصول حدیث کا ایک ابجد خوان بھی جانتا ہے کہ اسناد کے منقطع ہونے سے اس روایت کا "کذب محض" ہونا لازم نہیں آتا، "منقطع" اور "موضوع" علم اصول حدیث کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں، جس روایت میں کذب محض ہو وہ "موضوع" ہے اور جس کے سلسلہ میں اسناد میں بیچ سے ایک راوی ساقط ہو وہ "منقطع" کہلاتی ہے، منقطع روایت امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک حجت ہے، متاخرین محدثین میں بعض حضرات اس کو حجت نہیں مانتے مگر وہ منقطع کو ضعیف کہتے ہیں "کذب محض" نہیں، ان کے نزدیک روایتِ منقطع میں توقف کا حکم ہے یعنی جب تک اس روایت کا اتصال ثابت نہ ہو وہ اس کے قبول کرنے میں توقف کریں گے، یہ نہیں کہ مؤلف کی طرح

بے دھڑک اسے ''کذب محض'' کہہ دیں، پھر اس اسناد میں ''حدثنا'' کے ہوتے ہوئے انقطاع کیسا؟ ''عن'' بھی انقطاع پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ معاصرین کا ''عنعنہ'' سماع پر محمول ہے، ہاں یہ ٹھیک ہے کہ سلسلہ سند کا اخیر راوی مجہول الاسم ہے، لیکن اسناد میں مردم مبہم ہونے سے اس کا کذب محض ہونا تو درکنار انقطاع بھی ثابت نہیں ہوتا اور یہاں تو اس کی مؤید دوسری روایت موجود ہے پھر اس کو ''کذب محض'' کہنا کس قدر جرأت ہے۔ محدثین نے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کسی ایک کتاب کا حوالہ بھی مؤلف کی تائید میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تصریح آپ کی نظر سے گزری وہ بھی سنت یہی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''بادشاہ'' کہا جائے ''خلیفہ'' نہ کہا جائے۔ابن کثیر رحمہ اللہ کی مراد یہاں خلیفہ سے مطلق خلیفہ نہیں بلکہ خلیفہ راشد ہی ہے۔ ورنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بمعنی بادشاہ کہنے میں کوئی حرج نہیں، مؤلف کی بے لاگ ریسرچ کا یہ حال ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تصریح اور دوسری روایت کو سرے سے غتربود کردیا۔

خلافت کو امارت وملوکیت میں تبدیل ہونے کے لئے قدرتی طور پر ان مراحل سے گزرنا ضروری تھا جس سے خلافت عثمانی اور خلافت مرتضوی گذری، لہٰذا جو فتنے اور حوادث ان حضرات کے عہد برکت مہد میں ظہور پذیر ہوئے ان کا ہونا قانون قدرت کے عین مطابق تھا، تعمیر ہو یا تخریب عادۃ اللہ ہر انقلاب میں تدریج کی مقتضی ہے۔ خلافتِ نبوت کے ختم ہونے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ یک دم عین وقت کے زمانہ میں اپنے آپ فنا ہو جاتی اور دوسری صورت یہ تھی کہ بتدریج اس میں ضعف آنے لگتا اور آخر اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ عادۃ اللہ چونکہ اس عالم میں دوسرے طریق پر جاری ہے، لہٰذا ختم خلافتِ خاصہ میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ اس کی عمر طبعی تقدیر الٰہی میں پہلے سے تیس سال مقرر تھی اور اس مدت میں ختم ہونا تھا۔